امریکہ سے
ہجرت
مریم جمیلہ (مارگریٹ مارکوس)
ترجمہ: کرنل (ر) اشفاق حسین
ادبیات

Marfat.com

Marfat.com

MFN
212567

امریکہ سے ہجرت

مریم جمیلہ (مارگریٹ مارکوس)

ترجمہ: کرنل (ر) اشفاق حسین

ادبیات
رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
فون: 042-37361408, 042-37232788
E-mail: idarasulemani@yahoo.com
www.sulemani.com.pk

Marfat.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

297.04
1619م
110480

کتاب کا نام — امریکہ سے ہجرت
(ترجمہ: At Home in pakistan)

مصنفہ — مریم جمیلہ

ترجمہ — کرنل (ر) اشفاق حسین

ناشر — حافظ عمار وحید سلیمانی

مطبع — آر۔آر۔ پرنٹرز

طبع اول — نومبر ۲۰۱۲ء

تعداد — ۱۰۰۰

قیمت — ۳۵۰/- روپے

نوٹ : محترم مریم جمیلہؒ کی دیگر کتب کے لیے
ادارہ مطبوعات سلیمانی سے رابطہ کریں۔

دست یابی

ادارہ مطبوعات سُلیمانی
رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور • فون: 042-37232788
042-37361408 E-mail: idarasulemani@yahoo.com
www.sulemani.com.pk
www.facebook.com/idarasulemani

Marfat.com

انتساب

مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

کے نام

(۱۹۰۳ء۔۱۹۷۹ء)

Marfat.com

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا

(سورۃ النساء : ۱۰۰)

اور جو شخص اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑ جائے وہ زمین میں بہت سی جگہ اور کشائش پائے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کر کے گھر سے نکل جائے پھر اس کو موت آ پکڑے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمے ہو چکا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

Marfat.com

فہرست

عرضِ مترجم... (کرنل اشفاق حسین) 7

والدین کے نام کھلا خط... (نومبر 1986) 19

1 سکندریہ سے خط... اطالوی جوڑا، ہندوستانی طالب علم، یونانی کپتان، مسلم دنیا کا نقش اول 28

2 سوڈان سے خط... پورٹ سعید، مغرب کی لیٹرین، پورٹ سوڈان، مسلم تہذیب کا عکس 39

3 جدہ سے خط... یونانی کی بدکلامی، جدہ میں سعودی مشاہدات 47

4 کراچی سے خط... جہنم سے جنت تک، پہلی پاکستانی لباس میں 55

5 لاہور سے پہلا خط... کراچی تا لاہور، PIA کی ستائش، لاہور میں میاں طفیل کا استقبال، مولانا مودودی کا گھر 62

6 لاہور سے دوسرا خط... سفر ہجرت اور اس کے اثرات، مولانا مودودی سے خط کتابت، نیویارک سے ہمیشہ کے لیے رخصتی 66

7 لاہور سے تیسرا خط... پاکستانی کھانے اور طرز زندگی، مولانا کا خاندان 80

8 لاہور سے چوتھا خط... لاہور میں علمی مصروفیات، مولانا کی شکایات 96

9 لاہور سے پانچواں خط... میرے رشتوں کی بھرمار، کینیڈین نو مسلم سے سخت الفاظ کا تبادلہ 103

پتوکی سے پہلا خط... ٹرین کے تیسرے درجے میں لاہور سے پتوکی، میزبان خاندان 112

پتوکی سے دوسرا خط... موسمی حالات، اردو سیکھنے کی کوشش 120

پتوکی سے تیسرا خط... نیویارک کے مسلمان دوستوں کی یاد، ایک گمنام مسلمان بھائی کا خط 128

پتوکی سے چوتھا خط... خوشحال فقیر، فرحت کی پٹائی، جن نکالنے کے لیے لڑکی کا علاج........................138

Marfat.com

پتوکی سے پانچواں خط... دیہی زندگی، دیہی خواتین کا بناؤ سنگھار، برازیلین دوست 148
پتوکی سے چھٹا خط... بچھڑے کی پیدائش، ایک شادی کی تقریب، ایک عجیب خواب 156
پتوکی سے ساتواں خط... نومولود بچھڑے کی موت، بھینس کی بے چارگی 162
پتوکی سے آٹھواں خط... مسلمانوں کا رسوم تدفین 166
پتوکی سے نواں خط... نئے تعمیر شدہ گھر میں منتقل، یونانی ادویات کی بنیاد، امریکی اور پاکستانی بوڑھوں کا تقابل .. 171
پتوکی سے دسواں خط... رمضان کے معمولات، اردو میں مہارت 178
پتوکی سے گیارھواں خط... پاکستان ٹائمز کا ایک تنقیدی مضمون، انگریز لڑکیوں کی آمد 182
پتوکی سے بارھواں خط... حکیم نعمت علی خان کا خاندان، چپاتیاں پکانے کی مشق 200
مینٹل ہسپتال سے خط... مولانا مودودی کی ڈانٹ ڈپٹ، مولانا مودودی سے معذرت 218
سنت نگر لاہور سے پہلا خط... محمد یوسف خان سے شادی، جماعت اسلامی کے اجتماع پر حملہ .. 238
سنت نگر لاہور سے دوسرا خط... حرم کعبہ کے بارے میں ایک ہولناک خواب، عائشہ کی پیدائش اور وفات 263
پس تحریر... (از محمد یوسف خان) 284

Marfat.com

عرض مترجم

مریم جمیلہ سے ملنے کی ہماری پہلی کوشش نہ صرف ناکام ہوئی بلکہ اس نے عجیب الجھنیں پیدا کر دیں۔ ان کا کمرہ اس مکان کی اوپر والی منزل میں ہے جہاں وہ شادی کے بعد سے اب تک رہ رہی ہیں۔ وہ تو نیچے تشریف نہیں لائیں البتہ ان کے شوہر محمد یوسف خان نے ہمیں شرف ملاقات بخشا۔ یوسف خان اونچے قد کے خوبصورت جوان ہوا کرتے تھے۔ اب بڑھاپے کی زد میں ہیں اور اونچا سنتے ہیں۔ وہ اپنی جوانی کے ان دنوں کے واقعات سناتے رہے جب وہ برطانیہ کی رائل نیوی میں ملازم تھے اور پاکستان کی خاطر انھوں نے بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ جس شخص کی سماعت میں خرابی ہو جائے اور وہ اونچا سننے لگے تو وہ بولتا بھی اونچی آواز میں ہے، تو یوسف خان صاحب بلند آواز میں بول رہے تھے اور ہم مؤدب بیٹھے سن رہے تھے۔ وہ ذرا دم لینے کو رکے تو ہم نے موقع غنیمت جانا اور مدعا بیان کرتے ہوئے درخواست کی وہ اس کتاب کے انگریزی ایڈیشن کی اشاعت اور اس کے اردو ترجمے کی اجازت دے دیں تو ہم بہت مشکور ہوں گے۔

یوسف خان صاحب بپھر گئے اور انتہائی غصے میں انھوں نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے بھی ان کے پاس کچھ لوگ آئے تھے اور انھوں نے مریم جمیلہ کی کتابوں کی ازسرنو طباعت کی اجازت مانگی تھی لیکن پھر وہ غائب ہو گئے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ہم ان لوگوں کو ڈھونڈھ کر لائیں تاکہ وہ ان سے حساب بے باق کر سکیں۔ ہم اس معاملے میں یوں پھنس گئے کہ ہم نے تعارف کرواتے ہوئے اپنی دانست میں ایک معتبر شخص کا نام لے

Marfat.com

دیا تھا۔ پہلے آنے والے صاحبان بھی انھی کی معرفت آئے تھے اور اجازت لے کر جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ اور ہم نا قابل اعتبار قرار دیے جا رہے تھے۔ ہم نے بہتیری کوشش کی خان صاحب کو سمجھانے کی کہ ہم ان افراد کو جانتے ہیں نہ ڈھونڈ سکتے ہیں لیکن ان کا اصرار جاری رہا۔ بظاہر یوں لگتا تھا کہ سمجھنا تو دور کی بات وہ ہماری بات سن بھی نہیں پا رہے۔

ہم نے اس واقعے کے بیان میں جمع کی ضمیر استعمال کی ہے۔ جی ہم اکیلے نہیں تھے بلکہ چار افراد تھے جو یوسف خان کی عدالت میں اپنے کیس کی وکالت کر رہے تھے۔ ہم خود وِش (ویمن انسٹیٹوٹ آف سائنس اینڈ ہیومینیٹز) کے رجسٹرار، مینیجمنٹ سائنسز ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ ''ایئر کموڈور (ریٹائرڈ) محمد سلیم، ایڈمن آفیسر صہیب قرنی اور لاہور میں مقیم ہمارے مشترکہ دوست عبدالعزیز۔ پہلے اس واقعے کا پس منظر سن لیں:

مریم جمیلہ کی کتاب ''ایٹ ہوم ان پاکستان'' راولپنڈی صدر میں فٹ پاتھ پر بکنے والی پرانی کتابوں میں نظر آئی۔ مصنفہ کا نام تو جانا پہچانا تھا لیکن یہ کتاب نظر سے نہیں گزری تھی۔ چند صفحات کی ورق گردانی کے بعد ہم نے سستے داموں یہ کتاب خرید لی۔ کتب فروش نے شکر ادا کیا ہوگا کہ اسے ایک ایسی کتاب کے بھی کچھ دام مل گئے جو کرم خوردہ تھی اور بھیگی ہوئی بھی۔ ہم اسے گھر لے گئے، اسے خشک کیا اور پڑھنے بیٹھ گئے۔ کتاب اتنی دلچسپ اور سبق آموز تھی کہ ہم نے سوچا اسے ہر پڑھی لکھی لڑکی کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ ہم نے کتاب پر دیا ہوا پتہ نوٹ کیا اور لاہور میں ایک دوست کو بتایا کہ وہ اس پتے پر یوسف خان صاحب کو تلاش کریں جو مریم جمیلہ کے شوہر اور ان کی کتابوں کے پبلشر ہیں اور پچاس کتابیں خرید کر ہمیں بھجوا دیں۔ ارادہ یہ تھا کہ ابتدائی طور پر انھیں وِش کی طالبات میں تقسیم کیا جائے۔ پتہ چلا کہ مریم جمیلہ کی کتابیں تو کافی عرصہ پہلے شائع ہوئی تھیں اور اب ناپید ہیں۔ یوسف خان صاحب یہ کام کیا کرتے تھے لیکن اب وہ صاحب فراش ہیں اور اشاعتی کاموں سے سبکدوش۔ باہمی مشاورت

Marfat.com

کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ لاہور چلتے ہیں، مریم جمیلہ اور یوسف خان صاحب سے ملتے ہیں اور ان سے انگریزی ایڈیشن کی از سرنو طباعت اور اردو قارئین کے لیے ترجمے کی اجازت لیتے ہیں۔ پہلی ملاقات کا حال ہم شروع میں سنا چکے۔ جب مذاکرات کسی نتیجے پر پہنچتے نظر نہ آئے تو یوسف خان صاحب کی بہو مسز عالیہ حسین فاروق ہماری مدد کوئی آئیں۔ انھوں نے نرمی سے ہمیں سمجھایا کہ یوسف خان صاحب سے مزید تکرار لا حاصل رہے گی۔ وہ بعد میں کچھ کریں گی۔ ہم سلام دعا کے بعد رخصت ہو گئے۔

ہم بیگم عالیہ حسین فاروق کے شکر گزار ہیں، انھوں نے ہمارے بارے میں ادھر ادھر سے پوچھ گچھ کی اور یہ تسلی کرنے کے بعد کہ ہم واقعی قابل اعتبار ہیں انھوں نے مریم جمیلہ کی بیٹی ماریہ کو بلایا جو شادی کے بعد لاہور ہی میں رہائش پذیر ہیں۔ دونوں نے مل کر یوسف خان صاحب کو قائل کر کے اس معاہدے پر دستخط کروا لیے جس کا مسودہ ہم ان کے پاس چھوڑ آئے تھے۔ ہم دوبارہ ان سے ملنے گئے، ان کا شکریہ ادا کیا اور یقین دلایا کہ کتاب شایان شان طریقے سے چھاپی جائے گی اور ہر ایڈیشن کی رائلٹی انھیں ادا کی جائے گی۔ بیگم عالیہ حسین فاروق نے اس موقع کی مناسبت سے خوشبودار چائے، لذیذ کیک اور خستہ بسکٹوں سے ہماری تواضع کی۔ مریم جمیلہ بھی اس موقع پر موجود تھیں۔ اس وقت تک انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے خان صاحب نے کتاب کی اشاعت کی اجازت دے دی ہے۔ جب ان کی بیٹی ماریہ نے بتایا کہ خان صاحب نے اجازت دے دی ہے تو وہ ایک معصوم بچے کی طرح خوش ہوئیں اور بے ساختہ تالیاں بجانے لگیں اب ان کی عمر اٹھتر برس ہے اور وہ ہنسی خوشی اسی گھر میں رہ رہی ہیں جس گھر میں وہ یوسف خان کے ساتھ شادی کے بعد آئی تھیں۔ ان کی بیٹی ماریہ نے بتایا کہ انھوں نے کبھی امریکہ جانے کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ ایک دفعہ بھی اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ وہ آج کل سنت نگر لاہور میں رہ رہی ہیں۔ یہ جگہ پہلے کسی سکھ کی یاد میں سنت نگر کہلاتی تھی لیکن یوسف خان جو کئی دفعہ اس علاقے کے کونسلر رہے، انھوں نے اس کا نام سُنّت نگر رکھوا دیا۔

Marfat.com

یہ کتاب اس شاندار جدوجہد کی کہانی ہے جو انھوں نے پاکستان ہجرت کرنے کے لیے کی تاکہ وہ قرآن اور سنت کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔ اسلام لانے کے بعد ان کا امریکہ میں رہنا دوبھر ہوگیا تھا۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی سے خط کتابت کے دوران میں انھوں نے اپنی مشکلات اور الجھنوں کا ذکر کیا تو مولانا نے انھیں پاکستان آنے کی دعوت دی۔ جس معاشرے میں وہ پلی بڑھی تھیں، اسے چھوڑنا اور اپنے خاندان کے قریبی رشتہ داروں سے ہمیشہ کے لیے جدائی آسان فیصلہ نہیں تھا۔ وہ ایک سال تک اس پر غور کرتی رہیں اور بالآخر انھوں نے مولانا مودودی کی پیش کش قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا اور یہ فیصلہ اٹل تھا۔ انھوں نے سفر کی تیاری شروع کردی۔ ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ ہوائی جہاز سے سفر کرسکیں۔ انھوں نے ایک مال بردار بحری جہاز میں اپنی نشست محفوظ کروائی۔ سفر سے پہلے وہ نیویارک کے ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ جہاز کی روانگی میں دو دن باقی تھے کہ وہ بری طرح بیمار پڑگئیں پیچش اور قے نے ان کا برا حال کردیا۔ نیم بے ہوشی کی یہ حالت تھی کہ انھیں کچھ پتہ نہ چلا کہ ہوٹل میں مقیم افراد میں سے ان کی طبیعت تاحال جاننے کے لیے، کون آیا، کون گیا؟ ان کے ساتھ والے کمرے میں رہنے والی ایک خاتون نے جو کسی فیکٹری میں کام کرتی تھی، ان کی دیکھ بھال کرنے کے لیے چھٹی لے لی۔ جب ان کی طبیعت غیر سے غیرتر ہوتی گئی تو اس خاتون نے ان سے اجازت چاہی کہ وہ کسی پادری کو بلوالیں تاکہ مرنے سے پہلے کی کچھ مذہبی رسومات ادا کی جاسکیں۔ مریم نے نرمی سے اسے بتایا کہ وہ مسلمان ہیں اور انھیں کسی پادری کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر نے انھیں ہدایت کی کہ کسی ہسپتال میں داخلہ ضروری ہے تاکہ انجکشن کی مدد سے انھیں خوراک دی جاسکے ورنہ جسم میں نمکیات اور پانی کی کمی کی وجہ سے ان کی زندگی کو سخت خطرہ لاحق تھا۔ انھوں نے ہسپتال جانے سے انکار کردیا اور پھر معجزانہ طور پر ان کی طبیعت سنبھل گئی۔ وہ عین وقت پر جہاز پر سوار ہوگئیں۔ پھر انھیں تیس دن کا طویل سفر کرنا پڑا۔ جہاز جہاں بھی رکتا تھا وہ اپنے والدین کو خط لکھ کر سفر کی روداد سناتی تھیں۔ خط کتابت کا یہ سلسلہ پاکستان آنے کے بعد بھی

Marfat.com

جاری رہا اور یہ کتاب انھی خطوط پر مشتمل ہے۔

(اس سے پہلے ۱۹۴۵ تا ۱۹۶۲ کے خطوط

Quest for the truth- Memories of childhood & youth in America

نامی کتاب میں شامل ہیں۔ جو کہ مصنفہ کی حق کی تلاش کے پس منظر اور ارتقائی سفر پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مریم جمیلہ کی دیگر اردو کتب اور ان کے تراجم بھی ان شاء اللہ جلد ہی منظر عام پر لائے جائیں گے۔ ناشر)

میں نے اس کتاب کا بامحاورہ ترجمہ کرنے کی اپنی سی بھرپور کوشش کی ہے۔ رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر انیس احمد نے اپنی مصروفیات سے قیمتی وقت نکال کر ترجمے کے چند صفحات پڑھے اور ان پر اطمینان کا اظہار کیا۔ سعود ساحر معروف صحافی ہیں اور روزنامہ امت کے بیورو چیف مختلف ادوار میں راولپنڈی، اسلام آباد یونین آف جرنلسٹ فیڈرل یونین آف جرنلٹس اور راولپنڈی پریس کلب کے صدر رہے ہیں۔ 1985 کے انتخابات کے بعد بننے والی پارلیمانی یونین آف جرنلٹس کے بانی جنرل سیکرٹری رہے ہیں۔ انھوں نے بھی ترجمے کو خوشگوار، سلیس اور فصیح قرار دیا۔ ان جیسی علمی شخصیتوں کی طرف سے حوصلہ افزائی میرے لیے یقینا باعث تقویت تھی۔ انگریزی دان قارئین بھی انگریزی ایڈیشن سے یقینا لطف اندوز ہوں گے کیونکہ مصنفہ کی مادری زبان بھی انگریزی ہے اور ان کی تحریر میں زبردست بلاغت اور روانی ہے۔ مصنفہ مغربی تہذیب کے عالمانہ تجزیے کی خوب صلاحیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے اس کی کمزوریوں کا براہ راست مشاہدہ کیا ہے اور وہ اس رو بہ انحطاط معاشرے کے تمام پہلوؤں سے بخوبی آشنا ہیں۔ یہ تجزیہ کھلے خط میں اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے جو انھوں نے اپنے والدین کو لکھا اور جو اس کتاب کے آغاز میں موجود ہے۔

انھوں نے پاکستان کے ابتدائی ایام میں شہری اور دیہی زندگی کے معمولات ریکارڈ پر لا کر پاکستان پر احسان کیا ہے۔ وہ ایک سال تک پتوکی میں ٹھہریں جو پنجاب کا ایک دور افتادہ قصبہ تھا۔ انھوں نے وہاں کی دیہی زندگی کے بارے میں جو کچھ لکھا

Marfat.com

ہے وہ پاکستان کے تمام دیہاتوں کی کہانی ہے اب تو زندگی بہت بدل گئی، بڑی تیزی کے ساتھ لیکن جب وہ پتوکی میں مقیم تھیں تو گاؤں میں کوئی گاڑی نظر نہیں آتی تھی بسیں تھیں جو پتوکی اور دوسرے شہروں کے درمیان چلتی تھیں۔ کوئی ٹیلی فون، ایئر کنڈیشنز اور کوئی ٹی وی سیٹ نہیں تھا۔ (ٹی وی ویسے بھی پاکستان میں 1964ء میں متعارف ہوا۔) آج کل کی نوجوان نسل کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ پاکستان کے ابتدائی دنوں میں زندگی کتنی سادہ تھی اور آج کل کی جدید سہولتوں کے بغیر بھی لوگ کتنے خوش باش تھے۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ایک جوان لڑکی نے جس کا تعلق افریقہ کے کسی دور دراز گاؤں یا ایشیا کے کسی پسماندہ علاقے سے نہیں بلکہ روشنیوں کے شہر نیویارک سے تھا، کس طرح خود کو پتوکی کی زندگی کے مطابق ڈھالا ہوگا جہاں وہ ریل کے تھرڈ کلاس ڈبے میں طویل سفر کر کے پہنچی تھیں۔ وہ اب بھی پتوکی میں قیام کی یادوں کو خوشگوار جانتی ہیں۔ بلاشبہ خوشی کے احساسات بیرونی حالات پر منحصر نہیں ہوتے، خوشی اندرونی اطمینان سے جنم لیتی ہے۔

جیسے کہ پہلے ذکر آچکا ہے، مریم جمیلہ ہجرت کر کے پاکستان آنے کے فیصلے پر کبھی پشیمان نہیں ہوئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ نیویارک ہی میں ٹھہری رہتیں تو اپنے نئے دین کے تحفظ کے لیے لڑائیوں ہی میں مصروف رہتیں، انھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد جو حالات بیان کیے ہیں ان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی ساری توانائیاں جھگڑوں میں ضائع ہو جاتیں جیسے کوئی دریا کسی صحرا میں پھیل کر خشک ہو جائے۔ پاکستان میں انھیں ذہنی سکون ملا، اطمینان میسر آیا اور موقع ملا کہ وہ نیکی پھیلانے، برائی کو مٹانے اور اسلام کو مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کر سکیں۔ قومی اور بین الاقوامی جرائد میں سینکڑوں مضامین لکھنے کے علاوہ انھوں نے مختلف موضوعات پر چونتیس سے زائد کتابیں لکھی ہیں جو ایک عظیم علمی کارنامہ ہے۔

اور چونکہ خود مغربی تہذیب میں پروان چڑھیں، اس لیے ان کے مشاہدات عمیق اور ان کا تجزیہ منطقی اور مدلل ہے۔ ویسٹرن سیویلائزیشن کنڈیمنڈ بائی اِٹ سیلف میں

Marfat.com

انھوں نے یورپ اور امریکہ کے دانشوروں اور کامیاب مصنّفین کے بتیس مضامین جمع کیے ہیں جن میں مختلف پہلوؤں سے مغربی تہذیب پر تنقید کی گئی ہے اور اس کے کمزور پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے ان میں میکیاولی، والٹیئر، فرائڈ، ڈارون، جون ڈیوی جیسے شہرہ آفاق مصنف شامل ہیں۔ دوسری کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں: ''اسلام بمقابلہ مغرب''، ''اسلام بمقابلہ ماڈرن اِزم''، ''اسلام بمقابلہ اہل کتاب ماضی اور حال''، ''مغربیت اور مسلمان''، ''جدید ٹیکنالوجی اور انسانیت کی تذلیل''، ''دی جنریشن گیپ اس کی وجوہات اور نتائج''، ''کیا مغربی تہذیب آفاقی ہے؟'' ان چند کتابوں کا ذکر محض اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ اندازہ ہو جائے کہ مرجم جمیلہ نے کتنے سنجیدہ موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اب یہ فیصلہ تو ان کتابوں کے مطالعے کے بعد ہی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے کس مہارت سے ان موضوعات کا حق نبھایا ہے۔

ہم نے قارئین کی آسانی کے لیے متعلقہ مضمون پر ان خاندانوں کے چارٹ بنا دیے ہیں جنھیں مریم جمیلہ نے اپنایا۔ ان میں سے زیادہ تر کرداروں کا ذکر تو مریم جمیلہ نے تفصیل سے کیا ہے۔ ان کے بارے میں مزید تفصیلات محمد یوسف خان صاحب نے پس تحریر میں شامل کی ہیں۔ اس کے بعد بھی ماشاء اللہ پتوکی کا خاندان اور یوسف خان صاحب کا خاندان پھیلتا پھولتا رہا۔ کئی بچوں کی شادیاں ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے دونوں خاندانوں کو کئی بیٹوں اور بیٹیوں سے نوازا۔ ان کتابوں کی اشاعت تک جو نئے افراد ان خاندانوں میں شامل ہوئے، وہ ہم نے چارٹ میں شامل کر دیے ہیں ان کی مثال چمکتے ستاروں کی کہکشاں کی سی ہے جن میں مریم جمیلہ ایک چاند کی طرح دمکتی ہے۔

آخری اہم بات یہ ہے کہ یہ کتاب ان طلبہ و طالبات کے لیے بڑی مفید ثابت ہوگی جو اپنی انگریزی بہتر کرنا چاہتے ہوں۔ انگریزی کے استاد کی حیثیت سے مجھ سے اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ہم اپنی انگریزی بہتر کیسے کریں۔ دیگر اقدامات کے علاوہ طلبہ و طالبات کی اکثریت کو یہ نصیحت کرتا رہا ہوں کہ وہ روزانہ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں ڈائری لکھا کریں۔ ان میں سے بہت سے لوگ شکایت کرتے

Marfat.com

تھے کہ ہمارے گھروں میں روز مرہ کے جو کام ہوتے ہیں، ان کے انگریزی کے مترادف الفاظ ڈھونڈنے میں انھیں سخت دشواری پیش آتی ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس سے ان کے ذخیرۂ الفاظ (Vocabulary) میں اضافہ ہوگا اور ان کی لکھنے کی مہارت بڑھے گی کیونکہ مریم پاکستان کی شہری اور دیہی زندگی کے روزمرہ واقعات کو اتنی دلچسپی سے بیان کرتی ہیں کہ انسان چٹخارے لے لے کر پڑھتا ہے اور اس بہانے نئے الفاظ کا استعمال سیکھتا ہے۔

یہاں قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اس تحریر کو پڑھنا چھوڑ دیں اور اس کا باقی حصہ کتاب ختم کرنے کے بعد پڑھیں کیونکہ یہ ان کرداروں کے بارے میں تازہ معلومات فراہم کرتا ہے جن کا ذکر مریم جمیلہ نے اپنی کتاب میں تکرار سے کیا ہے۔ ان سے ابتدائی تعارف کے بغیر یہ حصہ زیادہ مفید نہیں رہے گا۔

جب مریم جمیلہ مولانا مودودی کے خاندان کے ساتھ رہ رہی تھیں تو بڑی دو بیٹیوں حمیرا مودودی اور اسما کے ساتھ ان کی دوستی ہوگئی تھی، سب سے چھوٹے بیٹے خالد کے ساتھ کھیل میں شریک ہوتی تھیں۔ مولانا کے تمام بچوں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ قارئین کو تجسس ہوگا کہ اب کون کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ مندرجہ ذیل سطروں میں یہی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے سب سے بڑے بیٹے عمر فاروق نے عربی میں ایم اے کیا۔ عربی کے ماہر ہیں۔ کئی برس تک بطور مترجم اور استاد سعودی عرب میں خدمات انجام دیں۔ اب اپنے تین بچوں کے ساتھ لاہور میں مقیم ہیں اور باقاعدگی سے اپنی رہائش گاہ پر درس قرآن کا انتظام کرتے ہیں جن میں خواتین اور بچوں کی شرکت کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔

احمد فاروق جسے مریم جمیلہ نے ہمیشہ اپنی کتابوں میں مگن دیکھا، ایم بی بی ایس مکمل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے امریکہ چلے گئے۔ آج کل وہ وہیں ایک ہسپتال میں بطور ماہر نفسیات کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے ہی مولانا مودودی کو مجبور کیا

Marfat.com

تھا کہ وہ اپنے علاج کے لیے امریکہ آئیں پہلی مرتبہ مولانا مودودی جب امریکہ گئے تھے تو ان کے گردوں سے کئی پتھریاں نکالی گئی تھیں جن کی وجہ سے مولانا کئی برس تک تکلیف میں مبتلا رہے۔ مولانا نے یہ پتھریاں) ایک چھوٹی سی شیشی میں محفوظ کی ہوئی تھیں اور وہ اپنی خیریت دریافت کرنے کے لیے آنے والوں کو دکھایا کرتے تھے، جوش ملیح آبادی کا مولانا کے بڑے بھائی ابوالخیر مودودی سے دوستانہ تھا لیکن جوش مولانا مودودی کے نظریات سے سخت اختلاف رکھتے تھے اس کے باوجود دونوں میں احترام کا ایک رشتہ موجود تھا۔ وہ مولانا مودودی کی امریکہ سے واپسی پر ملنے آئے۔ پتھریوں کو دیکھ کر ہنستے ہوئے بولے: ''تو آپ کو اللہ اندر سے سنگسار کر رہا ہے۔ لوگوں کو گمراہ کرنے سے باز آ جاؤ۔'' مولانا اس سے بہت لطف اندوز ہوئے اور کافی دیر تک ہنستے رہے۔

مولانا کی بڑی بیٹی حمیرا کی منگنی پاک فضائیہ کے ایک آفسر سے ہوئی تھی لیکن شادی سے پہلے ہی ان کا جہاز کے ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ حمیرا کے غالباً مقدر میں لکھا تھا کہ وہ فضائیہ کے کسی آفسر ہی کی شریک حیات بنیں۔ ان کی شادی فضائیہ کے ایک آفیسر سید انظر علی سے ہوئی جو اس وقت جیسور (سابقہ مشرقی پاکستان اب بنگلہ دیش) میں تعینات تھے۔ حمیرا ایم اے انگلش کر چکی تھیں وہاں کسی کالج میں پڑھاتی رہیں۔ سانحہ مشرقی پاکستان سے پہلے سید انظر ملتان تعینات ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سید انظر سعودی عرب چلے گئے۔ حمیرا ان کے ساتھ تھیں، پہلے وہ ریاض رہے پھر جدہ منتقل ہو گئے۔ حمیرا نے چھ ماہ ریاض میں پڑھایا اور پھر بارہ سال تک جدہ کے ایک گرلز کالج میں۔ شاہ فیصل، شاہ فہد اور اسامہ بن لادن کی بیٹیاں ان کی شاگردوں میں شامل ہیں۔ آج کل لاہور میں مقیم ہیں، ان کے دو بچے ہیں، ایک بیٹا، ایک بیٹی۔ اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ ہر وقت قرآنی تعلیمات پھیلانے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ ان کے اپنے گھر پر بھی درس قرآن و حدیث کا اہتمام باقاعدگی سے ہوتا ہے اور شہر کے مختلف حصوں میں بھی وہ درس دیتی ہیں۔

Marfat.com

اسماء نے بی اے کے بعد تعلیم چھوڑ دی تھی۔ وہ مولانا کی رہائش گاہ کے پیچھے والے مکان میں رہتی ہیں۔ شادی کے پندرہ سال بعد ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ آج کل بیمار ہیں لیکن بیماری کے باوجود وہ اپنے گھر پر درس قرآن و حدیث کا باقاعدگی سے اہتمام کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جلد از جلد صحت عطا فرمائے۔

محمد فاروق نے بی اے تک تعلیم حاصل کی، ان کا لاہور میں اپنا کاروبار ہے۔ حسین فاروق بی اے کرنے کے بعد امریکہ منتقل ہو گئے تھے۔ حیدر فاروق نے پرواز کی تربیت حاصل کی تھیں اور کمرشل پائلٹ لائسنس بھی حاصل کر لیا تھا لیکن سیاسی وجوہات کی بنا پر انھیں کوئی ملازمت نہیں مل سکی۔ خالد فاروق اشاعتی کاروبار میں مصروف ہیں۔ مولانا مودودی نے تفہیم القرآن اور چند کتابیں اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنے پاس رکھی تھیں، باقی تمام کتابیں جماعت اسلامی کو وقف کر دی تھیں۔ خالد فاروق تفہیم القرآن کا انگریزی ترجمہ اور دیگر کتابیں چھاپتے ہیں۔ جن کی مانگ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور خالد اسی مانگ کو پورا کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی عائشہ کی شادی، کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ریاض قدیر کے بیٹے ڈاکٹر عارف ریاض سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ریاض با اصول آدمی تھے۔ ایک مرتبہ مغربی پاکستان کے گورنر امیر محمد خان نے انھیں ایک لڑکے کو کالج میں داخلہ دینے کو کہا جس کے نمبر مطلوبہ معیار سے بہت کم تھے۔ انھوں نے داخلہ دینے سے انکار کر دیا اور جب ان پر دباؤ ڈالا گیا تو وہ استعفیٰ دے کر گھر چلے آئے۔ عائشہ لاہور ہی میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔

مولانا مودودی جس گھر میں رہائش پذیر تھے اور جہاں مریم جمیلہ آ کر رہی تھیں اس گھر کو ایک لائبریری کے لیے وقف کر دیا گیا ہے جو سیّد ابو الاعلیٰ اکیڈمی کے زیر اہتمام قائم کی گئی ہے۔ اس گھر کا ایک حصہ حیدر فاروق کے پاس ہے جو وہاں خود رہائش پذیر ہیں۔

مریم جمیلہ پتوکی جا کر جس خاندان کے ساتھ رہی تھیں، ان کے سبھی افراد کا

Marfat.com

انھوں نے تفصیل سے تعارف کروایا ہے۔ ہم (مترجم، صہیب قرنی اور عبدالعزیز) اس گھر کو دیکھنے پتوکی گئے جہاں مریم جمیلہ رہائش پذیر رہی تھیں اور جس کے اردگرد کا ماحول انھوں نے مزے لے کر بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہم حکومت پنجاب کے شعبہ معاشرتی بہبود کے ریٹائرڈ ڈپٹی سیکرٹری اور اسد اللہ حیدر اور لاہور میں یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز کے لیکچرار طیب فاروق بھٹی کے شکر گزار ہیں جنھوں نے اپنی سخت مصروفیت سے وقت نکال کر ہمیں مطلوبہ مقامات دکھائے اور متعلقہ لوگوں سے ملاقات کروائی۔

مریم جمیلہ کے بیان کردہ دنوں میں شرفیہ میڈیسن کمپنی کو حکیم نعمت علی اور ان کے برادر نسبتی حکیم محمد انور مل کر چلاتے تھے۔ بعد میں یہ کمپنی محمد انور کے حوالے کر دی گئی اور حکیم نعمت علی نے مین بازار پتوکی میں ''کریمیہ دواخانہ'' کھول لیا۔ اپنا گھر انھوں نے جماعت اسلامی کو عطیہ کر دیا تھا جہاں ان کا دفتر قائم ہے۔ شرفیہ میڈیسن کمپنی بعد میں عثمان کو ورثے میں ملی۔ مریم جمیلہ کے قیام کے دنوں میں عثمان دس مہینے کا تھا اور اتنا خوبصورت کہ مریم نے ایک سے زائد بار اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر ان کی شادی ہوئی تو وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گی کہ وہ اسے عثمان جیسے بیٹے اور فرحت جیسی بیٹی عطا کرے۔ شرفیہ میڈیسن کمپنی اب عثمان کے ہاتھوں میں ہے جو اپنے تین بیٹوں کے ساتھ اس کمپنی کی اوپر والی منزل میں رہتے ہیں جسے بعد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ ان کا ایک بیٹا، آج کل راولپنڈی میں بی ایس سی کا طالب علم ہے۔

فرحت نے جو اردو کے ابتدائی اسباق میں مریم جمیلہ کی ہم سبق تھی، بعد میں لاہور سے فائن آرٹس میں ایم اے کیا۔ وہ گجرات کی ایک فیملی میں بیاہی گئیں۔ ان کے شوہر کا نام ناصر ہے۔ اور وہ آج کل امریکہ میں مقیم ہیں۔ ان کے چار بچے ہیں۔

محمد سرور کی بیٹی ام کلثوم ان دنوں کراچی سے پتوکی آئی ہوئی تھیں انھوں نے نہ صرف مریم جمیلہ کو اردو سکھانے میں مدد دی بلکہ ملاقات کے لیے آنے والی خواتین سے گفتگو کے لیے مترجم کے فرائض بھی انجام دیے۔ بعد میں ان کی شادی حکیم نعمت علی

Marfat.com

کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر عیس محمد سے ہوئی جو لاہور کے جناح ہسپتال سے میڈیکل سپرینٹنڈنٹ کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوئے۔ وہ لاہور چھاؤنی میں رہائش پذیر ہیں۔

میں تہہ دل سے محمد یوسف خان اور مریم جمیلہ کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کا انگریزی ایڈیشن اور اس کا ترجمہ چھاپنے کی اجازت دی۔ گورنمنٹ کالج اوکاڑہ کے پرنسپل (ریٹائرڈ) پروفیسر اکرم طاہر کا بھی بہت بہت شکریہ کہ انھوں نے انگریزی ایڈیشن کی پروف ریڈنگ بڑی باریک بینی سے کی اور کئی غلطیوں کی اصلاح کی۔ انھوں نے متن کو بہتر بنانے کے لیے بھی کئی قیمتی تجاویز دیں جن کا شکریہ الفاظ میں ممکن نہیں۔ صفدر چودھری صاحب (از منصورہ لاہور) کا بھی شکریہ وہ نہ صرف ترجمے کے کام کی حوصلہ افزائی کرتے رہے بلکہ دونوں کتابوں کی اشاعت کے لیے ہماری ہمت بھی بندھاتے رہے۔ انھوں نے مختلف لوگوں سے رابطہ کر کے بعض اہم معلومات حاصل کرنے میں مدد کی اور اہم ترین بات یہ کہ انھوں نے مریم جمیلہ کے خاندان کے افراد سے ہمارے بارے میں کلمہ خیر کہا اور ہمیں قابل بھروسہ سمجھ کر اشاعت کی اجازت دینے پر آمادہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

کرنل (ر) اشفاق حسین

28 اگست 2012

راولپنڈی

Ashfaq801@hotmail.com

Marfat.com

ارتحال

دیباچے میں ہم نے ذکر کیا تھا کہ اس کتاب کی اشاعت کی اجازت ملنے کے بعد ہم شکریہ ادا کرنے مریم جمیلہ کے گھر گئے تھے۔ اس وقت تک انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے شوہر یوسف خان صاحب نے ہمیں یہ کتاب اور اس کا ترجمہ چھاپنے کی اجازت دے دی ہے۔ وہ مغرب میں پلی بڑھی تھیں جہاں انفرادی آزادی پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ شوہر بیوی کی مرضی کے خلاف اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا، بچوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا جا سکتا لیکن مریم جمیلہ پر دین کا رنگ اتنا غالب آ چکا تھا اور مشرقیت ان کی شخصیت میں اتنی رچ بس گئی تھی کہ انہوں نے بڑی بے بسی سے کہا کہ میں تو بخوشی آپ کو کتاب چھاپنے کی اجازت دے دیتی لیکن خان صاحب نہیں مان رہے۔ ہم نے حیران ہو کر ان کی بیٹی ماریہ سے پوچھا کہ انہوں نے اپنی امی کو نہیں بتایا کہ خان صاحب نے ہمیں اجازت دے دی ہے۔ تب ماریہ نے اپنے والد سے کہا کہ وہ خود خانم کو اس بارے میں بتائیں۔ (مریم جمیلہ کے بچے اپنی والدہ کو خانم اور شفیقہ کو امی کہہ کر بلاتے تھے کہ ان کی پرورش انہی کے ہاتھوں ہوئی۔ مریم زیادہ تر لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتی تھیں)

جب خان صاحب نے انہیں بتایا کہ انہوں نے اجازت دے دی ہے تو وہ بہت خوش ہوئیں اور بے ساختہ تالیاں بجانے لگیں اور ہمیں مبارک باد کہا۔

ان کی خوشی کے اظہار نے ہمارے لیے مہمیز کا کام کیا۔ ہم نے کتاب کے متن کو بار بار پڑھا اور دوسروں سے پڑھوایا کہ کتابت کی کوئی غلطی باقی نہ رہے۔ صرف سرورق پر عروہ وحید سلیمانی سے پندرہ بیس دن بحث ہوتی رہی۔ دونوں کتابوں کے موضوع کے لحاظ سے الگ الگ سرورق تیار کیے گئے تھے۔ ان میں تبدیلیاں ہوتی رہیں اور پھر جو اچھے لگے ان کا انتخاب کیا گیا۔

Marfat.com

دونوں کتابیں عید سے پہلے چھپ چکی تھیں۔ بس جلد بندی کا کام باقی تھا۔ ہم یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہے تھے کہ بس دو چار دنوں میں لاہور جا کر جب ہم یہ کتابیں مریم جمیلہ کو پیش کریں گے تو وہ کتنی خوش ہوں گی لیکن شاید اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کہیں بڑی خوشی کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ۳۱ اکتوبر کی صبح دل کا دورہ پڑنے سے وہ انتقال کر گئیں اور اپنے خالق حقیقی سے جاملیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

عجیب استعارہ تھی صبح کا ستارہ تھی
اس کے علم کی وسعت جھیل بے کنارہ تھی
پروردۂ مغرب دین کا سہارا تھی

قارئین سے التماس ہے کہ وہ اس عظیم خاتون کے لیے دعائے مغفرت کریں جس نے محض دین کی خاطر اپنا آبائی وطن چھوڑا اور پھر کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا اور ہمیں اور ہمارے پبلشر کو بھی دعاؤں میں یاد رکھیں کہ مریم جمیلہ کی اس کتاب کو از سر نو متعارف کروانے کی جو حقیری سی کوشش ہم نے کی ہے اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے۔

کرنل (ر) اشفاق حسین......۳ نومبر ۲۰۱۲ء راولپنڈی

Marfat.com

والدینؑ کے نام کھلا خط

نومبر 1986

پیارے امی اور ابو

مجھے پاکستان میں رہتے ہوئے اب بیس سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا۔ اس دوران میں وہاں (امریکہ میں) آپ کو ایک پورا نیا خاندان مل گیا ہے جو پیارے پیارے لوگوں پر مشتمل ہے۔ اس سے آپ کی خوشیوں میں اضافہ ہوا ہے اب آپ پکی عمر کو پہنچ گئے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ اس دوران میں آپ میری توقعات سے کہیں زیادہ صحت مند رہے ہیں۔ آپ نے میری ساری کتابیں پڑھی ہیں اور وہ اسلامی لٹریچر بھی جو میں نے کھلے ذہن سے آپ کو بھجوایا تھا۔ اس لیے آپ کو اس موضوع سے تعارف کی ضرورت نہیں ہے جس پر میں اب بات کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے جو کچھ بھی کہنا ہے وہ آپ کے لیے اجنبی یا نیا نہیں ہوگا۔

میرا خیال ہے کہ آپ کو اس بات کا پورا اندازہ نہیں ہے کہ آپ کتنے خوش قسمت ہیں۔ جب تک آپ کی صحت برقرار ہے اور آپ اپنا خیال رکھ سکتے ہیں آپ ایک خوشگوار زندگی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ لیکن کیا آپ نے کبھی ان لاکھوں امریکیوں کے بارے میں سوچا ہے جو بیماریوں اور ناتوانی میں مبتلا ہو کر پرہجوم ہسپتالوں اور نرسنگ ہومز (جو درحقیقت مردہ خانوں کی طرح ہیں) میں رہنے پر مجبور ہیں یا بوڑھے افراد کے مراکز اور دماغی امراض کے ہسپتالوں کے بے رونق وارڈوں میں رہ رہے ہیں؟ اور کیا آپ نے ان سے بھی زیادہ بڑی تعداد میں ان بوڑھوں کے بارے میں سوچا ہے جو اپنے شریک زندگی سے محروم ہو کر ڈربوں جیسے کمروں میں تنہائی کی زندگی گزار رہے

Marfat.com

ہیں اور جنھیں ان لا ابالی اوباش لٹیروں کے ہاتھوں لٹنے اور پٹنے کا مستقل دھڑکا لگا رہتا ہے جو کسی سزا سے بے خوف اور پچھتاوے سے بے نیاز ہو کر کمزور اور ناتواں لوگوں کے شکار کی تلاش میں رہتے ہیں یہ بوڑھے لوگوں کے ساتھ ناروا سلوک، گھر کی اکائی ٹوٹنے اور مخلوط خاندان کو ترک کرنے کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ کیا آپ کی بہن، میری پھوپھی اور روزلین نے جو اَب پردادی بن چکی ہیں اور جنھیں احترام کرنے والے، ایک ہنستے بستے گھر کا تحفظ حاصل ہے، کبھی یہ سوچا کہ وہ کتنی خوش قسمت ہیں اور امریکہ میں ان جیسے خوش قسمت عمر رسیدہ افراد کتنے کم ہیں؟

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ معاشرہ جس میں آپ کی پرورش ہوئی ہے اور جس میں آپ نے اپنی پوری زندگی گزار دی ہے، بڑی تیزی سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور مکمل تباہی کے قریب ہے۔ درحقیقت ہماری تہذیب کا زوال بھی جنگ عظیم کے وقت ہی ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن دانشوروں اور ماہرین عمرانیات کے سوا کسی کو احساس نہیں ہوا کہ کیا ہو رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد اور خاص طور پر پچھلے دو عشروں میں یہ اتنی تیزی سے زوال کے اس مرحلے پر پہنچ چکی ہے کہ کوئی شخص اسے مزید نظر انداز نہیں کر سکتا۔

زندگی کے معاملات اور رویوں میں کسی قابل احترام اور قابل قبول معیار کے نہ ہونے کی وجہ سے اخلاقی بے راہ روی، تفریحی ذرائع، ابلاغ پر مبنی کجروی، بوڑھوں سے ناروا سلوک، طلاق کی روز افزوں شرح جو اتنی بڑھ چکی ہے کہ نئی نسل کے لیے پائیدار اور خوش گوار ازدواجی زندگی ایک خواب بن کر رہ گئی ہے۔ معصوم بچوں کے ساتھ غلط کاریاں، فطری ماحول کی تباہی، نایاب اور قیمتی وسائل کا بے محابا ضیاع، امراض خبیثہ اور ذہنی بیماریوں کی وبائیں، منشیات کی لت، شراب نوشی، خودکشی کا بڑھتا ہوا رجحان، جرائم، لوٹ مار، حکومتی اداروں میں بے ایمانی اور قانون کا عدم احترام...... ان تمام خرابیوں کی ایک ہی وجہ ہے۔

اور وہ وجہ ہے لامذہبیت اور مادیت پر مبنی نظام کی ناکامی...... نیک ماورائی، اعلیٰ و

Marfat.com

ارفع مذہبی نظام سے دوری اور اخلاقی قدروں کا ناپید ہونا...... اعمال کا دارومدار عقیدوں پر ہوتا ہے کیونکہ نیت ہی درست نہ ہو تو عمل ہمیشہ ناکام ہوتا ہے۔

شاید آپ اسے پڑھنے سے بیزار ہو جائیں۔ شاید آپ احتجاج کریں کہ جب آپ عالم دین ہیں نہ فلاسفر اور نہ ہی ماہر عمرانیات تو آپ کو اتنے گہرے معاملات پر غور کرنے کے لیے کیوں پریشان کیا جائے جب کہ بظاہر آپ کا ان معاملات سے براہ راست کوئی تعلق بھی نہیں؟ جب کہ آپ خوش بھی ہیں اور اس طرح کی زندگی گزارنے پر مطمئن بھی۔ آپ اپنی زندگی سے لطف اندوز ہونے کے خواہش مند ہیں اور حال میں رہنا چاہتے ہیں اور ہر آنے والے دن کی خوشیاں سمیٹنا چاہتے ہیں اگر زندگی ایک سفر ہے تو کیا یہ حماقت نہیں ہوگی کہ بندہ راستے میں آنے والی منزلوں پر آرام دہ ایام اور خوشگوار ٹھکانوں کی فکر تو کریں، لیکن سفر کے اختتام کے بارے میں کچھ نہ سوچے؟ آخر ہم کیوں پیدا ہوئے تھے؟ اس زندگی کا کیا مطلب ہے؟ کیا مقصد ہے؟ آخر ہمیں کیوں مرنا ہے اور ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ موت کے بعد کیا معاملہ ہونا ہے؟

ابو! آپ نے ایک سے زائد بار مجھے بتایا ہے کہ آپ کسی روایتی مذہب کو اس لیے قبول نہیں کر سکتے کیونکہ آپ کو یقین ہے کہ الہامی مذہب جدید سائنس سے متضاد چیز ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے ہمیں ساری دنیا کے بارے میں بہت معلومات فراہم کی ہیں، ہمیں آرام و آسائشات اور سہولتیں فراہم کی ہیں، اس نے ہماری کارکردگی میں اضافہ کیا ہے اور ان بیماریوں کے علاج دریافت کیے ہیں جو جان لیوا ثابت ہوتی تھیں لیکن سائنس ہمیں یہ نہیں بتاتی اور نہیں بتا سکتی کہ زندگی اور موت کا کیا مطلب ہے۔ سائنس ہمیں "کیا اور کیسے" کا جواب تو دیتی ہے لیکن "کیوں" کے سوال کا کبھی کوئی جواب نہیں دیتی۔ کیا سائنس کبھی یہ بتا سکتی ہے کہ کیا درست ہے اور کیا غلط؟ کیا نیکی ہے، کیا برائی؟ کیا خوبصورت ہے اور کیا بدصورت؟ ہم جو کچھ کرتے ہیں اس کے لیے کس کو جوابدہ ہیں؟ مذہب ان سارے سوالوں کے جواب دیتا ہے۔

آج امریکہ کئی لحاظ سے قدیم روم کے زوال و شکست کے آخری مرحلوں سے

Marfat.com

گزر رہا ہے سوچ اور فکر رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ لامذہبیت ہمارے معاشرتی نظام کی مستحکم بنیاد ثابت نہیں ہوسکی۔ وہ مضطرب ہو کر مختلف سمتوں میں اس بحران کا حل تلاش کر رہے ہیں لیکن انھیں ابھی تک نہیں پتہ کہ یہ حل انھیں کہاں سے ملے گا۔ یہ تشویش چند ماہرین عمرانیات تک محدود نہیں ہے۔ قومی یکجہتی کی ٹوٹ پھوٹ کی بیماری براہِ راست آپ کو، مجھے اور ہم میں سے ہر ایک کو متاثر کر رہی ہے۔

قدیم روم نے بحران کے نازک دور میں اپنے مسائل کے حل کے لیے عیسائیت کو اپنایا اور اس کے بعد سے ایک ہزار سال تک چرچ نے یورپ پر اپنا غلبہ برقرار رکھا۔ اس سے رو بہ زوال روم میں کئی معاشرتی اور اخلاقی برائیوں کا خاتمہ ہوا اور لوگوں کے اخلاقی اور روحانی معیار بلند ہوئے۔ لیکن بدقسمتی سے اپنی تاریخ کے اہم تشکیلی مرحلے میں چرچ نے الحاد اور لامذہبیت سے سمجھوتہ کر لیا اور ایسا خانقاہی نظام اور ناقابل فہم دین اپنایا جو تحریک احیائے علوم سائنس کی نئی دریافتوں اور انقلاب فرانس کے سیکولرازم کا معاملہ حل نہیں کر سکتا تھا۔ اب جبکہ یورپ اور امریکہ میں عیسائی اپنے مذہب کو بالکل فراموش کر چکے ہیں اور چرچ تقریباً خالی ہو گئے ہیں، عیسائی مبلغین جو کہ مغربی سامراج کا ہراول دستہ ہیں افریقہ اور ایشیا میں مذہب کے نام پر لوگوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ عیسائیت کے بعد امریکہ کا دوسرا بڑا مذہبی گروپ یہودیوں کا ہے جو سیاست اور معیشت پر بھی چھائے ہوئے ہیں اور ذرائع ابلاغ پر بھی ان کا مؤثر کنٹرول ہے۔ صیہونیت ہمیشہ سے مذہبی اور قبائلی عصبیت میں مبتلا رہی ہے اور نئے لوگوں کو اپنے دین کے دائرے میں کم ہی قبول کرتی ہے۔ یہ کبھی بھی آفاقی مذہب رہا ہے نہ ہے۔ وہ صیہونی تحریک جو اسرائیلی ریاست کے قیام پر منتج ہوئی۔ یہودی قومیت اور قبائلیت کا اظہار تھی۔ مقبوضہ فلسطین میں اسرائیلوں کے خوفناک مظالم، لبنان اور ملحقہ علاقوں پر بلاجواز حملے فلسطینی عربوں کا قتل عام، انھیں تمام انسانی اور سیاسی حقوق سے محروم کرنا، اسی مذہبی عصبیت کا منطقی نتیجہ ہے اسی عصبیت کی وجہ سے صیہونیت کے قدامت پسند مذہبی رہنما (ربی) اس بات کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ اسرائیل

١١٠٤٨٠

Marfat.com

کوئی غلط کام کر سکتا ہے اور وہ اندھا دھند اسرائیل کے ہر اقدام کی حمایت کرتے ہیں۔ اخلاقی اور روحانی طور پر ان واضح خرابیوں کی وجہ سے صیہونیت کو مستقل مذہب قرار نہیں دیا جا سکتا۔

آج مسلمان امریکہ کا تیسرا بڑا مذہبی گروہ ہیں جو تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اب اسلام ایشیا اور افریقہ کے دور دراز صحراؤں اور جنگلوں تک محدود نہیں رہا۔ یہ امریکہ کے لیے بھی اجنبی نہیں رہا۔ آج امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد تیس لاکھ سے زائد ہے اور یہ تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ مسلم ممالک کے ہزاروں طلبہ آج امریکی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہنر مند مسلمان ہر پیشے میں مصروف کار ہیں۔ پچھلے دو عشروں میں امریکہ کے ہزاروں آبائی باشندوں نے اسلام قبول کر کے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کیا ہے۔ ابتدا میں اسلام قبول کرنے والوں کی کثیر تعداد سیاہ فام لوگوں پر مشتمل تھی جنھیں میلکم ایکس کی طرح اسلام میں عزت نفس، وقار اور برادرانہ اخوت میسر آئی لیکن حالیہ برسوں میں یورپی نسل کے وہ سفید فام لوگ بھی جوق در جوق اسلام قبول کر رہے ہیں جو اپنی سابقہ مضطرب زندگیوں میں رہنمائی کی تلاش میں تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے قربانیاں بھی دی ہیں اور بہت سی مشکلات بھی برداشت کی ہیں۔ ان سب میں مجھ جیسے خوش نصیب بھی ہیں جنھیں آپ جیسے والدین میسر ہوں۔ اکثریت کو اپنے غیر مسلم والدین اور رشتہ داروں کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ آج عیسائیوں کے چرچ اور یہودیوں کی عبادت گاہیں خالی پڑی ہیں جبکہ امریکہ کے ہر اہم شہر اور قصبے میں ابھرتی ہوئی نو تعمیر شدہ مسجدیں اور اسلامی مراکز تیزی سے بڑھتی ہوئی تعداد میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ امریکہ کے نو مسلموں کی اکثریت جوان، ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں نوجوان امریکیوں کو کس بات نے اسلام کی طرف متوجہ کیا ہے؟

آج امریکی باشندے، جوان ہوں یا بوڑھے بڑی تندہی سے رہنمائی کی تلاش میں ہیں۔ تلخ تجربوں کے بعد انھیں پتہ چلا ہے کہ زندگی کے کسی مقصد اور صراط مستقیم کی

Marfat.com

طرف قابل اعتماد رہنمائی کے بغیر شخصی آزادیاں اور وہ ساری سہولتیں جو امریکیوں کو حاصل ہیں۔ لایعنی اور اپنی ذات کی تباہی کے مترادف ہیں۔ سیکولرازم اور مادیت امریکیوں کو ان کی انفرادی یا اجتماعی زندگی میں کسی طرح کی مثبت اور تعمیری، اخلاقی قدریں فراہم نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیت اور صیہونیت کے ہاتھوں ناکامی کے بعد امریکہ میں زیادہ سے زیادہ لوگ اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ نومسلم اسلام میں ایک پاکیزہ، صحت مند، صاف ستھری اور دیانتدار زندگی کا سراغ پاتے ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک موت سے ہر چیز ختم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ اس کے بعد آخرت میں ہمیشہ رہنے والی نعمتوں، پائیدار ذہنی سکون اور دائمی خوشیوں کی توقع رکھتے ہیں۔

قرآن مقدس اور رسول خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مستند احادیث میں پائی جانے والی یہ ہدایت و رہنمائی صدیوں سے مشرق کے دور افتادہ علاقوں کی نسلوں تک محدود نہیں تھی بلکہ آج مغرب کو جو معاشی، معاشرتی، اسلامی اور سیاسی مسائل درپیش ہیں، ان کا حل بھی ہدایت کے انھی سرچشموں میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں اسلام میں سرد مہری، خالق سے دوری یا خالق کی بے نیازی کے احساسات نہیں پائے جاتے۔ مسلمان ایک ایسے خدا پر یقین رکھتے ہیں جس میں اپنائیت ہے۔ جس نے نہ صرف اس کائنات کو پیدا کیا بلکہ وہ اس کے نظم ونسق کا بھی ذمہ دار ہے اور وہی اس کا حکمران ہے۔ وہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے اور ہم میں سے ہر ایک کا بہت خیال رکھتا ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ ہم سب سے ہر ایک کی شہ رگ سے بھی قریب ہے۔

قرآن چونکہ الہامی کتاب ہے، اسے تبدیل کیا جا سکتا ہے اور نہ کبھی تبدیل ہو گی۔ چونکہ یہ ہر طرح سے مکمل ہے، اس لیے اس پر نظر ثانی کی جا سکتی ہے نہ اسے مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے اور نہ اس میں اصلاح کی جا سکتی ہے۔ چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، ان کی دی ہوئی رہنمائی بھی حتمی ہے کوئی اور ہدایت اسے منسوخ نہیں کر سکتی قرآن اور سنت تمام انسانوں کے لیے رہنمائی ہے، وہ مشرق یا مغرب کے کسی مسلک کے باشندے بھی ہوں، اس سے یکساں مستفید ہو سکتے ہیں۔ یہ ہدایت چونکہ ہر

Marfat.com

زمانے اور ہر علاقے کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے، اس لیے یہ کبھی متروک یا فرسودہ نہیں ہوگی۔

آپ دونوں کافی طویل عمر پا چکے ہیں اور بہت کم مہلت باقی رہ گئی ہے۔ اگر آپ فوراً عمل کریں تو زیادہ تاخیر نہیں ہوگی۔ اگر آپ کا فیصلہ مثبت ہو تو پاکستان میں اپنے پیارے لوگوں سے آپ کا نہ صرف خونی رشتہ ہوگا بلکہ ایمان کا رشتہ بھی قائم ہو جائے گا۔ آپ نہ صرف اس دنیا میں ان سے محبت کر سکیں گے بلکہ ہمیشہ رہنے والی زندگی میں بھی آپ ہمارے ساتھ ہوں گے۔

اگر آپ کا فیصلہ منفی ہو تو مجھے ڈر ہے کہ آپ کی یہ ہنستی بستی، آرام دہ اور خوشگوار زندگی تو جلد ختم ہو جائے گی اور جب ہونی ہو کر رہے گی تو افسوس اور پچھتاوے کا دور گزر چکا ہوگا۔ جو سزا ملے گی وہ بڑی خوفناک ہوگی اس سے کوئی جائے پناہ ہے نہ راہِ فرار۔

میں ایک بیٹی کی حیثیت سے، جسے آپ سے محبت ہے، آخر وقت تک چاہوں گی کہ آپ اس برے نصیب سے بچ جائیں لیکن فیصلہ صرف آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کو مکمل اختیار ہے کہ آپ اس دعوت کو قبول کریں یا مسترد کر دیں۔ آپ کے مستقبل کا انحصار اس انتخاب پر ہے جو آپ نے اب کرنا ہے۔

اپنی ساری محبتوں اور نیک خواہشات کے ساتھ

آپ کی وفادار بیٹی

مریم جمیلہ

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امریکہ میں مقیم اپنے والدین کو لکھے گئے آپ بیتی پر مشتمل یہ خطوط جن کا اصل متن نیو یارک پبلک لائبریری میں محفوظ ہے، میری زندگی کے فیصلہ کن اور اہم ترین ایام کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لڑکپن کے بعد ایک طویل عرصہ میں نے امریکی طرز زندگی کے معمول سے ہٹ کر گزارا، سن بلوغ کو پہنچی، اپنے والدین سے الگ ہو کر خودمختار ہوئی، ادبی کیریر اختیار کیا، شادی کی اور ایک ماں بن گئی۔

امریکہ سے پاکستان کا سفر ایک ہجرت تھی جس کا مقصد وحید ایک ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں اپنے آبائی ملک کی نسبت، اسلام کے مطابق بھرپور زندگی گزارنے کی امید رکھی جاسکے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد میں امریکہ سے پاکستان آئی تو میری صرف یہ خواہش تھی کہ مجھے ایک روایتی اور قدامت پسند اسلامی معاشرے میں قبول کر لیا جائے۔ بس یہی ایک چاہت تھی جو پتوکی میں پوری ہوئی جہاں میں نے تقریباً ایک سال گزارا۔

1960ء سے 1962ء تک میری مولانا مودودی سے خط کتابت رہی اور میری پاکستان ہجرت کا سبب بنی۔ اس دوران میں مَیں نے مولانا مودودی کے بارے میں جو تاثر قائم کیا تھا، وہ اس حقیقت سے بہت مختلف تھا جو یہاں پہنچ کر مجھ پر منکشف ہوئی۔ وہ بھی مجھے اپنی توقعات سے بالکل برعکس پا کر حیران اور قدرے مایوس ہوئے۔ میں جس روایتی اور قدامت پسند معاشرے کی تصویر سینے میں بسا کر لائی تھی اور جس ماحول میں رہنے کی خواہش رکھتی تھی، مولانا مودودی کی اسلام کی تشریح نو کے معیار اور مقاصد اس سے بہت مختلف تھے اور ان کو سمجھنے میں مجھے بہت دیر لگی۔

Marfat.com

اس کتاب میں دیے گئے خطوط میرے ان تجربات اور المناک سانحوں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں جن سے میں پاکستان آنے کے فوراً بعد دوچار ہوئی۔ میں اس ملک میں نوواردتھی۔ ہر چیز نئی اور دلچسپ لگتی تھی۔ ان خطوط میں بیان کردہ تمام کردار اصلی ہیں اور انہیں میں نے ویسے ہی بیان کیا ہے جیسے ایک نووارد کو محسوس ہوا۔

قارئین کی طرف سے حیران کن سوال یہ ہوسکتا ہے کہ ایک ماڈرن امریکی لڑکی جو نیویارک جیسے بڑے شہر میں پیدا ہوئی، وہیں پلی بڑھی، اس نے ہر قیمت پر اپنی خوشیوں کے حصول اور آرزوؤں کی تکمیل کے لیے تیسری دنیا کے ایک پسماندہ اور غریب ملک کا انتخاب کیوں کیا؟ یہ خطوط اس سوال کا مفصل جواب ہیں۔

مریم جمیلہ

Marfat.com

سکندریہ سے خط

دی ہیلینک ٹارچ

دی ہیلینک لائنز، لمیٹڈ

سکندریہ، مصر

3 جون 1962ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس

لارچمونٹ ایکڑز، اپارٹمنٹ نمبر 223-C

لارچمونٹ، نیویارک، یو۔ایس۔اے

ڈیئر امی اور ابو

آج صبح جب ہم اسکندریہ پہنچے تو آپ کی طرف سے لکھے گئے تین خط میرے منتظر تھے جنہیں پا کر مجھے حیران کن خوشی ہوئی۔ آپ کی طرف سے خیریت کی خبر یقیناً تسلی کا باعث تھی۔ اپنی کزن جوڈی کا محبت بھرا خط میرے لیے مزید خوشیوں کا باعث تھا کہ اس نے میرا اتنا خیال کرتے ہوئے خط لکھنے کا وقت نکالا۔ اے کاش آپ کا 22 مئی کا تحریر کردہ خط میری اٹھائیسویں سالگرہ کے دن مل جاتا۔ یہ یقیناً میرے اس دن کو خوشگوار بنا دیتا جو بڑا ہی ناخوشگوار گزرا۔

مجھے امید ہے کہ آپ کو میرا 25 مئی کا لکھا خط مل گیا ہوگا اور یہ بھی کہ آپ یہ خط پڑھ کر افسردہ نہیں ہوئے ہوں گے کیونکہ آج جب ہمارا جہاز اسکندریہ پہنچا تو ایک طویل اندھیری رات روشن دن میں بدل چکی تھی۔ میں نے اپنے پچھلے خط میں جن ناخوشگوار واقعات کا ذکر کیا تھا، وہ ناگزیر تھے۔ ان سے کسی طرح چھٹکارا ممکن نہ تھا۔ یہ ایک

Marfat.com

طویل افسردہ کن رات تھی کیونکہ ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے ساتھ رہنا بڑا اذیت ناک تجربہ ہے۔ میں جب ان سے گفتگو کرتی ہوں تو اگرچہ ہم انگریزی ہی بول رہے ہوتے ہیں لیکن ابلاغ ناممکن ہوتا ہے۔ ہمارے دماغ ایک دوسرے سے ایسے دور ہوتے ہیں جیسے مختلف سیاروں کے باسی ہوں۔

تقریباً ایک ہفتہ پہلے ہم اٹلی کی بندرگاہ نیپلز پہنچے۔ جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز نہیں ہوا بلکہ اس سے کچھ فاصلے پر ٹھہرا رہا اور ایک ٹینکر نے ہمیں ایندھن کا تیل فراہم کیا۔ اس دوران میں ایک موٹر بوٹ آئی اور ایک انگریز خاتون، اس کے دو بچوں اور دو خدمت گزاروں کو لے گئی۔ مجھے اس انگریز خاتون کے جانے سے خوشی ہوئی کیونکہ وہ بہت ہی نک چڑھی تھی اور اس کا رویہ انتہائی حقارت آمیز تھا۔ دو دن بعد، غروب آفتاب کے وقت ہم یونان کے جزیرے کریٹ پہنچے۔ وہاں سے روانگی طلوع آفتاب کے وقت ہوئی۔ تھیلما، اس کا شوہر شرمن، ایک یونانی بوڑھا اور تین یونانی مسافر یہیں اتر گئے۔ مجھے ان کے جانے سے بڑی تسلی ہوئی کیونکہ ان کے ساتھ گزارا وقت اتنا خوشگوار نہیں تھا۔ ایک دن پہلے کی بات ہے، میں نے سوچا کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں، اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چنانچہ میں نے معمول کے مطابق اپنے کمرے میں ناشتہ کرنے کے بجائے ان کے ساتھ ناشتہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب میں باہر آئی تو دیکھا کہ ایک وسیع وعریض میز کے ایک کنارے پر ہماری نشستیں ساتھ ساتھ لگا دی گئی تھیں، تھیلما کی نشست میرے ساتھ تھی لیکن اس نے جیسے ہی مجھے دیکھا، جھٹ اپنی نشست تبدیل کر لی اور میرے بالمقابل جا کر بیٹھ گئی۔ جب اس کا شوہر شرمن آیا تو اس نے بھی یہی حرکت کی۔ تاہم بوڑھے یونانی شخص کا رویہ دوستانہ تھا، اگرچہ وہ بھی میرے لمبی کرتی والے اسلامی لباس کو پسند نہیں کرتا تھا اور یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ایک پڑھی لکھی امریکی لڑکی جدید مغربی لباس پہننا کیوں پسند نہیں کرتی۔ میں نے اسے سمجھانے کی بڑی کوشش کی لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ تاہم وہ مجھ سے بات چیت کرتا رہا۔ دوپہر کے کھانے کا تجربہ ناشتے سے مختلف نہیں تھا تاہم رات کے کھانے پر شرمن

Marfat.com

ذرا کھلا اور اس نے ایسے دوستانہ رویے کا مظاہرہ کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ تھیلما کے رویے میں بھی تبدیلی تھی بلکہ اس نے مجھے صابن کی کچھ ٹکیاں اور چھوٹی موٹی اور چیزیں بھی دیں جو وہ اپنے سامان میں پیک نہیں کر سکی تھی۔ وہ ایسی بن گئی جیسے ہمارے درمیان کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس نے مجھے اپنے کمرے میں آنے کی دعوت دی تا کہ میں پیکنگ میں ان کی مدد کر سکوں۔ اس نے اتنی شراب پی لی تھی کہ وہ بہک رہی تھی۔ میں نے اس کی بھرپور مدد کی۔ عجیب بات تھی، شرمن اور تھیلما یہ کہتے ہوئے تھکتے نہیں تھے کہ وہ عربوں اور مسلمانوں سے اس لیے نفرت کرتے تھے کہ وہ گندگی اور غلاظت میں رہتے ہیں۔

جب جہاز کریٹ پر رکا اور ان کے جانے کا وقت آیا تو جس حال میں انہوں نے اپنا کمرہ چھوڑا، اس سے غلیظ ترین جگہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ سارے فرنیچر پر کوڑا کرکٹ اور استعمال شدہ ٹشو پیپر بکھرے ہوئے تھے۔ فرش پر جا بجا سگریٹ کے ٹکڑے اور راکھ کے ڈھیر تھے۔ بستر کے نیچے شراب کی درجنوں خالی بوتلیں ٹوٹی پڑی تھیں۔ فرش پر شراب اور کولڈ ڈرنکس کے دھبے تھے۔ لگتا تھا انہوں نے اپنے قیام کے دوران میں باتھ روم کی صفائی نہیں کروائی۔ پورا فرش گندے ٹائلٹ پیپروں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر میں نے صفائی کی خاطر چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں۔ اس پر تھیلما بولی کہ ملازموں کو اسی چیز کی تنخواہ دی جاتی ہے۔ مَیں نے ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا لیکن دل میں سوچتی رہی کہ اتنی گندگی پھیلا کر ملازموں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ صفائی کریں، انسانیت کی توہین ہے۔ اپنے احساسات خود تک محدود رکھتے ہوئے جس حد تک ممکن تھا میں نے ان کا کمرہ صاف کیا۔ اس دوران میں تھیلما اپنے گھمنڈ کا اظہار کرتی رہی۔ بولی کہ وہ جہاز ران کمپنی کو غصے بھرا خط ضرور لکھے گی جس میں جہاز پر دیے گئے روکھے سوکھے کھانوں کی شکایت کی جائے گی۔ ان کے جانے کا وقت آیا تو دونوں نے مجھ سے دوستانہ رویے کا مظاہرہ کیا اور میرے سفر کے خوشگوار ہونے کی دعا کی۔ مَیں نے بھی ان کے لیے ایسی ہی خواہشات کا اظہار کیا پھر تھیلما سے مخاطب ہوتے

Marfat.com

ہوئے کہا "مجھے امید ہے کہ تمہارا سفر خوشگوار رہے گا۔ تم خوش رہنے کی کوشش کرنا" تھیلما نے میرا پاکستان کا پتہ بھی نوٹ کیا اور وعدہ کیا کہ مجھے ضرور خط لکھے گی۔ مجھے خوشی تھی کہ آخر میں سب معاملات ٹھیک رہے لیکن مجھے ان دونوں پر افسوس بھی ہے۔ تھیلما اپنے شوہر سے جو تیس برس کا ہے، 6 سال بڑی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ایسی کیا بات تھی جس نے شرمن کو شراب کی رسیا کی طرف مائل کیا۔ لگتا تو ایسا ہی تھا جیسے وہ ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہوں لیکن بوڑھے یونانی کی رائے تھی کہ انہوں نے رومانس کا محض روپ دھار رکھا ہے۔ مجھے نہیں معلوم لیکن ایک بات ظاہر تھی کہ ان کے بظاہر تعلقات میں جو کچھ نظر آتا تھا اصل حقیقت اس سے کہیں مختلف تھی۔

بہرحال، اب تو سب جا چکے، ہم دو مسافر باقی رہ گئے ہیں۔ ایک میں اور ایک نوجوان بھارتی طالب علم جو اس جہاز ران کمپنی کے ساتھ تین سال تک کام کرے گا اور اسی سلسلے میں کلکتہ جا رہا تھا۔ جہاز کا سارا عملہ بھی تبدیل ہو گیا ہے۔ جہاز کے کپتان اور سٹیورڈ سمیت سارا عملہ نیا ہے۔ کپتان کو چھوڑ کر باقی سارے لوگ انگریزی سے ناآشنا ہیں۔ دو چار لفظ بول لیتے ہیں۔ بھارتی طالب علم نے اپنا حلیہ اور رویہ اتنا مغربی بنا رکھا ہے کہ وہ خود کو "جیک" کہلوانے پر اصرار کرتا ہے۔ میں نے اسے کہا بھی کہ جب اس کا اصل نام جہانگیر گووند ہے تو وہ جیک کہلوانے پر اصرار کیوں کرتا ہے لیکن وہ پسند نہیں کرتا تھا کہ میں اسے اس کے بھارتی نام سے پکاروں۔ اس کا کہنا تھا کہ میرے تلفظ کی ادائیگی درست نہیں ہے۔ اس نے جب میرے ناول "احمد خلیل" کا آخری باب پڑھا تو کہا کہ بھارت کو اپنا معیار زندگی بہتر بنانے کے لیے ناول کے کردار "اسمٰعیل" جیسے افراد کی ضرورت ہے۔ جہاز کا یونانی کپتان ہماری گفتگو میں شریک ہو گیا اور اپنی سیر و سیاحت کے قصے سنانے لگا۔ اس نے کہا کہ دمشق کی نسبت وہ بیروت کو زیادہ پسند کرتا ہے کیونکہ بیروت بالکل یورپی، مغربی شہر لگتا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ بھی عربوں اور مسلمانوں سے نفرت کرتا ہے کیونکہ وہ جاہل، گنوار، گندے، غلیظ اور مذہبی دیوانے ہوتے ہیں۔ رات کے کھانے پر جب کپتان ہمارے ساتھ شامل ہوا تو وہ بھی اسی طرح

Marfat.com

کی گفتگو کرتا رہا۔ میرے بارے میں اس کا پہلا اعتراض میرے حجاب پر تھا۔ اس نے کہا کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ایک نوجوان پر کشش امریکی لڑکی، مشرق وسطیٰ کے پسماندہ لوگوں جیسا لباس پہننا کیوں پسند کرتی ہے۔ میں نے کہا کہ میں ایک مسلمان ہوں اور چاہتی ہوں کہ مسلمان نظر بھی آؤں اور یہ کہ میں اسی لباس میں خود کو سکھی اور خوش محسوس کرتی ہوں۔ اس نے میرے لباس پر مزید کوئی تبصرہ تو نہیں فرمایا لیکن تین مہینے پہلے ترکی کی سیاحت کے بارے میں شیخیاں بگھارتا رہا۔ اس نے کہا کہ وہ ترکوں سے نفرت کرتا ہے کیونکہ وہ مذہب کے دیوانے ہیں۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ دیوانوں سے اس کی کیا مراد ہے تو اس نے کہا کہ ترک سور کا گوشت نہیں کھاتے اور کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو قرآنی احکام کے منافی ہو کیونکہ وہ جہنم میں جانے سے ڈرتے ہیں۔ وہ غیر مسلم یورپی اور امریکی باشندوں سے تعلق سے بھی احتراز کرتے ہیں کیونکہ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ ان کے مذہب اور ثقافت پر آنچ نہ آئے۔ اس کا خیال تھا کہ مغربی تہذیب غالب ہو کر رہے گی کیونکہ وہ ہر دوسری تہذیب سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ وہ ترکی میں کمال اتاترک کے نقش قدم پر چلنے والی حکومت سے مطمئن نہیں تھا کیونکہ اس کے بقول یہ حکومت اسلام کے اثرات ختم کرنے میں کامیاب نہیں تھی۔

استنبول، انقرہ اور ازمیر تو کافی "مغربائے" گئے تھے اور وہاں کئی یورپی باشندے رہائش پذیر تھے لیکن باقی سارا ترکی پہلے کی طرح پسماندہ، لکیر کا فقیر اور مذہب کے دیوانوں پر مشتمل تھا۔ جب کپتان نے ترکی کے بارے میں گفتگو ختم کی تو میرے دل میں شدید خواہش اٹھی کہ میں ترکی جاؤں۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ ترکی میرے خیالوں سے کہیں زیادہ اسلامی ملک ہے۔ اب نوجوان بھارتی طالب علم نے گل افشانیاں شروع کیں: "اگر تم پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہو تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ کوئی معقول کام نہیں ہے۔ تمام مذاہب انسانوں ہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ تمام مذہب ایک جیسے ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کون سا مذہب اختیار کرتے ہیں۔ معمولی رسومات ہی کا تو فرق ہے۔ آپ کے بچپن میں آپ

Marfat.com

کے والدین آپ کو بتاتے ہیں کہ خدا ہر جگہ ہے۔ وہ عبادت کی نصیحت کرتے ہیں تا کہ آپ اچھے کام کرنا سیکھ جائیں۔ لیکن بڑے ہو کر آپ کو خدا اور عبادت کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ پھر آپ نے اچھے کام ہی کرنے ہیں۔ میرا ضمیر جب مجھے بتاتا ہے کہ یہ کام اچھا ہے تو میں اسے کر گزرتا ہوں۔ مجھے کسی منظم مذہب کی ضرورت نہیں۔" کپتان نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور بولا کہ قرآن اب فرسودہ ہو چکا اور جدید زمانے کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور کہا" میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، تمہیں اس پر اس وقت یقین آئے گا جب تم مسلم دنیا میں پہنچو گی اور ان کی جہالت، غربت، پسماندگی اور غلاظت اپنی آنکھوں سے دیکھو گی۔ تم واپس امریکہ کیوں نہیں چلی جاتی، راستے میں اسرائیل میں قیام کرنا اور وہاں کی سیر و سیاحت بھی۔"

آج صبح ساڑھے چھ بجے ہم اسکندریہ پہنچے۔ میں سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے پہلے ہی بیدار ہو گئی تھی۔ فجر کی نماز پڑھ کر میں عرشے کی طرف لپکی تا کہ دنیائے اسلام کی پہلی جھلک دیکھ سکوں۔ میرے جذبات میں کوئی ہیجان نہیں تھا۔ میں غیر معمولی طور پر پرسکون اور مطمئن تھی۔ جب سورج طلوع ہوا تو میں نے پہلی بار دنیائے اسلام کو دیکھا۔ پہلے سمندر کے پانی پر پڑتے ہوئے سایوں کے عکس، پھر جب جہاز بندرگاہ کے قریب ہوا تو کئی بادبانی اور ماہی گیری کی کشتیاں نظر آئیں۔ سفید عباؤں اور ٹوپیوں میں ملبوس ان میں سیاہ فام افراد سوار تھے۔ انہوں نے جب مجھے دیکھا تو حجاب کو دیکھ کر فوراً جان گئے کہ میں مسلمان ہوں۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلائے اور باآواز بلند پکارے" السلام علیکم۔" میں نے" وعلیکم السلام" کہہ کر جواب دیا۔ اس وقت میں نے حقیقت خوشی محسوس کی، آپ اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ سمندر کی طویل اور اندھیری رات ختم ہو چکی تھی۔

ناشتے کے بعد، سات بجے کے قریب ایک کارندے نے مجھے اسکندریہ کے قابل دید مقامات دکھانے کی پیشکش کی۔ میں شش و پنج میں تھی کہ کہیں میرے ساتھ کوئی ہاتھ ہی نہ ہو جائے لیکن کارندے نے مجھے اپنی اسناد دکھائیں جو حکومت مصر کی تصدیق یافتہ

Marfat.com

تھیں۔ کپتان نے بھی کہا کہ اس کے ساتھ جانے میں کوئی خدشہ نہیں ہے۔ پہلے تو وہ بڑی سرد مہری سے پیش آیا، بالکل رسمی انداز میں رٹے رٹائے فقرے دہراتا رہا لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ میں نومسلم ہوں اور محض دین کی خاطر امریکہ چھوڑ کر پاکستان جا رہی ہوں اور لاہور میں قیام کا ارادہ ہے اور یہ کہ میری بس یہ خواہش ہے کہ وہ مجھے کسی مسجد میں لے جائے جہاں میں نماز ادا کرسکوں، تو اس کا رویہ یک دم تبدیل ہوگیا۔ ہم نے قدیم شہر کے وسط میں جانے کے لیے ایک ٹیکسی لی وہاں جا کر اتر گئے اور پیدل گھومنے لگے۔ ماحول بالکل ویسا ہی تھا جیسا میں نے سوچ رکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے یوں لگا جیسے میں وہاں ہزاروں مرتبہ پہلے بھی آ چکی ہوں۔ عمارتوں کی حالت خستہ تھی، ایسا لگتا تھا کہ اب گریں کہ گریں۔ زیادہ تر لوگ، خاص طور پر بچے چیتھڑوں میں ملبوس تھے۔ اور حیران کن خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ زیادہ تر لوگ جن میں مرد، عورتیں اور بچے سبھی شامل تھے، اپنے دیسی عرب لباس پہنے ہوئے تھے۔ زیادہ تر بچے دبلے پتلے تھے اور کچھ لوگ یونانی کپتان کے بیان کے مطابق انتہائی گندے تھے۔ گلیاں اگرچہ کشادہ تھیں لیکن ٹوٹی پھوٹی، مرمت طلب اور تغافل کا شکار۔ اِکا دُکا ٹرک اور کاریں بھی نظر آئیں لیکن زیادہ تر سواری کا ذریعہ گھوڑے جتے ہوئے تانگے تھے۔ لش پش لکیردار عبا میں ملبوس ایک نوجوان سائیکل پر جاتا دکھائی دیا جس نے سر پر تنوری روٹیاں اٹھا رکھی تھیں۔ سیاہ گاؤن میں ملبوس کچھ عورتیں بھی نظر آئیں جنہوں نے سر پر مرغیوں کے کریٹ اٹھائے ہوئے تھے۔ ہاں! یہ بات درست ہے کہ یہاں مجھے وہ ساری غربت اور پسماندگی نظر آئی جس کا مصر کے بارے میں لکھی ہر کتاب میں بڑی نفرت سے ذکر کیا گیا تھا اور مغربی دنیا کے ہر اس فرد نے جو یہاں آیا اور مجھ سے ملا، تفصیل سے اس کا ذکر کیا۔

لیکن میں نے وہ کچھ دیکھا جو وہ نہ دیکھ سکے غربت تو تھی لیکن مایوسی نہیں تھی۔ گلیوں میں بچے ہنسی خوشی کھیل رہے تھے۔ ان کے پاس کھلونے نہیں تھے لیکن انہوں نے اپنی ذہانت اور سوجھ بوجھ سے اپنے کھیل کے سامان کر لیے تھے۔ ہاکر اپنی اشیاء کی

Marfat.com

فروخت کے لیے مترنم شعروں میں گاہکوں کو پکارتے تھے۔ دو چھوٹی بچیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہی تھیں۔ ایک نوجوان باپ کو دیکھا جس نے اپنی بیٹی کو کاندھوں پر سوار کیا ہوا تھا۔ نہیں، نہیں، یہ کوئی افسردہ منظر تھا نہ غمناک جگہ۔ لوگ خوش لگتے تھے۔ کم از کم میرا تاثر تو یہی تھا۔ وہ نرم خو تھے، مہربان، مشفق اور منکسر المزاج۔ وہاں گھومتے ہوئے مجھے ایک طرح کی اپنائیت کا احساس ہوا، جیسے میں اپنے دوستوں کے درمیان ہوں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ میں انھی میں سے ہوں۔

کوئی ایک میل چلے ہوں گے کہ میرے گائیڈ نے کہا کہ اس کی خواہش ہے کہ میں اس کے بیوی بچوں سے ملوں۔ میرے ہاں کہنے پر وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ بوسیدہ سی سیڑھیاں چڑھ کر ہم ایک دروازے پر پہنچے۔ گائیڈ نے دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی۔ اس کی بیوی نے دروازہ کھولا اور مجھے اندر لے جایا گیا۔ اس کی بیوی ایک تنگ سے باورچی خانے میں دوپہر کا کھانا بنا رہی تھی۔ فرش پر مرغیاں اور بانکے مرغے پھر رہے تھے۔ سونے کے دو کمرے تھے اور دونوں صاف ستھرے تھے۔ میں اور میرا گائیڈ صوفے پر بیٹھ گئے جبکہ اس کا بیٹا اور بیٹی فرشی نشستوں پر بیٹھے۔ انہوں نے مجھے کوکا کولا کی ایک بوتل پیش کی۔ جب میں نے بوتل ختم کر لی تو گائیڈ نے اپنے بچوں کا تعارف کروایا۔ اس کی سیاہ فام بیٹی امینہ چست و چالاک تھی، آنکھیں روشن روشن۔ اس نے گود میں اپنی چھوٹی بہن کو اٹھا رکھا تھا جو بار بار روتی تھی اور امینہ اسے پیار سے چپ کرواتی تھی۔ اس کی بیوی کافی فربہ تھی لیکن بچی انتہائی ناتواں اور کمزور۔ بیٹے کے نین نقش دلکش تھے اور اس نے صاف ستھرا لباس پہن رکھا تھا۔ والد نے اسے کچھ قرآنی آیات پڑھنے کو کہا۔ اس نے پندرہ منٹ تک قرآن کی تلاوت کی اور پھر تفسیر ابن کثیر سے کچھ پڑھ کر سنایا۔ میں حیران تھی کہ اتنی چھوٹی عمر کا بچہ اتنی عمدہ تلاوت کیسے کر سکتا ہے۔ میرے خیال میں وہ نو دس برس کا ہوگا لیکن جب میں نے اس سے عمر پوچھی تو اس نے بتایا کہ وہ چودہ برس کا ہے۔

میرا گائیڈ اور اس کا بیٹا مجھے قریبی مساجد دکھانے لے گئے۔ ہر مسجد کے ساتھ

Marfat.com

کسی بزرگ کا مزار تھا۔ میں صرف ایک بزرگ غازی عبدالقادر سے واقف تھی، وہ ایک عظیم مجاہد تھے جنہوں نے بے وسیلہ ہوتے ہوئے بھی الجیریا کی آزادی کے لیے فرانس کے خلاف زبردست جہاد کیا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری سال دمشق میں گزارے اور اس دوران میں انہوں نے بارھویں صدی کے عظیم صوفی ابن عربی کے بارے میں صوفیانہ کتابیں لکھیں۔ ابن عربی کا انتقال بھی دمشق میں ہوا تھا۔ میں مسجدوں کی کھڑکیوں سے اندر جھانکتی رہی جہاں بچے قرآن پڑھنے میں مصروف تھے۔ میں نے اپنے گائیڈ سے کہا کہ وہ مجھے کسی مدرسے میں لے چلے اور طلبہ سے ملاقات کروائے۔ جب بچوں نے یہ سنا کہ میں امریکی ہوں تو انہیں یقین ہی نہ آیا۔ اس سے پہلے انہوں نے یہ بات سنی ہی نہیں تھی کہ کسی امریکی لڑکی نے اسلام قبول کر کے کسی مسلم ملک میں رہنے کا فیصلہ کیا ہو۔

آخرکار ہم ظہر کی نماز کی ادائیگی کے لیے قدیم شہر کی جامع مسجد میں پہنچے۔ یہ ایک عام دن تھا لیکن مسجد میں پچاس کے قریب نمازی موجود تھے۔ میں واحد خاتون تھی۔ مسجد کا ماحول انتہائی پرسکون اور مقدس تھا۔ فرش پر قالین کے بجائے چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ چھت کی شہتیروں میں ہزاروں چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے اور وہ پھر سے کبھی اندر اور کبھی باہر اڑتی پھرتی تھیں۔ یہ اتنی زبردست بات ہے کہ آپ دنیا کی کسی مسجد میں بھی چلے جائیں، عبادت کا ایک ہی طریقہ ہے اور اس سے آپ کو اپنائیت اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔

نماز کے بعد ظاہر ہے، میں تجسس کا مرکز تھی۔ وہ سب میرے اردگرد اکٹھے ہو گئے جبکہ گائیڈ نے انہیں عربی میں بتایا کہ میں کون ہوں۔ ان کے سروں پر دستاریں تھیں اور انہوں نے لمبے لمبے کرتے پہن رکھے تھے۔ نوجوان اور بوڑھے سبھی یہ جاننا چاہتے تھے کہ ایک امریکی لڑکی ہوتے ہوئے میں نے مسلمان ہونا کیسے قبول کیا۔ اگر کوئی امریکی، خاص طور پر کوئی یہودی مجھ سے یہ سوال کرتا تو کسی لمبے چوڑے فلسفیانہ جواب کی توقع رکھتا اور میری دماغی حالت پر شبہ بھی کرتا لیکن وہاں میں نے بس اتنا کہا:

Marfat.com

"اللہ جب چاہتا ہے رہنمائی عطا کرتا ہے" اور وہ سمجھ گئے، بڑی اچھی طرح۔

میں نے مسجد کے کونے میں تین چار بوڑھے آدمیوں اور لڑکوں کو گہری نیند سوتے پایا۔ میں نے ان کے بارے میں کسی سے نہیں پوچھا۔ بروکلن کے اسلامک مشن کی خدیجہ فیصل نے مجھے بتایا تھا کہ جب وہ صبح کی نماز کے لیے مسجد میں جاتی تھی تو اسے اکثر پانچ چھ آدمی مسجد کی چٹائیوں پر سوتے ہوئے ملتے تھے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں کرایہ ادا نہ کرنے پر بے گھر کر دیا جاتا ہے یا پھر مسافر جن کا کوئی اور ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ اس طرح مسجد غریب لوگوں کی پناہ گاہ بھی ہے اور ایک اجتماعی خدمت بھی انجام دیتی ہے۔ امام صاحب ہمیں مسجد کے پیچھے ایک کمرے میں لے گئے جو ان کے دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ مجھے ایک پرانے صوفے پر بٹھایا گیا، گائیڈ فرشی نشست پر بیٹھا جبکہ امام صاحب ایک پرانی میز کے ساتھ ہل جل کرتی کرسی پر تشریف فرما ہوئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں اسلام کے بارے میں کوئی خاص بات پوچھنا چاہوں گی۔ میں نے کہا کہ اس وقت تو مجھے کوئی سوال سجھائی نہیں دیتا۔ میں نے پوچھا کہ وہ واشنگٹن کے اسلامک سنٹر کے ڈاکٹر محمود حب اللہ کو جانتے ہیں۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے اثبات میں جواب دیا اور بتایا کہ وہ ان کے دوست رہے ہیں۔ میں نے جب انہیں بتایا کہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے انہیں اپنی فیملی کے ساتھ رہنے کی دعوت دی ہے، تو وہ بولے" مولانا مودودی پاکستان کے بہترین مسلمانوں میں سے ایک ہیں۔ میں ابھی انہیں ایک مختصر رقعہ لکھتا ہوں۔ براہ مہربانی انہیں میرا اسلام کہیے گا اور یہ رقعہ ان تک پہنچا دیجیے گا۔" میں نے ہامی بھر لی۔

یہ بڑی عجیب بات ہے لیکن جو لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں، انہیں یہ بات عجیب محسوس نہیں ہوگی کہ اس وقت میرے احساسات کیا تھے۔ مجھے قطعاً ایسا نہیں لگتا تھا کہ میں کہیں دور نکل گئی ہوں۔ اس دن سکندریہ میں گھومتے ہوئے مجھے یوں لگا کہ یہ لوگ صحیح معنوں میں میرے اپنے لوگ ہیں۔ جہاز پر مجھ سے بار بار پوچھا جاتا تھا کہ ایک امریکن ہوتے ہوئے میں وہ لباس کیوں پہنتی ہوں جو میں نے پہن رکھا تھا۔

Marfat.com

اسکندریہ میں مجھ سے ملنے والے کسی شخص نے یہ سوال نہیں کیا۔ ہر آدمی، خاتون اور بچہ یہ بات پہلے سے جانتا تھا۔ نہیں مجھے نہیں لگتا کہ میں کہیں دور نکل آئی ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ میں اپنے گھر لوٹ آئی ہوں۔

اپنی تمام تر محبتوں کے ساتھ

مریم

Marfat.com

سوڈان سے خط

دی ہیلینک ٹارچ
دی ہیلینک لائنز لمیٹڈ
پورٹ سوڈان، سوڈان
10 جون 1962ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکرز، اپارٹمنٹ نمبر 223-C
لارچمونٹ، نیو یارک، یو۔ایس۔اے

ڈیئرَ امی اور ابو!

اسکندریہ (مصر) سے روانہ ہو کر اگلے روز ہم پورٹ سعید پہنچ گئے۔ یہ بندرگاہ ہر طرح سے مجھے مایوس کن نظر آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ پورے مشرق وسطیٰ میں بیروت کو چھوڑ کر یہ سب سے زیادہ مغربایہ شہر ہے۔ شہر کی ساری عمارتیں مغربی طرز پر تعمیر کی گئی ہیں، دکانوں پر لگے بورڈ بھی انگریزی میں تھے۔ میں لوگوں سے بھی بہت مایوس ہوئی۔ کسی نے "السلام علیکم" کہہ کر میرا استقبال نہیں کیا۔ مجھے تو یہ شک ہے کہ یہ لوگ السلام علیکم کا مطلب بھی جانتے ہیں یا نہیں۔ سکندریہ میں میں جن لوگوں سے ملی ان میں گرمجوشی تھی، رویہ دوستانہ تھا، لیکن پورٹ سعید کے لوگ سرد مہر، تند خو اور کرایے کے ٹٹو نظر آتے ہیں۔ وہ آپ میں اس وقت تک کوئی دلچسپی نہیں لیتے جب تک انہیں یقین نہ ہو جائے کہ وہ آپ کو بے وقوف بنا کر آپ سے کچھ نہ کچھ ہتھیا لیں گے۔ جہاز پر ایسے خوانچہ فروشوں کی بھرمار تھی جو انتہائی فضول چیزیں لیے پھر رہے تھے۔ اسکندریہ کے لوگ اتنے کشادہ دل تھے کہ ضرورت پڑے تو وہ اپنی قمیص اتار کر آپ کو دے دیں۔

Marfat.com

لیکن یہاں کے لوگ ایسے شاطر تھے کہ ان کا بس چلے تو آپ کی ہر چیز چوری کر لیں۔ پورٹ سعید میں، میں نے کسی مصری کو اپنے قومی لباس میں نہیں دیکھا۔ سبھی نے مغربی لباس پہن رکھے تھے اور سروں پر چھجے دار ہیٹ سجائے ہوئے تھے۔ ہر کوئی انگریزی اور فرانسیسی بول سکتا تھا۔ بندرگاہ میں اور بھی بہت سے جہاز تھے۔ ہمارے بالکل ساتھ روس کا ایک بڑا مال بردار جہاز کھڑا تھا۔ اردگرد مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ملکوں کے اور جہاز بھی تھے۔ مجھے پورٹ سعید کا ماحول ایک آنکھ نہیں بھایا اور میری خواہش تھی کہ میں جلد از جلد وہاں سے نکل جاؤں۔ مولانا مودودی نے اپنے ایک خط میں ایسے ہی نہیں لکھا تھا کہ بیروت اور پورٹ سعید "مغرب کی لیٹرین" ہیں۔ خوش قسمتی سے وہاں ہمارا قیام صرف ایک دن کا تھا۔

نہر سویز سے گزرنے میں ہمیں مزید دو دن لگے۔ اس بارے میں میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں کیونکہ اردگرد کے مناظر انتہائی بیزار کن اور غیر دلچسپ تھے۔ ویسے بھی ہم نہر سویز سے رات کے وقت گزرے۔ دیکھنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ جہاز کو نہر سویز سے گزار کر بحر احمر تک پہنچانے کے لیے ایک مصری پائلٹ ہمارے جہاز پر آیا۔ اس کی ساری تعلیم و تربیت انگلینڈ میں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے اس کا حلیہ اور سوچ بھی مغربی تھی۔ اس نے پوچھا کہ میں نے وہ لباس کیوں پہنا ہوا ہے، جو پہن رکھا تھا جبکہ مصر کی کئی نوجوان لڑکیوں نے بال کٹوائے ہوئے تھے اور انہوں نے مختصر، چست اسکرٹ اور اونچی ایڑیوں والے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ میں نے جب اسے بتایا کہ ایک سال پہلے میں مسلمان ہوگئی تھی تو اس نے پوچھا کہ میں نماز پڑھتی ہوں؟ اسے تو میں نے نرمی سے اثبات میں جواب دے دیا لیکن اندر سے میں غصے سے کھول اٹھی۔ اس سے زیادہ احمقانہ سوال اور کیا ہوسکتا تھا؟ میں بھلا ایسا مذہب کیوں اختیار کرتی جس پر میں نے عمل ہی نہیں کرنا تھا۔ لوگ کس حماقت تک اتر سکتے ہیں؟ اور آپ ان کا کر کیا سکتے ہیں؟

پرسوں، غروب آفتاب سے تھوڑی دیر پہلے ہم سوڈان کی بندرگاہ پہنچے۔ مجھے یہاں پہنچنے کی جلدی تھی اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کر رہی تھی کہ یہ کہیں پورٹ سعید جیسی ہی

Marfat.com

نہ ہو۔ جہاز کے لنگر انداز ہوتے ہی برطانوی وردیوں میں ملبوس دو کسٹم آفیسر ہمارے جہاز پر آئے۔ وہ سیاہ فام تھے اور ان کے چہروں پر ان کے قبائلی نشان کھدے ہوئے تھے۔ میرا کسی گستاخی یا طنز کا ارادہ نہیں تھا لیکن غیر شعوری طور پر میں ان کو گھور رہی تھی۔ ان میں سے ایک تیزی سے میری طرف پلٹا اور انتہائی غصے میں بولا، "تم نے اس سے پہلے کبھی کوئی سیاہ فام شخص نہیں دیکھا؟" میں بوکھلا گئی، کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے مجھے چھرا گھونپ دیا ہو۔ اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ میں مسلمان ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے گھورتے ہوئے میں نے مسلمانوں کا سا کام تو نہیں کیا تھا۔ اس کے نزدیک جو بات اہم تھی وہ یہ کہ میں سفید فام تھی اور وہ سیاہ فام۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس نے نسلی اور متعصب برطانوی لوگوں کے ہاتھوں کتنی ذلت برداشت کی ہوگی۔ اب جب کہ سوڈان آزاد ہو گیا تھا تو وہ مجھ سے ان ذلتوں کا بدلہ لے رہا تھا۔

کل جمعہ تھا اور میرا مصمم ارادہ تھا کہ میں ساحل پر جا کر کسی قریبی مسجد میں جمعے کی نماز ادا کروں۔ پورٹ سوڈان ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور مجھے مسجد ڈھونڈنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے وضو کیا، جوتے اتارے اور ننگے پاؤں مسجد میں داخل ہوگئی۔ نماز میں ابھی تین گھنٹے باقی تھے لیکن مسجد میں کافی لوگ موجود تھے۔ کچھ تو سوئے پڑے تھے، دوسرے قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ میں اوپر کی منزل میں بالکنی پر چلی گئی۔ میرا خیال تھا کہ یہ جگہ خواتین کے لیے مخصوص ہوگی لیکن نماز شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے ایک باوقار سا شخص میرے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ مجھے وہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس نے باہر کی طرف میری رہنمائی کی اور ایک جگہ پر چٹائیوں پر بٹھا دیا۔ یہ مسجد کافی وسیع و عریض تھی لیکن نماز کے وقت اتنے لوگ جمع ہوگئے کہ ان میں بمشکل آدھے مسجد کے اندر سما سکے۔ باقی لوگوں نے مسجد کے اردگرد گلیوں میں بچھی چٹائیوں پر صفیں بنائیں۔ صرف اس ایک مسجد میں نمازیوں کی تعداد کم ازکم دو ہزار ہوگی۔ پورٹ سوڈان ایک چھوٹا سا قصبہ ہے لیکن یہاں پندرہ مسجدیں ہیں۔

Marfat.com

پورٹ سعید کے برعکس یہاں ہر شخص نے لمبا گاؤن پہنا ہوا تھا اور سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی۔ مغربی لباس مفقود ہے اور جو مغربی لباس پہنتا ہے اسے مسجدوں میں آنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہاں زیادہ تر لوگ سفید لباس پہنتے ہیں جو ان کی سیاہ جلد پر بھلا لگتا ہے۔ میرے ساتھ ایک منحنی سی بوڑھی خاتون تھی، جس کے دانت بھی نہیں تھے۔ وہ کم از کم نوے برس کی ہوگی۔ اتنے سیکڑوں نمازیوں میں ہم دو ہی خواتین نمازی تھیں۔

نماز کے بعد میں نے امام صاحب سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے پتہ تھا کہ اس کے لیے مجھے خود ہی کوشش کرنا ہوگی کیونکہ کسی کو انگریزی نہیں آتی تھی۔ لوگ ابھی مسجد سے نکل رہے تھے جب راستہ بناتی ہوئی میں اندر داخل ہوگئی۔ ابھی تک کافی لوگ مسجد کے اندر ہی تھے اور ایک پُرجوش مقرر کی تقریر سن رہے تھے۔ مجھے کوئی لفظ پلے نہیں پڑا لیکن مقرر آدھے گھنٹے تک شعلہ فشانی کرتا رہا۔ بالآخر مجھے ایک حبشن خاتون مل گئی جو تھوڑی بہت انگریزی بول سکتی تھی۔ میں نے امام صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ریتلے صحن کے پار لے گئی جہاں لکڑیوں کی ایک کھپریل بنی ہوئی تھی۔ اندر جا کر دیکھا تو چار پانچ کشادہ کمرے تھے۔ صحن میں دو بوڑھی ایک درمیانی عمر کی خاتون اور کئی نوجوان لڑکیاں چارپائیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بڑے دوستانہ انداز میں مجھے السلام علیکم کہا لیکن زبان کی مجبوری کی وجہ سے زیادہ گفتگو نہیں ہوسکی۔ تاہم اشاروں کنایوں سے میں نے یہ بات بتادی کہ میں ایک مسافر ہوں، جہاز پر آئی ہوں اور پاکستان جا رہی ہوں اور یہ کہ میں امریکی نومسلم ہوں۔ اس پر ایک خاتون اٹھی، گھر کے اندر گئی اور تھوڑی دیر بعد ایک گڑوی میں ٹھنڈا، میٹھا شربت لے آئی۔ پہلے تو میں جھجکی کہ پتہ نہیں پانی کیسا ہوگا لیکن گڑوی اور گلاس بڑی صفائی سے چمکائے گئے تھے اور مجھے پیاس بھی لگ رہی تھی۔ میں سارا شربت پی گئی۔ وہ سب لڑکیاں اپنی روشن اور مسکراتی آنکھوں کے ساتھ مجھے دیکھے جا رہی تھیں اور میرے بارے میں کچھ جاننا چاہتی تھیں لیکن زبان کا مسئلہ تھا، میں انہیں کیا بتاتی۔ وہ سب سیاہ فام تھیں لیکن ان کے نین نقش تیکھے تھے۔ بوڑھی خواتین کے چہروں پر قبائلی نشانات کھدے ہوئے

Marfat.com

تھے۔ ان کا لباس بھارتی ساڑھیوں سے ملتا جلتا تھا۔ جب ہماری گفتگو آگے نہ بڑھ سکی تو انہوں نے آپس میں بات چیت شروع کر دی۔ ان کے چہرے گول تھے اور ان سے خوشی ٹپکتی تھی، ہنستی بہت زیادہ تھیں۔ سبھی میں مزاح کی لطیف حس موجود تھی۔ پھر میرے اردگرد بچے جمع ہونے لگے۔ ان میں دو جڑواں بھائی بھی تھے۔ وہ سب کسی مقامی سکول میں پڑھتے تھے اور مجھے اپنی کتابیں اور کاپیاں دکھانے کے لیے بے تاب تھے۔

اچانک مجھے ایک پریشان کن صورت حال کا سامنا ہوا۔ مجھے ٹائلٹ جانے کی سخت حاجت محسوس ہوئی لیکن سمجھ نہ آئے کہ ٹائلٹ کہاں ہے اور پوچھوں تو کیونکر؟ میں نے اشاروں میں سمجھانے کی کوشش کی، انہیں سمجھ میں آیا یا نہیں لیکن جوان لڑکیاں میرے اشاروں کنایوں سے بہت لطف اندوز ہوئیں۔ میں نے اٹھ کر گھر کے اندر چاروں طرف چکر لگائے لیکن ہارے ہماری قسمت۔ گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ آخر جب میں بالکل مایوس ہوگئی تو صحن میں مجھے ایک دروازہ نظر آیا۔ کھولا تو ٹائلٹ نکلا، لیکن ذرا مختلف قسم کا۔ اس میں کنکریٹ کے پائیدان تھے اور درمیان میں ایک سوراخ تھا۔ اس پر اکڑوں بیٹھنا پڑتا ہے اور اس کے لیے کافی مہارت چاہیے۔

میری پریشانی رفع ہوئی تو گھر کی خواتین نے مجھے بتایا کہ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ سفید لبادے میں ملبوس ایک بوڑھا شخص اندر آیا۔ ایک بوڑھی خاتون نے اسے کھانا اور پانی پیش کیا۔ سب لوگ مؤدب ہو کر اس کے اردگرد بیٹھے رہے اور اس سے دھیمی آواز میں گفتگو کرتے رہے لیکن کوئی کھانے میں شریک نہیں ہوا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ دونوں بوڑھی خواتین اس کی بیویاں ہیں۔ باقی لڑکیاں باورچی خانے میں مصروف تھیں جو انتہائی نفیس تو نہیں تھا لیکن کافی حد تک صاف ستھرا تھا۔ بالآخر دو لڑکیاں کھانے کی ٹرے اٹھائے ہوئے باہر آئیں، اس میں عربی انداز میں پکائی گئی روٹیاں تھیں، مچھلی، دنبے کا گوشت، چاول اور سبزیاں۔ ایک لڑکی ایک دری لائی اور اس نے صحن میں بچھا دی۔ اس پر کھانا رکھا گیا اور ہم سب اس کے اردگرد بیٹھ گئے۔ سب لوگ ایک ہی تھال میں ہاتھوں سے کھانا کھا رہے تھے۔ مجھے بڑا لطف آیا۔ مغربی طریقے کی

Marfat.com

نسبت یہ طریقہ زیادہ دوستانہ ہے۔ کھانا بھی مزیدار تھا اور رفاقت بھی۔ کھانے کے بعد ایک بچہ آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کمروں میں لے گیا۔ فرنیچر زیادہ نہیں تھا۔ ہر کمرے میں چارپائیاں بچھی تھیں۔ کہیں کہیں کوئی میز اور درازوں والی تپائیاں بھی نظر آئیں۔ ہر چیز انتہائی صاف ستھری تھی۔ ہم پچھلے کمرے میں پہنچے تو تین آدمی چارپائیوں پر لیٹے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ ایک کوئی بیس سال کا جوان تھا، دوسرے دو بوڑھے تھے۔ اس نوجوان کو انگریزی آتی تھی۔ میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا۔ اس نے ترجمہ کر کے باقی لوگوں کو بتایا۔ ہم گفتگو میں مصروف تھے کہ قریبی مسجد سے عصر کی اذان سنائی دی۔ سب مرد باہر چلے گئے اور مجھے دعوت دے گئے کہ میں ان کے ساتھ شریک ہو سکتی ہوں۔ عصر کی نماز میں سو کے لگ بھگ لوگ ہوں گے۔ میں واحد خاتون تھی۔ نماز کے بعد میں نے بتایا کہ غروب آفتاب سے پہلے پہلے مجھے اپنے جہاز پر پہنچنا ہے۔ نوجوان نے مجھے بتایا کہ میں کسی بھی وقت دوبارہ ان کے گھر آ سکتی ہوں۔ اس نے مجھے پیش کش کی کہ وہ قصبے کے دوسرے خاندانوں میں بھی مجھے متعارف کروا دے گا تا کہ میں ان کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو سکوں۔

جہاز کی طرف واپسی کے سفر میں، میں نے دیکھا کہ ہر طرف لوگ نماز میں مصروف تھے۔ دکانوں پر، گلیوں میں، پٹرول سٹیشنوں پر۔ اس منظر نے میرا دل خوشی سے بھر دیا۔ یہ منظر کسی مسلم ملک میں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

اس جہاز سے مال اتارنے والے سوڈانی کارندے ناقابل یقین حد تک سخت جان ہیں۔ صبح ساڑھے چار بجے وہ جہاز پر پہنچ جاتے ہیں، چھ بجے کام شروع کرتے ہیں۔ ہم نے یہاں آٹھ لاکھ ٹن سے زیادہ آٹے کی بوریاں اتارنی ہیں۔ اس میں خاصا وقت لگے گا اور امکان ہے کہ ہم ایک ہفتہ یہیں رکے رہیں۔ نیویارک سے روانگی کے وقت جہاز ران کمپنی نے مجھے بتایا تھا کہ نیویارک سے کراچی تک تین ہفتے لگیں گے۔ تین ہفتے تو گزر چکے ہیں اور مجھے بتایا گیا کہ شاید مجھے پورا مہینہ جہاز ہی پر رہنا پڑے گا۔ مولانا مودودی جولائی میں افریقہ کے دورے پر جا رہے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ

Marfat.com

پاکستان پہنچنے پر میری ان سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ مگر ان کا پروگرام تبدیل ہو جائے تو الگ بات ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا، یہ سوڈانی مزدور کتنے سخت جان ہیں۔ جہاز کا یونانی عملہ مزے میں ہے۔ گھنٹوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں اور سوڈانی مزدور جھلستی دھوپ میں کام میں جتے رہتے ہیں۔ آٹے کی بوری کا وزن ایک سو پونڈ ہوتا ہے اور یہ مزدور بارہ گھنٹے تک یہ بوریاں ڈھوتے رہتے ہیں اور انہیں روزانہ جو مزدوری ملتی ہے وہ ایک ڈالر کے برابر بھی نہیں ہوتی۔ مجھے ان کی توانائیوں پر حیرت ہوتی ہے۔ بارہ گھنٹے سو سو پونڈ کی بوریاں ڈھونے کے بعد بھی ان میں اتنی ہمت اور قوت ہوتی ہے کہ وہ شام کو گانے گاتے ہیں اور رقص کرتے ہیں۔ سوڈانی مسلمان مزدوروں کے علاوہ جہاز پر جنوبی سوڈان کے قبیلوں کے غیر مسلم مزدور بھی کام کرتے ہیں۔ وہ بھی بڑے تنومند اور مضبوط جسم کے مالک ہیں۔ مسلمان مزدوروں نے تو پورا لباس پہنا ہوتا ہے اور ان کے جسم سر سے پاؤں تک ڈھکے ہوتے ہیں لیکن یہ قبائلی مزدور صرف ایک لنگوٹی کس کر ننگے جسم کام کرتے ہیں۔ ان کی سیاہ جلد آٹے سے سفید ہو جاتی ہے۔ وہ کافی صحت مند ہیں، کام کرتے ہوئے تھکتے نہیں اور کام کرتے ہوئے مترنم انداز میں نعرے لگاتے رہتے ہیں

کل شام میں جہاز کے اوپر والے عرشے پر جا کر مزدوروں کو کام کرتے دیکھنے لگی۔ سورج غروب ہوتے ہی انہوں نے نماز کی ادائیگی کے لیے کام روک دیا۔ کچھ لوگ ٹریکٹروں پر کام کر رہے تھے اور ان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ جماعت میں شامل ہو سکیں۔ پتہ ہے انہوں نے کیا کیا؟ ٹریکٹر پر اتنی جگہ تھی جو ایک آدمی کے لیے کافی ہو۔ انہوں نے وہیں کوئی صاف کاغذ، بوری، تھیلا، جو کچھ بھی میسر آیا، بچھایا اور وہیں نماز پڑھنے لگے۔ آپ تصور نہیں کر سکتے یہ کتنا خوبصورت منظر تھا۔ پورے گھاٹ اور جہاز کے عرشوں پر ایک ہی سماں تھا۔ ہر طرف سوڈانی مسلمان نماز پڑھ رہے تھے۔

میں نے جس بھارتی طالب علم کا پہلے ذکر کیا، وہ بس دیکھنے میں بھارتی لگتا ہے۔ لیکن اس کا حلیہ اور اس کی سوچ اتنی مغرب زدہ ہے کہ میرے خیال میں وہ اپنے آبائی

Marfat.com

شہر بمبئی کے بجائے امریکہ میں زیادہ سہولت محسوس کرے گا۔ وہ اپنی مادری زبان میراٹھی کے بجائے انگریزی بولنے کو ترجیح دیتا ہے۔ اس نے بتایا کہ بھارت میں کامیابی کے لیے انگریزی جاننا ضروری ہے۔ 1857ء کی جنگ سے پہلے ہی اس کے آباواجداد نے انگریزی تعلیم حاصل کر لی، اگرچہ سیاسی سطح پر وہ امریکہ کے اس رویے سے نالاں ہے جو اس نے بھارت کے لیے اختیار کر رکھا ہے لیکن ان کے طرز زندگی سے اسے اتنی محبت ہے کہ میں ان پر ذراسی تنقید بھی کروں تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔

پورے جہاز پر بس ایک میں ہوں جو پورٹ سوڈان میں ہونے پر خوش ہوں۔ جہاز کا عملہ گرمی سے شاکی ہے۔ وہ سوڈانیوں کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں کہ کتنے گندے لوگ ہیں۔ عملے کے لوگ اور بھارتی طالب علم سوڈانیوں سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ انہیں انسان بھی سمجھتے ہیں یا نہیں۔ جہاں تک میرا حال ہے تو مجھے اسکندریہ تو اچھا لگا ہی تھا، پورٹ سوڈان اس سے بھی زیادہ اچھا لگا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں قومی تعصب کی وہ دیوانگی نہیں پائی جاتی جس نے پورے مصر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اسکندریہ میں، میں جہاں بھی گئی، لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ میرا صدر جمال عبدالناصر کے بارے میں کیا خیال ہے۔ ان کے پوچھنے کا انداز ہی ایسا تھا جیسے میں کہوں کہ ہاں میں اسے پسند کرتی ہوں۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔ مصر کی جیلیں سیاسی قیدیوں سے بھری ہوئی ہیں! یہاں ایسی کوئی بات نہیں۔ مصر کی نسبت یہاں نقل و حرکت کی بھی زیادہ آزادی ہے۔ اسکندریہ میں جہاز چھوڑتے ہوئے مجھے اپنا پاسپورٹ ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔ شہر جاتے ہوئے کئی جگہوں پر بندوق بردار سپاہی راستہ پر روکتے تھے اور میرے کاغذات کا معائنہ کرتے تھے۔ یہاں پورٹ سوڈان میں مَیں جب چاہوں، جہاں چاہوں جا سکتی ہوں، کوئی روک ٹوک نہیں۔ ہاں میں یہاں پورٹ سوڈان میں بہت خوش ہوں۔ مجھے مولانا مودودی سے ملنا نہ ہوتا تو میں یہیں رہ جاتی۔ بھلے سے جہاز میرے بغیر چلا جاتا۔

میری ساری محبتیں آپ کے لیے

مریم

Marfat.com

جدہ سے خط

دی ہیلینک ٹارچ
دی ہیلینک لائنز، لمیٹڈ
جدہ، سعودی عرب
20 جون 1962ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکڑز، اپارٹمنٹ نمبر 223-C
لارچمونٹ، نیویارک، یو۔ ایس۔ اے

ڈیئر امی اور ابو!

میں نے جو خط پورٹ سوڈان پولیس کے کمانڈنٹ کو لکھا تھا، آپ اس کی نقل وصول کر کے یقیناً پریشان ہوئے ہوں گے لیکن آپ کو یہ جان کر تسلی ہوگی کہ یہ خط لکھنے سے مجھے وہ اضافی تحفظ حاصل ہو گیا جس کی مجھے اشد ضرورت تھی۔ میں مطمئن ہوں کہ میں نے پورٹ سوڈان پولیس سے رابطہ کر کے اچھا کیا کیونکہ اس کے بعد سے جہاز کے چیف آفیسر یا کپتان نے مجھے بالکل تنگ نہیں کیا۔ وہ مجھ سے الگ رہتے ہیں، میں ان سے۔ میں زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی ہوں، باورچی میرا کھانا یہیں کمرے میں دے جاتا ہے۔

کچھ رات پہلے کی بات ہے، کپتان اور چیف آفیسر بھارتی طالب علم سے بات کر رہے تھے۔ گفتگو کے دوران میں یونانی کپتان نے کہا کہ اشد ضرورت کے وقت اسے جھوٹ بولنا پڑے، چوری کرنی پڑے یا کسی کو قتل بھی کرنا پڑے تو وہ عار محسوس نہیں کرے گا، بشرطیکہ وہ پکڑا نہ جائے۔ اسلام اور مسلمانوں کے لیے ان کے دلوں میں کوئی

Marfat.com

جگہ نہیں تھی بلکہ وہ ان سے نفرت کرتے تھے، میرے حجاب کا مذاق اڑاتے تھے۔ ایک دن کپتان اتنی بدتمیزی پر اتر آیا کہ اس نے مجھے کپڑے اتارنے کو کہا۔ بولا، "میں ننگی عورتیں پسند کرتا ہوں"۔ میں جہاز پر اکیلی عورت تھی اور اس کی اس حرکت سے سخت خوفزدہ۔ مجھے پولیس کے پاس جانا ہی تھا۔ وہ سفر کے دوران میری عزت لوٹ کر مجھے سمندر میں پھینک سکتے تھے۔ مجھے تب احساس ہوا کہ اسلام قریبی رشتہ داروں کی معیت کے بغیر، عورت کو اکیلے سفر کرنے سے کیوں منع کرتا ہے۔ اگرچہ حالات ایسے تھے کہ اس وقت میں اس قانون کی پابندی نہیں کرسکی لیکن جہاز کے تجربات نے مجھے شریعت کے احکامات کی دانائی اور گہرائی کا گرویدہ بنا دیا۔

میں جب پولیس سٹیشن گئی تو مجھے پورٹ سوڈان کی جیل دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا، زیادہ تر مجرم یونان کے گنوار اور اجڈ نوجوان تھے جو چوری، شراب نوشی اور نقص امن کے جرائم میں ملوث پائے گئے تھے۔ ان میں سوڈان کا کوئی باشندہ نہیں تھا۔ جہاز کی طرف واپس آتے ہوئے میں اس بات پر بڑی حیران ہوئی کہ گلیوں میں کہیں کوئی عورت نظر نہیں آئی۔ چند چھوٹی بچیاں نظر آئیں یا ایک بوڑھی عورت اور وہ بھی سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی تھی۔ زیادہ تر سوڈانی عورتیں سخت پردے میں گھروں کے اندر ہی رہتی ہیں۔

ہم آٹھ دن پورٹ سوڈان میں رہے اور میں اس قیام کے ایک ایک لمحے سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ وہاں کے لوگ مجھے بہت اچھے لگے اور انہوں نے مجھ سے مشفقانہ رویہ اختیار کیا۔ منگل کو میں دوبارہ اس فیملی کو ملنے گئی جو جامع مسجد کے قریب رہتی ہے۔ وہ امام صاحب کے گھر والے تھے۔ اس دن میری امام صاحب سے بھی ملاقات ہوگئی، لیکن زیادہ گفتگو نہیں ہوسکی۔ انہیں انگریزی بالکل نہیں آتی تھی۔ پورٹ سوڈان میں قیام کے دوران میں مَیں نے بارہ تیرہ لفظ عربی کے سیکھ لیے تھے۔ ان لفظوں اور انگریزی کے کچھ لفظوں کو ملا جلا کر اشاروں کنایوں سے اپنا مدعا بیان کر ہی لیتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں کچھ مہینے وہاں رہ جاتی تو عربی بول سکتی تھی۔ زبان کی

Marfat.com

مجبوری کی وجہ سے بات چیت نہ ہوسکے تو بڑی بیزاری محسوس ہوتی ہے۔ امام صاحب کے شرارتی بچوں کے لیے میرا اشاروں اور ٹوٹی پھوٹی زبان میں بات کرنا لطف کا باعث بنا، وہ کھلکھلا کر ہنستے تھے۔ میں انگریزی کا کوئی لفظ بولتی تو وہ اسے سمجھے بغیر آسانی سے دہرا دیتے تھے اور اجنبی تلفظ پر ہنستے تھے۔ اس دن امام صاحب کی بیوی نے جو کھانا مجھے پیش کیا، بالکل سادہ تھا جسے میں دیکھ کر حیران ہوئی۔ پچھلی دفعہ کے کھانے سے میرا تاثر یہ تھا کہ وہ ایسے ہی لذیذ کھانے کھاتے ہیں لیکن پھر پتہ چلا کہ گوشت اور مچھلی وہ ہفتے میں صرف ایک دن پکاتے ہیں۔ عام طور پر وہ چٹنی روٹی پر گزارہ کرتے ہیں۔ بہت ہوا تو روٹیوں پر زیتون کا تیل چپڑ لیتے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ بھی پیش کیا، میں نے شوق سے کھایا، جی بھر کر پانی پیا اور میری طبیعت ذرا بھر بھی خراب نہیں ہوئی۔

جہاز پر ہوتی تھی تو مسلسل سوڈانی مزدوروں کو کام کرتے دیکھتی رہتی تھی جو صبح چھ بجے سے رات دس بجے تک مسلسل کام کرتے تھے۔ میں کبھی اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوئی۔ ان مزدوروں میں پہاڑیے اور اندرون ملک کے صحرائی باشندے بھی تھے۔ یہ تھے تو دبلے پتلے لیکن انتہائی سخت جان۔ وہ بس نام کو کپڑے پہنتے تھے۔ مختصر سی دھوتی یا لنگوٹی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب گری کہ گری۔ ان کے سروں کے بال گھنگریالے اور چھجا نما تھے جن میں کئی طرح کی مخلوق بستی تھی۔ ہر شخص کے پاس لکڑی کا ایک کنگھا ہوتا تھا۔ جب جوئیں زیادہ تنگ کرتیں تو اس کنگھے سے سر میں خارش کر لیتے۔ جہاز کا یونانی عملہ ان سے سخت نفرت کرتا تھا۔ ایک رات آٹھ بجے کے قریب ایک مزدور چیف آفیسر کے پاس آیا اور بتایا کہ وہ زخمی ہو گیا ہے۔ اس نے اپنا پاؤں دکھایا جس سے خون بہ رہا تھا۔ چیف آفیسر نے روئی الکوحل میں بھگو کر اس کے زخموں پر لگائی اور بڑی رعونت سے اسے حکم دیا کہ واپس کام پر جائے۔ اس کے پاس ابتدائی طبی امداد کا وافر سامان موجود تھا لیکن اس نے پٹی کرنے سے انکار کر دیا۔ بے چارے مزدور کے پاس جوتے تک نہیں تھے جو اسے گندگی اور کنکروں سے بچاتے۔ اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ بے بسی کی تصویر بنا بیٹھا رہا۔ چیف آفیسر نے اس پر اسے سخت ڈانٹ پلائی۔ میری سمجھ میں

Marfat.com

نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ بالآخر کچن میں مجھے صاف کپڑے کا ایک ٹکڑا مل گیا۔ میں نے اسے پھاڑ کر اس کی پٹیاں بنائیں اور مزدور کو دیں جس نے بڑی مہارت سے انہیں اپنے زخم پر لپیٹ لیا اور لنگڑاتا ہوا اپنے کام پر چلا گیا۔ یونانی عملے کا ایک آدمی میرے پاس آیا اور بولا "تمہیں ان پر افسوس نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہیں۔ وہ کوئی زخمی وخمی نہیں ہوا تھا، بن رہا تھا تاکہ اسے کام نہ کرنا پڑے۔ یہ سب اسی طرح کے ہیں سست اور کاہل۔" میں خاموش رہی کیونکہ میں کوئی جھگڑا مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سخت محنتی تھے اور ان کی محنت و مشقت کا اندازہ انہیں دیکھے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ 120 ڈگری فارن ہائٹ کی جھلستی ہوئی گرمی میں سوسو پاؤنڈ کی بوریاں ڈھونا آسان کام نہیں اور اس کا معاوضہ انہیں کیا ملتا تھا؟ بمشکل چھ شلنگ روزانہ۔ اپنی مشقت کا بوجھ بٹانے کے لیے وہ مترنم نعرے لگاتے رہتے تھے۔ ایک دن میں نے ان کے ایک نگران سے پوچھا کہ وہ کیا گاتے رہتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ بار بار اس طرح کے فقرے بولتے ہیں، "اللہ بڑا ہے، ہم اس پر راضی ہیں، ہم اس پر خوش ہیں۔" میں نے پسینے میں شرابور ان کے جسموں کو دیکھا۔ انہیں کوئی شکایت تھی نہ گلہ۔ خوش خوش اپنے کام میں مگن رہتے۔ میں نے اللہ سے دعا کی کہ وہ انہیں جنت میں بہترین درجات عطا فرمائے۔

آٹھ دنوں کے اختتام پر ہر سیاہ فام مزدور مجھے نام سے جانتا تھا۔ پولیس والے بڑے مددگار ثابت ہوئے۔ انہوں نے میری شکایت بڑے غور سے سنی اور وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ پانچ دن پہلے جب چار بجے ہمارا جہاز گھاٹ سے روانہ ہوا تو درجنوں مزدور، پانچ چھ پولیس کے اہلکار اور تین چار مزدوروں کے نگران مجھے الوداع کہنے کے لیے جمع تھے۔ وہ بھرپور مسکراہٹوں کے ساتھ ہاتھ ہلاتے رہے جب تک جہاز ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگیا۔

اگرچہ ہم دوسرے دن ہی سعودی عرب کی بندرگاہ جدہ پہنچ گئے تھے لیکن بندرگاہ کی گودی حاجیوں کے جہازوں کی وجہ سے اتنی پرہجوم تھی کہ ہمیں دو دن بندرگاہ کے باہر

Marfat.com

ہی لنگر انداز رہنا پڑا۔ بحر احمر میں داخل ہونے کے بعد ہی سے موسم سخت گرم ہو گیا تھا لیکن فضا میں نمی نہیں تھی اور حبس نہ ہونے کی وجہ سے میرے لیے قابل برداشت تھا۔ سعودی عرب بھی چونکہ خشک اور بنجر ملک ہے اس لیے مجھے امید تھی کہ یہاں بھی موسم ایسا ہی رہے گا۔ لیکن مجھے سخت کوفت ہوئی جب دیکھا کہ فضا میں نمی کا تناسب زیادہ تھا۔ سخت حبس کا عالم، آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے لیکن بارش نہیں ہوتی تھی۔ دن کے وقت درجہ حرارت 100 ڈگری فارن ہائٹ سے بھی بڑھ جاتا اور نمی کا تناسب بھی تقریباً اتنا ہی ہوتا۔ مجھے گرمی اتنی تنگ نہیں کرتی جتنا پسینہ، جو نہ خشک ہوتا ہے نہ رکتا ہے اور اس سے جلد پر خارش ہوتی رہتی ہے۔

ہم پچھلے دو دنوں سے یہاں سامان اتار رہے ہیں اور امکان ہے کہ آج سہ پہر کے وقت ہم صومالی لینڈ کی بندرگاہ جبوتی کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ یہاں قیام کے دوران میں میں نے کوشش کی کہ مجھے ساحل پر جانے کی اجازت مل جائے تاکہ میں جدہ دیکھ سکوں لیکن اس کے باوجود کہ مولانا مودودی یہاں کے بادشاہ کے ذاتی دوست ہیں، مجھے جہاز سے اترنے کی اجازت نہیں مل سکی۔ تاہم ان کوششوں کے دوران میں خوش قسمتی سے میری بھارت کے ایک مسلمان سے ملاقات ہو گئی جو ہماری جہاز ران کمپنی کے ساتھ کاروبار کرتا ہے۔ وہ گزشتہ تیرہ برس سے سعودی عرب میں مقیم ہے اور اسے یہاں کی شہریت بھی ملی ہوئی ہے۔ اس کا رویہ میرے ساتھ بڑا ہی مشفقانہ تھا۔ وہ فرفر انگریزی بولتا ہے۔ اس سے ملاقات ہوئی تو بڑی خوشی ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ سعودی عرب میں بہت خوش ہے۔ اس نے اپنی فیملی کو بھی بلوانے کی بڑی کوشش کی لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے بتایا کہ بھارت میں مسلمان بڑی کسمپرسی کی حالت میں ہیں اور نہرو حکومت نے ان کی حالت زار بہتر بنانے کے لیے کچھ کام نہیں کیا۔ گزشتہ سال جب وہ اپنے والدین سے ملنے گیا تو وہ سخت خوف زدہ تھے اور انہیں اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ دو سال پہلے سعودی حکومت نے ایک قانون نافذ کیا ہے جس کی رو سے غیر سعودی مسلمانوں کو سعودی عرب

Marfat.com

میں مستقل قیام کی اجازت نہیں ہے۔ مسلمان کہیں کے بھی ہوں، ویزہ کے بغیر اور یہ ضمانت دیے بغیر کہ وہ ایک خاص مدت میں واپس لوٹ جائیں گے، سعودی عرب میں نہیں آسکتے۔ انہیں خدشہ ہے کہ انہیں سعودی عرب پسند آجائے اور وہ یہیں کے ہوکر نہ رہ جائیں۔ اس بھارتی مسلمان نے بتایا کہ گزشتہ دس برسوں میں اسلامی ممالک سے آنے والے ہزاروں حاجی واپس نہیں گئے۔ انہوں نے اپنی باقی ماندہ زندگی یہیں مکے یا مدینے میں گزارنے کا فیصلہ کیا اور اب یہ دونوں مقدس شہر بھارت، پاکستان، انڈونیشیا، ملائشیا اور افریقی ممالک کے باشندوں سے بھرے پڑے ہیں۔ مزید افراد کی گنجائش نہیں۔

اگرچہ میں جدہ دیکھنے تو نہیں جا سکی لیکن جہاز کے عرشے سے سعودی اہلکاروں کا بغور مشاہدہ کرتی رہتی ہوں۔ پولیس کے اہلکار اور کسٹم کے لوگ چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں اور جہاز سے اترنے والے پل پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔ تمام پابندیوں کے باوجود میرا ان سے خوشگوار رابطہ ہوگیا ہے۔ ہمارے جہاز پر کام کرنے والوں میں سے کوئی بھی سعودی مزدور نہیں ہے۔ سبھی مزدور سوڈان کے ہیں یا بھارت کے۔ کچھ یمنی بھی ہیں جو سروں پر عجیب طرح کی پگڑیاں باندھتے ہیں۔ صبح چار بجے ہی جہاز پر چہل پہل شروع ہوجاتی ہے۔ چھ بجے کام شروع ہوتا ہے اور شام پانچ بجے تک جاری رہتا ہے۔ پورٹ سوڈان کے قبائلی حبشیوں کے برعکس جو بڑے گندے مندے دکھائی دیتے تھے، سوڈان اور بھارت کے یہ مزدور صاف ستھرے کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ تاہم دن کے آخر میں ان کا بھی یہی حال ہوتا ہے کہ لگتا ہے کہ برسوں سے نہیں نہائے۔ ہمارے جہاز کے بالمقابل ایک برطانوی جہاز کھڑا ہے جس سے بھورے رنگ کا سیمنٹ اتارا جا رہا ہے۔ ہزاروں ٹن سیمنٹ اترنا ہے۔ اکثر سیمنٹ کی بوریاں پھٹ جاتی ہیں اور مزدور سیمنٹ اور پسینے سے ایسے لت پت ہوجاتے ہیں کہ خود بھی سیمنٹ کے ڈلے دکھائی دیتے ہیں۔

سعودی عرب آنے والے ہر شخص کو، مرد ہو یا عورت، یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ وہ

Marfat.com

ایک مسلم ملک ہے۔ عیسائی گریگورین کیلنڈر صرف غیر ملکی لوگوں سے کاروباری معاملات میں استعمال ہوتا ہے۔ خود سعودی عرب میں اسلامی کیلنڈر استعمال ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی سعودی سے پوچھیں کہ کیا تاریخ ہے تو وہ جواب دے گا "سترہ محرم" یہاں سرکاری سال 1962ء نہیں، 1382 (ہجری) ہے۔ یہاں کے وقت کا بھی اپنا نظام ہے۔ یہ گرینچ کے وقت سے نہیں، مکہ کے وقت کے مطابق چلتے ہیں۔ غروب آفتاب کے وقت دن ختم ہو جاتا ہے۔ اور اگلا دن نصف شب سے نہیں بلکہ اسی وقت شروع ہو جاتا ہے۔ جہاز کا کپتان یہاں سے روانگی کے لیے بے چین ہے تاکہ وہ شراب پی سکے۔ سعودی عرب میں شراب ممنوع ہے اور امریکہ کے برعکس جہاں پابندی برائے نام ہے، یہاں اس پابندی پر بڑی سختی سے عمل درآمد کروایا جاتا ہے۔ اس معاملے میں پولیس بڑی چوکنی رہتی ہے۔ کوئی شخص شراب پیتا ہوا پکڑا جائے تو اسے سرعام اسی کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے۔ ایک اور خوشگوار بات یہ ہے کہ آپ کو آپ کے سامان چوری ہونے کا کوئی خدشہ نہیں۔ وہ اس معاملے میں بڑے سخت ہیں۔ چور کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے اور بازو کے ٹنڈ کو ٹھیک ہونے کے لیے کھولتے ہوئے تیل میں ڈبو دیا جاتا ہے۔ مسافروں کے برعکس جہاز کے یونانی عملے کو ساحل یا شہر میں جانے کی اجازت ہے۔ لیکن وہ مسلسل منہ بسورتے رہتے ہیں کہ شہر میں ان کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں۔ لڑکیاں نا نائٹ کلب، سینما نہ رقص گاہیں، نہ بار نہ ٹیلیویژن۔ بس ہر وقت سعودی ریڈیو پر قرآن کی تلاوت ہوتی رہتی ہے۔ وقت گزاری کے لیے وہ "وائس آف اسرائیل" پر امریکی موسیقی سنتے رہتے ہیں۔ "وائس آف اسرائیل" کے ٹرانس میٹر بڑے طاقتور ہوں گے کہ یہاں سعودی عرب میں ان کے ریڈیو کی آواز بالکل صاف سنائی دیتی ہے۔ شام پانچ بجے کام کا وقت ختم ہو جاتا ہے تو درجنوں چمکتی دمکتی امریکی کیڈلک کاریں جن میں سے بعض کی قیمت دس ہزار ڈالر سے بھی زیادہ ہوگی، گھاٹ پر اترتی ہیں۔ ان سے جدہ کے امیر کاروباری سیٹھ برآمد ہوتے ہیں۔ زیادہ تر سفید عباؤں میں ملبوس ہوتے ہیں۔ جب وہ آپس میں کاروباری معاملات نبٹا رہے ہوتے ہیں تو ان کی بیویاں جو سرتا پا سیاہ

Marfat.com

رنگ کے برقعوں میں ہوتی ہیں، کاروں کی پچھلی نشستوں پر بیٹھی رہتی ہیں جبکہ ان کے بچے کلکاریاں مارتے ہوئے کھیلتے رہتے ہیں۔ بیٹوں کا لباس تو باپ جیسا ہوتا ہے جبکہ بچیاں مکمل مغربی لباس میں ہوتی ہیں۔ سعودی اپنی بیٹیوں سے بہت پیار کرتے ہیں، انہیں گلے لگاتے ہیں، ان کے بوسے لیتے ہیں اور کاندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں لیکن جیسے ہی وہ سن بلوغ کو پہنچتی ہیں تو مغربی لباس اتر جاتا ہے اور اپنی ماؤں کی طرح وہ بھی سرتاپا سیاہ برقعوں میں ملبوس ہوجاتی ہیں۔ جدہ میں جدید ترین بسیں چلتی ہیں۔ نماز کے وقت یہ بسیں جہاں بھی ہوں رک جاتی ہیں۔ ڈرائیور مناسب جگہ پر چٹائیاں بچھاتا ہے اور سب مسافر جماعت سے نماز ادا کرتے ہیں۔ جب میرے لیے ممکن ہو تو میں بھی اپنا مصلیٰ لے کر عرشے پر چلی جاتی ہوں، جوتے اتارتی ہوں اور ان کے ساتھ نماز ادا کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ وہ کہیں بھی ہوں، انہیں نماز کی ادائیگی میں کوئی شرم یا جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ انہیں بس اتنا کرنا ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی رہگذر کے بغلی راستے پر کوئی چٹائی یا مصلیٰ بچھالیں، بس مسجد تیار ہے۔ گویا پوری زمین ہی مقدس ہے۔

محبتوں کے ساتھ
مریم

Marfat.com

کراچی سے خط

جی ایچ عباسی ایڈووکیٹ
بنک آف انڈیا بلڈنگ
بندر روڈ، کراچی
30 جون 1962ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکرز، اپارٹمنٹ نمبر 223-C
لارچمونٹ، نیویارک، یو۔ایس۔اے

ڈیئر امی اور ابو!

جدہ سے روانگی کے کئی دن بعد ہمارا جہاز صومالی لینڈ کے شہر جبوتی پہنچا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ کسی گاؤں سے ذرا بڑا۔ اسے فرانسیسیوں نے آباد کیا تھا اور یہ خاص نو آبادیاتی بستی لگتی تھی۔ مشرقی یا افریقی طرز تعمیر کا کوئی نشان تک نہ تھا۔ اسے دیکھ کر جنوبی امریکہ کے کسی قصبے کا گمان ہوتا تھا۔ چھوٹے قد والے چند یمنی باشندوں کو چھوڑ کر، جو اپنے روایتی لباس میں ہوتے تھے، ہر کوئی جدید مغربی لباس میں دکھائی دیا۔ مجھے بتایا گیا کہ اگرچہ جبوتی میں ایک مسجد موجود ہے لیکن اکثریت عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ باقی عیسائی دنیا کی طرح یہاں کے عیسائی بھی مذہب سے بے نیاز ہیں۔ اس سے بھی بدترین بات یہ کہ مسلمانوں کی حالت بھی ان سے مختلف نہیں۔ اسکندریہ، پورٹ سوڈان اور جدہ میں اسلام کا نام سنتے ہی چہروں پر اور آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوتی تھی۔ دین سے یہ محبت سوڈان کے ان قبائلی مسلمانوں میں بھی ملتی تھی جو پسماندہ ترین جگہ سے آئے ہوئے ہوتے تھے اور جن کے بال گھنگریالے تھے۔ میں جب بتاتی کہ میں امریکہ کی

Marfat.com

رہنے والی ہوں اور مسلمان ہوگئی ہوں تو گرمجوش مسکراہٹوں سے ان کے سفید دانت چمکنے لگتے تھے۔ اگر میں تسبیح نکالتی تو وہ بھی اپنی تسبیحیں نکال لیتے اور خوشی سے جھلاتے ہوئے اللہ کی تسبیح بیان کرتے۔ لیکن جبوتی کا "مسلمان" مختلف تھا۔ مذہب کے ذکر پر وہ بے نیازی سے شانے اچکاتا، جیسے کہہ رہا ہو، "تو پھر؟" انہیں مذہب کی کوئی پروانہیں تھی۔

جبوتی سے روانگی کے پانچ دن بعد ہم کراچی پہنچے۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ گودی میں ہمارے جہاز کے لیے کوئی جگہ نہ تھی اور ہمیں لنگرانداز ہونے کے لیے بارہ گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ سمندر میں جوار بھاٹے کا یہ عالم تھا کہ جہاز بری طرح ڈول رہا تھا اور کھڑے ہونا بھی مشکل تھا۔ سمندر کی اس کیفیت کی وجہ سے جہاز لنگرانداز بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ دس میل کے دائرے میں مسلسل چکر لگاتا رہا۔ مجھے یہ سوچ سوچ کر ہول اٹھ رہا تھا کہ جانے یہ سلسلہ کتنے روز جاری رہے لیکن اسی شام چھ بجے پتہ چلا کہ گودی میں جگہ مل گئی ہے۔ ایک گھنٹے بعد ہم کراچی کی بندرگاہ میں داخل ہو گئے۔ مولانا مودودی کے تین دوست مجھے لینے کے لیے گھاٹ پر پہنچے ہوئے تھے اور انہوں نے جہاز پر قیام کی میری دردبھری پپتا، بڑی ہمدردی سے سنی۔ اس وقت شام ہوگئی تھی اور میں جہاز سے جان چھڑانے کے لیے بے چین تھی لیکن مجھے بتایا گیا کہ مجھے اگلے دن تک جہاز ہی پر رہنا ہوگا۔

دوسری صبح مولانا مودودی کے تین دوست، جن میں پروفیسر خورشید احمد شامل تھے، مجھے لینے پہنچ گئے۔ میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی کہ خود کو ان افراد کے محفوظ ہاتھوں میں پاکر مجھے کتنا قلبی سکون ملا۔ کسٹم کے اہلکاروں کی طرف سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ تین منٹ میں انہوں نے میرا سارا سامان کلیئر کر دیا اور کسی چیز پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کسٹم آفیسر نے میرے سامان کی تلاشی بھی نہیں لی۔ اس نے سوٹ کیس کھولا، ایک نظر میں اس کا جائزہ لیا اور سوٹ کیس بند کر دیا۔ میرا کراچی میں ٹھہرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ بندرگاہ سے میں سیدھی ائیرپورٹ جاؤں گی اور

Marfat.com

لاہور کی پرواز سے روانہ ہو جاؤں گی۔ لیکن مجھے لینے کے لیے آنے والے تینوں افراد آپس میں جھگڑ رہے تھے کہ کون مجھے اپنے گھر لے کر جائے۔ بالآخر قانون دان، عباسی صاحب جیت گئے اور وہ مجھے اپنی بیوی اور بیٹی سے ملانے کے لیے اپنے گھر لے گئے۔

گزشتہ کئی روز سے میں مولانا مودودی کے دوستوں کی میزبانی سے لطف اندوز ہو رہی ہوں۔ یہ مبالغہ نہیں ہوگا کہ مجھے یوں لگتا تھا جیسے "ہیلینک ٹارچ" ایک جہنم تھا جس سے نکل کر میں ایک جنت میں آ گئی ہوں۔ عباسی صاحب کی بیوی انگلش جرمن ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اس کا نام "لارا" رکھا گیا۔ عمر تیئس برس ہے اور وہ یہاں کی زندگی سے اتنی مطمئن ہے کہ کہیں اور رہنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ وہ خوبصورت بھی ہے اور خوب سیرت اور خوش مزاج بھی۔ میں نے ان کی معیت میں بڑا اچھا وقت گزارا۔ ان کا ایک ملازم کشمیر سے ہے۔ وہ بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا اور اب ان کے ساتھ رہتا ہے۔ نام اس کا اشرف ہے۔ اگرچہ وہ کبھی سکول نہیں گیا لیکن بڑا مؤدب اور نفیس عادتوں کا مالک ہے۔ امریکہ میں اس عمر کے بچے سے اس نفاست اور سلیقہ شعاری کی توقع نہیں کی جا سکتی جس کا مظاہرہ اشرف کرتا ہے۔ وہ گھر کی صفائی میں مشغول رہتا ہے، کھانا لگانے میں مدد کرتا ہے، کچن کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا ہے اور باقی وقت میں بچی کو سنبھالتا ہے۔ وہ اس سے بڑی شفقت سے پیش آتا ہے اور اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔

یہاں قیام کے دوران میں مجھے اتنا مصروف رکھا گیا کہ اپنی ذات کے لیے مجھے چند لمحے بھی میسر نہیں آئے۔ محترم عباسی نے مجھے بتایا کہ بہت سے افراد مجھ سے ملنے کے خواہش مند ہیں اور مہمان کے طور پر مجھے اپنے گھروں پر بلانے کے لیے بے چین ہیں۔ میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتی لیکن انہوں نے میرے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ پرسوں مجھے "وائس آف اسلام" کے مدیر پروفیسر خورشید نے اپنے گھر بلایا۔ "وائس آف اسلام" میں میرے کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ پروفیسر خورشید کے گھر

Marfat.com

سرکاری افسروں سمیت ان کے کئی دوست جمع تھے۔ امریکی معیار کے لحاظ سے پروفیسر صاحب کا گھر بہت چھوٹا تھا لیکن ان کی لائبریری بڑی وسیع اور کشادہ تھی جس میں عربی، انگریزی اور اردو کی تقریباً تین ہزار کتابیں موجود تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ جو کچھ وہ کماتے ہیں، اس کا بڑا حصہ نئی کتابیں خریدنے پر خرچ ہو جاتا ہے۔ پورے کراچی سے طلبہ ان کی لائبریری سے استفادہ کرنے آتے ہیں۔ میں ان کی جگہ ہوتی تو شاید یہی کرتی۔

دوسرے دن لنچ میں نے احمد باوانی کے گھر میں کیا۔ وہ پاکستان کے امیر ترین آدمیوں میں سے ہیں اور ان کا لاکھوں کا کاروبار ہے۔ وہ "مسلم نیوز انٹرنیشنل" کے سرپرست ہیں اور گزشتہ اپریل انہوں نے مجھ لندن سے فون کر کے "مسلم نیوز انٹرنیشنل" کی مدیر بننے کی پیش کش کی تھی۔ باوانی صاحب کا گھر پرشکوہ اور زیبائش کا اعلیٰ مظہر ہے۔ مشرقی گھرانوں کی طرح یہ ایک صحن کے اردگرد تعمیر کیا گیا ہے۔ باغ میں رنگ برنگ پودے اور کھلتے ہوئے پھولوں کی بہار اتری رہتی ہے۔ باوانی صاحب کی دو خوبصورت بیویاں اور چودہ بچے ہیں۔ آٹھ لڑکیاں اور چھ لڑکے۔ ایک سے زائد شادی کے نقاد جو کچھ کہتے ہیں، اس کے برعکس ان دونوں خواتین کے درمیان دوستانہ مراسم ہیں اور وہ بڑی ہنسی خوشی رہ رہی ہیں۔ میں نے ان خواتین اور ان کی بیٹیوں کے ساتھ لنچ کیا۔ سب بچیاں جوان ہیں اور مجھے ان کا ساتھ بہت اچھا لگا۔ اسے صرف لنچ نہیں کہہ سکتے، یہ ایک ٹھاٹ دار، پرتکلف ضیافت تھی اور کھانے اتنے لذیذ تھے کہ اس سے پہلے میں نے اتنے مزیدار کھانے کبھی نہیں کھائے۔ باوانی صاحب کی بیویوں کو جب میرا پتہ چلا تو انہوں نے میرا خیال رکھتے ہوئے مرچیں اور گرم مسالے سالن میں ڈالنے سے اجتناب کیا حالانکہ یہاں کے لوگ تو یہ چیزیں بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے میں ابھی چٹپٹے کھانوں کی عادی نہیں ہوئی۔ میز پر اگرچہ چاندی کے چمکتے دمکتے ہوئے چھری، کانٹے اور چمچے سجائے گئے تھے لیکن وہ صرف سجاوٹ کے لیے ہی تھے کیونکہ سب نے کھانا ہاتھ ہی سے کھایا۔ کھانے کے بعد ہم نے نرسری میں ظہر کی نماز ادا

Marfat.com

کی۔ دو گود والے بچے اپنے پنگھوڑوں میں سوئے ہوئے تھے اور ان کی بوڑھی آیا ان کے ساتھ ایرانی قالین پر لیٹی ہوئی تھی۔ باوانی صاحب لکھ پتی آدمی ہیں اور اپنی آمدنی کا بڑا حصہ رفاہی کاموں پر خرچ کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک سیکنڈری سکول بھی قائم کیا ہے۔ وہ چونکہ مخلوط تعلیم کے حق میں نہیں ہیں اس لیے انہوں نے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ عمارتیں بنوائی ہیں۔ باوانی سکول کا ڈیزائن بہت عمدہ ہے اور اس کی تعمیر روایتی اسلامی ثقافت اور جدید طرز تعمیر کا حسین امتزاج ہے۔ باوانی صاحب مجھے سکول دکھانے لے گئے اور مجھے پرنسپل سے ملوایا جن کی ڈاڑھی سفید تھی اور وہ سیاہ اچکن میں ملبوس تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ سکول قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ جدید علوم سیکھنے کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات سے بھی آگاہ ہوسکیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ پاکستان میں نوے فیصد لوگ ناخواندہ ہیں اور ایسے سکول قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ پرنسپل صاحب نے بتایا کہ انہیں ایسے اساتذہ ڈھونڈنے میں سخت دقت پیش آتی ہے جو جدید علوم سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات پر بھی عبور رکھتے ہوں۔ میں ان کی لائبریری دیکھنا چاہتی تھی۔ لائبریری گئی تو دیکھا کہ وہاں اردو کی بجائے انگریزی کتابیں زیادہ تھیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ کتابیں عطیات کے ذریعے سے اکٹھی کی گئی ہیں یا خریدی گئی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ لائبریری کی تمام کتابیں خریدی گئی ہیں۔ حال ہی میں کراچی کے امریکی سفارتخانے نے انہیں سیکڑوں کتابیں عطیہ دینے کی پیشکش کی تھی لیکن انہوں نے سختی سے یہ پیش کش مسترد کردی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے سکول میں کسی قسم کی مداخلت پسند نہیں کرتے اور کوئی ایسی مدد وصول نہیں کرتے جو بعد میں ان پر اثر انداز ہوسکے۔ باوانی صاحب، اس سکول کے باوقار پرنسپل، عباسی صاحب اور دوسرے وہ پاکستانی جن سے میں کراچی میں ملی، امریکہ کے تکنیکی امدادی پروگرام اور صدر کینیڈی کی "امن کور" کے سخت خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس پروگرام کا مقصد ہمارے نوجوانوں کو دین سے برگشتہ کرنا اور مغربی ثقافت کا پرچار کرنا ہے۔ ان کا کہنا تھا "اگر ہماری حکومت نے بیرونی امداد کے

Marfat.com

سیلاب کے آگے بند نہ باندھا، سستی اور گھٹیا ہالی ووڈ فلموں اور فحش کتابوں کی درآمد بند نہ کی تو ہمارا اپنا طرز زندگی تباہ و برباد ہو جائے گا۔"

باوانی صاحب کے گھر کی لڑکیاں مردوں کی طرح انگریزی تو نہیں بول سکتیں لیکن انہوں نے اپنی شفقتوں اور محبتوں سے میرا دل موہ لیا۔ مولانا مودودی کے دوستوں کی بیویوں نے یہاں کراچی میں اپنی ایک کلب بنائی ہوئی ہے۔ جہاں وہ ہر ہفتے ملتی ہیں، دینی معاملات پر تبادلہ خیال کرتی ہیں اور درسِ قرآن و حدیث سنتی ہیں۔ ایک دن وہ مجھے اپنی رہنما کے گھر لے گئیں۔ وہاں میری سب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے خاص طور پر میرے لیے پاکستانی لباس تیار کر رکھا تھا جو بڑے اصرار سے مجھے پہنایا گیا۔ یہاں پاکستان میں مذہبی گھرانوں کی خواتین ہندی ساڑھی نہیں پہنتیں۔ ہم سفید رنگ کی لمبی لمبی شلواریں پہنتی ہیں جن میں کمر کے قریب چنٹیں پڑی ہوتی ہیں، یہاں سے نیفہ موڑ کر اس میں سے ازار بند گزارا جاتا ہے۔ اس پر کوئی رنگین قمیص پہنتے ہیں جو گھٹنوں سے نیچی ہوتی ہے۔ اس کے اطرف میں چاک ہوتے ہیں تاکہ چلنے پھرنے میں آسانی ہو۔ اور اس کے علاوہ ایک دوپٹہ جو پوری طرح سر کو اور سینے کو ڈھانپ لیتا ہے۔ یہ گھر کا لباس ہے۔ باہر جانا ہو تو ہم ایک لمبا کوٹ پہنتے ہیں اور چہرے پر سیاہ نقاب ہوتا ہے جو آنکھوں کو بھی ڈھانپ لیتا ہے۔ آنکھوں کے اردگرد کپڑا اتنا مہین ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کو چہرہ نظر نہیں آتا لیکن نقاب پہننے والی بخوبی اردگرد دیکھ سکتی ہے۔ برقع اور نقاب کو پہن کر ایسے لگتا ہے جیسے ہم نے دھوپ کی عینک پہن رکھی ہو۔ بس آج کے بعد میں نے ہمیشہ یہی لباس پہننا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ مجھے اس لباس میں دیکھیں۔ شاید آپ اپنی پرانی "پیگی" کو اس حلیہ میں پہچان بھی نہ پائیں۔

ان میزبان خواتین نے اصرار کیا کہ میں ان کے ساتھ جا کر ایک قرآنی مدرسہ دیکھوں جو انہوں نے دیہاتی طلبہ اور ان کی ماؤں کے لیے قائم کیا تھا۔ ایک خستہ حال ٹیکسی میں ہم نے سفر شروع کیا۔ سڑک انتہائی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ ہچکولے لیتے ہوئے ہم نے بمشکل دس میل کا سفر طے کیا اور بالآخر مدرسے پہنچ گئے۔ یہ ایک سادہ سی

Marfat.com

عمارت تھی جس میں سو سے زیادہ طلبہ اور ان کی مائیں موجود تھیں۔ ماؤں نے گود میں بچے بھی اٹھا رکھے تھے اور کچھ فرش پر بیٹھی انہیں دودھ پلا رہی تھیں۔ ایک ہی کرسی تھی جو مجھے پیش کر دی گئی۔ خاتون رہنما نے اردو میں میرا تعارف کروایا۔ اس دوران میں مجھے لیموں کا ٹھنڈا شربت پیش کیا گیا۔ آخر مجھے خطاب کی دعوت دی گئی۔ میں نے مختصر خطاب کیا کیونکہ ان میں سے بیشتر کو انگریزی نہیں آتی تھی۔ میں نے کہا، "میں امریکہ سے یہاں سیاحت کرنے نہیں آئی بلکہ یہیں رہنے کے لیے آئی ہوں۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ مل کر رہوں گی کیونکہ آپ میرا حصہ اور میں آپ کا۔۔۔۔۔"

من تُو شُدم تُو من شُدی، من تن شُدم تُو جاں شُدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

اس کے علاوہ میں نے کیا کچھ کہا، مجھے یاد نہیں لیکن جب میری تقریر کا ترجمہ کیا جا رہا تھا تو سامعین کے چہروں کے تاثر سے لگتا تھا کہ وہ مجھے بہت مقدس سمجھ رہے ہیں۔ اس کے بعد سکول کی پرنسپل نے کئی چھوٹے بچوں کو اور کچھ لڑکیوں سے میرے اعزاز میں قرآن پڑھوایا۔ ایک جوان لڑکی کی تلاوت بہت اچھی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ عرب تھی اور مکہ میں پیدا ہوئی تھی۔ جب میں چلنے لگی تو ہر کوئی مجھ سے ہاتھ ملانا چاہتا تھا۔ دروازے تک پہنچنے میں مجھے آدھا گھنٹہ لگا۔ غربت کے باوجود خواتین اور لڑکیوں کے چہرے خوبصورت تھے۔ انہیں وہ خوبصورتی حاصل تھی جو دلوں کے اندر ہوتی ہے اور نور بن کر چہروں پر دمکتی ہے۔

محبتوں کے ساتھ

مریم

Marfat.com

لاہور سے خط

5-اے ذیلدار پارک

اچھرہ لاہور

یکم جولائی 1962ء

میں نے کراچی سے جو خط لکھا تھا، اسے مکمل کرنے کا وقت نہ مل سکا کیونکہ مجھے اچانک ہی روانہ ہونا پڑا۔ میری پرواز لاہور جانے کے لیے تیار تھی۔ کراچی ایئرپورٹ دنیا کے بڑے اور معروف مستقروں میں سے ہے۔ عمارت بھی بڑی خوبصورت اور شاندار ہے۔ کراچی سے لاہور کا فاصلہ سات سو میل سے زائد ہے لیکن جہاز نے یہ فاصلہ دو گھنٹوں میں طے کر لیا۔ مجھے ایک عمر رسیدہ امریکی خاتون کے ساتھ نشست ملی جو امریکی سفارت خانے میں کوئی سیکرٹری تھی۔ مجھے شروع ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے اسلام کے بارے میں گفتگو پسند نہیں۔ چنانچہ ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور سفر بخوبی کٹ گیا۔ کافی بلندی پر پریشر کم ہونے سے مجھے کانوں میں کافی درد ہوا لیکن ویسے پرواز آسان اور آرام دہ تھی اور اس سے پہلے کہ میں یہ محسوس کرتی کہ میں پرواز کر رہی ہوں، سفر ختم ہو گیا۔ اس پرواز اور اس جہنم نما بحری جہاز "ہیلنک ٹارچ" کا کیا موازنہ ہو سکتا ہے۔ وہ ایک گھنٹے میں چند میل طے کرتا تھا، بندرگاہوں پر کئی کئی گھنٹوں اور دنوں کی تاخیر ہوتی تھی اور یہ جہاز کارکردگی اور سہولتوں کے لحاظ سے اتنا آرام دہ تھا کہ امریکی ہوا باز کمپنیاں بھی اس کے آگے ہیچ تھیں۔

جہاز کے زیادہ تر مسافر پاکستانی تھے جو مغربی طرز کی ورائٹی کے تھے۔ کچھ امریکی کاروباری حضرات تھے۔ پورے جہاز میں مَیں واحد خاتون تھی جو برقع اور حجاب میں ملبوس تھی۔ لاہور میں اترتے ہی فضائی میزبان مجھے فضائی مستقر کے انتظار گاہ میں لے گئی

Marfat.com

جہاں مولانا مودودی کی کتابوں کے پبلشر میاں طفیل محمد اپنے کئی بچوں کے ہمراہ میرے منتظر تھے۔ وہ سفید ڈاڑھی اور بے داغ براق کپڑوں اور قراقلی ٹوپی میں بڑے باوقار لگ رہے تھے۔ مجھے تو انہیں دیکھ کر سکتہ ہو گیا کیونکہ میرا خیال تھا کہ وہ ابھی تک جیل میں ہیں۔

سال پہلے ہی انہیں "پاکستانی فیملی لاء آرڈیننس" جو اسلامی تعلیمات کے منافی قانون تھا، کے خلاف ایک پمفلٹ شائع کرنے پر بغیر کوئی مقدمہ چلائے قید کر دیا گیا تھا۔ جب مجھے پتہ چلا کہ وہ تین دن پہلے ہی رہا ہوئے ہیں تو میں نے بے ساختہ پوچھا "انہوں نے آپ کے ساتھ برا سلوک تو نہیں کیا؟" انہوں نے سنجیدگی سے سر ہلایا اور کہا "اللہ کے راستے میں تکلیفیں اٹھانا اچھا ہے۔" جب ہم کار میں مولانا مودودی کی رہائش گاہ کی طرف جا رہے تھے تو میں کراچی اور لاہور کے ماحول کے تضاد پر بڑی حیران ہوئی۔ کراچی ایک صحرا جیسا ہے جس میں بمشکل تھور جیسی کوئی چیز لگ سکتی ہے جبکہ لاہور کی زمین زرخیز دکھائی پڑتی ہے۔ اس کی کشادہ سڑکوں کے کنارے ہرے بھرے درخت ہیں، جگہ جگہ خوبصورت پارک ہیں اور باغات۔ کراچی کے برعکس جہاں زیادہ تر عمارتیں نو تعمیر شدہ ہیں، لاہور تاریخی مقامات سے پر ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی مسجد بھی یہیں واقع ہے۔

مولانا مودودی نے اپنے خطوط میں اپنی دو بیٹیوں کے بارے میں تو بتایا تھا لیکن کبھی اشارتاً بھی ذکر نہیں کیا کہ ان کے سات بچے اور بھی ہیں جن میں چھ سالہ عائشہ اور دس سالہ خالد بھی شامل ہیں۔ چھوٹے شرارتی بندر جنہیں دیکھ کر مجھے پورٹ سوڈان کے امام صاحب کے بچے یاد آ گئے۔ بدقسمتی سے مولانا مودودی اپنے کام، آنے جانے والوں سے ملاقاتوں اور ایک مقامی مسجد میں قرآن وحدیث کا درس دینے میں اتنے مصروف رہتے ہیں کہ انہیں میرے ساتھ کچھ وقت گزارنے کی فرصت ہی نہیں۔ ان کی دو بڑی بیٹیاں، حمیرا اور اسماء خوبصورت ہیں اور خوش مزاج ساتھی۔ میں انھی میں سے ایک کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ دونوں اپنے والد کی طرح اسلام سے والہانہ لگاؤ رکھتی ہیں لیکن علم کی وسعت میں اپنے والد کے پاسنگ بھی نہیں۔ اڑوس پڑوس کی عورتیں

Marfat.com

میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے جوق در جوق آتی ہیں۔ میں بڑی پریشان ہوتی ہوں کیونکہ مجھے اردو نہیں آتی اور وہ انگریزی سے نا آشنا ہیں۔ میرے لیے ناممکن ہے کہ میں ان کے ساتھ تبادلۂ خیال کرسکوں۔ میں نے مولانا کی دونوں بڑی بیٹیوں سے کہا کہ وہ مجھے اردو سکھانے کی ہر ممکن کوشش کریں کیونکہ زبان کی رکاوٹ اس وقت میرا بڑا مسئلہ ہے۔

امریکی طرز رہائش کے معیار سے تو مولانا مودودی کا گھر بہت چھوٹا اور تنگ لگتا ہے لیکن یہ تکلفات سے مبرا، محبت بھرا گھرانہ ہے جو ہر وقت عورتوں اور بچوں سے بھرا رہتا ہے۔ عورتیں گفتگو میں مصروف رہتی ہیں اور بچے کھیل میں۔ یہ صحیح معنوں میں ایک گھر ہے، ایک ایسا گھر جو زیبائش کے لیے نہیں، رہنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ ہم مادہ پرست امریکی کہتے ہیں کہ کسی ملک کے معیار زندگی کو جانچنے کا معیار اس کے باتھ روم ہیں۔ میں نے پاکستان میں ہر طرح کے باتھ روم دیکھے ہیں۔ احمد باوانی کے محل جیسے گھر میں انتہائی پرتعیش تنصیبات والے باتھ روم اور پروفیسر خورشید کے گھر میں سیمنٹ کی اینٹوں اور درمیان میں خلا والے ٹائلٹ۔ (وہ اپنی آمدنی لائبریری کی کتابیں خریدنے پر خرچ کرتے ہیں، ٹائلٹوں پر نہیں)۔ مولانا مودودی کے گھر میں باتھ روم اور ٹائلٹ میں سرے سے کوئی تنصیبات ہیں ہی نہیں۔ رفع حاجت کے لیے ایک پر بیٹھتے ہیں اور فارغ ہونے پر اسے لکڑی کے ایک تختے سے ڈھانپ دیتے ہیں۔ دن میں دو بار خاکروب آکر اس کی صفائی کر جاتا ہے۔

سونے کے لیے ہم نیچی چارپائیاں استعمال کرتے ہیں جو ہندو پاکستان ہی میں استعمال ہوتی ہیں۔ انہیں رسیوں اور بانوں سے بنایا جاتا ہے اور ان پر فوم کے گدے نہیں ہوتے۔ مجھے یہ کافی آرام دہ لگتی ہیں اور مجھے ان پر مزے کی نیند آتی ہے۔ مجھ پر امریکہ میں اس بات پر اکثر تنقید ہوتی تھی کہ میں کھانے کی میز پر چھری کانٹوں کے استعمال میں مہارت نہیں رکھتی۔ لیکن یہاں کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ یہاں بڑے چمچ (ڈوئیاں) صرف سالن پکانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ خود مولانا مودودی چھری کانٹا استعمال نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سے کھانے کی لذت بے مزہ ہوجاتی ہے

Marfat.com

اور ذائقے کا لطف بھی ضائع ہوتا ہے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ سے کھانا کھاتے تھے، سو ہم ان کی پیروی کرتے ہیں۔ کھانے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ مجھے سارے پاکستانی کھانے پسند ہیں بشرطیکہ ان میں مرچیں اور گرم مسالے نہ ڈالے گئے ہوں۔ مجھے چپاتیاں بہت پسند ہیں۔ یہ چھلکے سمیت گندم کے بنے ہوئے کیک کی طرح ہوتی ہیں اور ان سے مونگ پھلی کی سی خوشبو آتی ہے۔ ان میں اتنی توانائی ہوتی ہے کہ میں ایک یا زیادہ سے زیادہ دو چپاتیاں کھا کر سیر ہو جاتی ہوں۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اسکندریہ سے پورٹ سوڈان، کراچی اور لاہور تک مجھے جو کچھ پیش کیا گیا، میں کھاتی رہی اور ہر طرح کا پانی پیتی رہی۔ میرے ان خدشوں کے برعکس کہ کہیں مجھے پیچش یا اسہال نہ ہو جائیں، میں چاق چوبند ہوں اور ہر طرح سے صحت مند۔ موسم نیویارک سے زیادہ گرم نہیں ہے، بلکہ امریکہ میں موسم گرما زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ لیکن یہاں گھر بنائے ہی ایسے گئے ہیں کہ سورج کی تپش سے محفوظ رہیں اور ہوا کا گزر آزادانہ ہو۔ اس طرح قیمتی ایئر کنڈیشنوں کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

آپ کے خطوط ملے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ براہ مہربانی مجھے زیادہ تواتر سے خط لکھیں۔ وہاں ہونے والی ہر بات میں جاننا چاہتی ہوں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی میرے لیے اہم ہیں۔ میری وہ کتابیں جنہیں میں نے روانگی سے پہلے بذریعہ ڈاک بھجوایا تھا، مجھے مل گئی ہیں بلکہ میری آمد سے کئی دن پہلے یہاں پہنچ گئی تھیں۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ تمام کتابیں بسلامت پہنچ گئیں اور ایک بھی گم نہیں ہوئی۔

آئندہ خط میں، میں مولانا مودودی، ان کے گھر والوں اور رشتہ داروں کے بارے میں تفصیل سے لکھوں گی۔ بحری جہاز میں تو مجھے آپ کے بارے میں سوچنے کی فرصت نہیں تھی لیکن اب آپ بہت یاد آتے ہیں۔ امید ہے آپ کو میرا تار مل گیا ہوگا اور آپ مجھے بہت جلد خط لکھیں گے۔

اپنی ساری محبتوں کے ساتھ

مریم

Marfat.com

لاہور سے دوسرا خط

مریم جمیلہ
معرفت مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی
5-اے ذیلدار پارک
اچھرہ لاہور
30 جون 1962ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکٹرز، اپارٹمنٹ نمبر 223-C
لارچمونٹ، نیو یارک، یو۔ ایس۔ اے

ڈیئر امی اور ابو!

اب جب کہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے گھر میں تمام خدشوں سے بے نیاز ہوں اور میں نے پرسکون زندگی گزارنا شروع کر دی ہے، میں آپ کو بتانا چاہوں گی کہ میں نے پاکستان آ کر بسنے کا فیصلہ کیوں کیا۔

جب ایک سال پہلے میں نے اسلام قبول کیا تو نیو یارک میں مسلمان خال خال ہی تھے۔ مسلم برادری سے الگ تھلگ رہ کر مجھے یوں لگتا تھا کہ میں کسی چھوٹے سے جزیرے پر ہوں جس کے چاروں طرف بپھرا ہوا سمندر۔ میں بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ امریکہ میں میرا کوئی مستقبل نہیں۔ جس معاشرے سے میں دل کی گہرائیوں سے نفرت کروں، اس میں مجبوراً رہتی بھی تو ماحول سے سازگاری پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ میں مایوس کن حد تک ناموزوں شخص ہوتی۔ زندگی گزارنے کے لیے روزی نہ کما سکتی۔ سماجی ارتباط کے لیے صنف مخالف سے کی جانے والی ملاقاتیں، رقص و سرود کی محفلیں اور ملے

Marfat.com

گلے کے لیے منعقد کی جانے والی مجلسیں مغربی طرز زندگی کا حصہ ہیں اور میں انہیں اپنی زندگی سے خارج کر چکی تھی۔ مرد اور عورتیں انہی تقریبات میں ملتے ہیں تو جب میں ان تقریبات میں شریک ہی نہیں ہوتی تھی تو میری شادی کے امکانات، کامیاب اور ہنسی خوشی زندگی گزارنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ میں اگر امریکہ میں رہتی تو میرے مقدر میں رنج وغم اور تنہائی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اور جب آپ بھی مجھے سہارا دینے کے قابل نہ رہتے (یا سہارا نہ دینا چاہتے) تو سرکاری بہبود فنڈ کے معمولی وظیفے کی شرمندگی سے دوچار ہوتی یا معذوروں کی طرح کسی سرکاری ادارے میں پڑی رہتی۔ اس خوفناک اور پریشان کن صورت حال سے بچنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ میں امریکہ چھوڑ دوں اور کسی مسلم ملک میں جا کر اپنا گھر بساؤں۔

21 جنوری 1962ء کو اپنے پہلے خط میں مولانا مودودی نے بڑی دانائی سے میری مشکلات کی پیچیدگیوں کا اندازہ کر لیا تھا۔ انہوں نے لکھا:

"ایک بات پر مجھے بڑی خوش کن حیرانی ہے اور صحیح صحیح جاننا چاہتا ہوں کہ ایک امریکن نوجوان لڑکی کو، جو یہودی والدین کے گھر پیدا ہوئی، اسلام کا اتنا واضح اور نکھرا ہوا تصور کیسے حاصل ہو گیا۔ مجھے خوشی ہو گی اور میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ اپنے ذہنی ارتقاء کی کہانی مجھے لکھنے کے لیے کچھ وقت نکال سکیں۔ اسلامی معاشرے کی غیر موجودگی میں آپ جیسے اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہی ہیں، مجھے اس کا اندازہ ہے۔ کسی بھی مسلمان کے لیے یہ بڑا اذیت ناک تجربہ ہے۔ لیکن آپ کو شاید یہ جان کر تسلی ہو کہ موجودہ زمانے میں ہر سچا مسلمان اسی اذیت ناک تجربے سے دوچار ہے۔ کچھ کے لیے شاید یہ اذیت کم ہو یا اس کی صورت مختلف ہو۔ اگر آپ پاکستان آئیں تو آپ سے مل کر مجھے خوشی ہو گی اور میں مہمان کے طور پر آپ کو اپنے گھر رکھوں گا۔ میرے اور میری فیملی کے لیے یہ انتہائی خوشی کی بات ہو گی اگر آپ پاکستان آنے کا اہتمام اس طرح کریں کہ اس سال کے روزے ہمارے ساتھ رکھ سکیں جو 17 فروری سے 18 مارچ تک ہوں گے۔ میں مارچ کے آخر تک لاہور میں ہی ہوں۔ اس کے بعد میرا افریقہ جانے کا ارادہ ہے

Marfat.com

جہاں میں اسلام کی تبلیغ کا کام منظم کرنا چاہتا ہوں (ان شاء اللہ)۔ سال کے باقی حصے میں، میں لاہور ہی رہوں گا اور آپ جب بھی آئیں مجھے گھر پر ہی پائیں گی۔۔۔۔۔"

اگرچہ اس وقت میں مولانا مودودی کی پیش کش قبول کرنا چاہتی تھی لیکن مجھ میں اتنی ہمت اور حوصلہ نہیں تھا کہ اپنا گھر بار چھوڑ کر سارے رشتے ناتے توڑ کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو جاؤں

عجیب پہیلیاں ہیں ہاتھ کی لکیریں بھی
لکھے ہیں مگر منزلیں نہیں لکھیں

میں نے ان کی پیش کش مسترد نہیں کی بلکہ ملتوی کرتی رہی۔ ان سے میری خط و کتابت جاری رہی اور میں نے اپنی ذہنی تبدیلی کی کہانی انہیں لکھ بھیجی۔ ایک ماہ بعد جواب آیا:

"میں نے آپ کی زندگی کے خاکے کا بڑے غور سے اور بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا۔ اسے پڑھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ کھلے ذہن کا ایک شخص بغیر کسی تعصب کے، خلوص اور صبر سے سچ کی تلاش کرے تو صراط مستقیم تک پہنچ سکتا ہے۔ آپ کی پریشانیاں، ابتلاء و آزمائش کی گھڑیاں اور ذہنی اذیت کی کہانی میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ اگر ایک شخص اپنے معاشرے کے رواج کے الٹ چل رہا ہو اور اپنی ذہنی کشمکش پر اسے ہمدردی کا ایک بول یا حوصلہ افزائی کا ایک لفظ بھی سننے کو نہ ملے اور پھر بھی اس کا اعصابی نظام مفلوج نہ ہو تو یہ ایک غیر معمولی بات ہوگی۔ جن حالات میں آپ کو کسی ماہر نفسیات یا ذہنی مریضوں کے اداروں میں جانا پڑا، وہ آپ کی شخصیت میں کسی غیر فطری عنصر کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ فطری نتیجہ تھا اس تضاد کا جو آپ کے اور آپ کے اردگرد ماحول میں موجود ہے۔ آپ کا مزاج، ذوق، خیالات، معیار کمال، عادتیں اور زندگی گزارنے کا عمل، سب کچھ اس معاشرے سے مختلف ہے جس میں آپ رہ رہی ہیں۔ یہ مستقل تضاد آپ کو اس سے کہیں زیادہ نقصان پہنچا سکتا تھا، جو آپ کو پہنچا۔ آپ کی مثال اس پودے کی سی ہے جو ہو تو استوائی خطے کا لیکن اسے لگا دیا جائے قطبی خطوں

Marfat.com

کی سرد منجمد زمین پر۔ جو ہوا وہ تو ہونا ہی تھا۔ ہر شخص اپنے مزاج کے موافق حالات ہی میں اپنی شخصیت کی نشوونما کر سکتا ہے اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو اجاگر کر سکتا ہے۔ ناموافق حالات میں ایک شخص اپنا ذہنی توازن کھو سکتا ہے اور اس کی ساری صلاحیتیں زائل ہو سکتی ہیں۔ چھبیس برس کی ہونے کے باوجود اگر آپ ابھی تک غیر شادی شدہ ہیں، اس کی وجوہات بھی یہی ہیں۔ آپ کا معاشرہ آپ جیسی لڑکی کو پسند نہیں کر سکتا۔ وہاں آپ کی ساری خوبیاں، آپ کی کمزوریاں سمجھی جائیں گی۔ موجودہ سیٹ اپ میں آپ کو زندگی کا کوئی ساتھی نہیں مل سکتا اور اگر مصنوعی طور پر آپ کو کسی شخص کے پلے باندھ بھی دیا جائے تو نہ یہ پسندیدہ بات ہوگی نہ کامیاب ازدواجی زندگی کی ضمانت۔ اگر آپ پاکستان آ جائیں تو آپ خود کو ہم خیال افراد کے درمیان پائیں گی۔ ہاں زبان کا مسئلہ ہوگا۔ یہاں آپ کو تمام اخلاقی اور مادی امداد اور حوصلہ افزائی ملے گی۔ عین ممکن ہے آپ کو کوئی خوب سیرت، نیک جوان مل جائے جو آپ کی زندگی کا ساتھی بن سکے۔ جب آپ پاکستان آئیں گی تو میں آپ کو ہر ممکن مدد کی پیشکش کرتا ہوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ کی امریکہ سے پاکستان آنے کے سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکتا کیونکہ یہاں بیرونی زرِ مبادلہ پر بڑی سخت پابندیاں عائد ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کے والدین اور آپ کے خیر خواہ آپ کے راستے میں حائل نہیں ہوں گے۔ انہیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اگر ان کی بیٹی کو زبردستی وہاں کے ناموافق حالات میں رکھا گیا تو نہ صرف یہ کہ ایک مایوس کن زندگی اس کا مقدر ہوگی بلکہ اس بات کا خدشہ بھی ہے کہ اسے ذہنی اذیت کے وہی دورے نہ پڑنے لگیں جن سے اس نے پانچ سال کے بعد چھٹکارا پایا ہے۔ اس کے برعکس اگر خوش قسمتی سے اُسے دوستانہ اور اس کی ذہنی مطابقت والا معاشرتی ماحول مل جائے تو اس کا ذہنی توازن استوار ہو جائے گا اور وہ زندگی میں کوئی قابل رشک مقام حاصل کر لے گی۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ اس نکتے کو بخوبی سمجھ لیں تو ان کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہوگی۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ اس تبدیلی کو خوش آمدید کہیں۔۔۔۔۔"

Marfat.com

مجھے لکھنے پڑھنے میں مہارت حاصل تھی لیکن معاشرے سے عدم مطابقت کی وجہ سے میں اپنی روزی نہیں کما پا رہی تھی اور اس کی وجہ سے نیویارک میں رہتے ہوئے مجھ پر جو مایوسی چھائی ہوئی تھی، اس سے نکلنے اور مولانا مودودی کی پیشکش قبول کرنے اور حتمی فیصلہ کرنے میں ڈیڑھ سال لگ گیا۔ چنانچہ اس سال 31 مارچ کو انہوں نے لکھا:

"آپ کا 22 مارچ کا لکھا ہوا خط مجھے ملا۔ میں اس سے پہلے کے خطوں کا جواب دے چکا ہوں۔ مجھے آپ کی مشکلات اور مسائل کا پورا احساس ہے۔ میں آپ کے امریکہ میں مستقبل کے بارے میں پر امید نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر آپ پاکستان آئیں تو آپ کو گھر کا ایک فرد بنا کر گھر میں رکھنے پر مجھے خوشی ہوگی۔ اس دوران میں میری معرفت آپ کا تعارف اور رابطہ کسی نیک سیرت جوان سے ہو جائے گا۔ اگر کوئی آپ کا ہم پلہ ہوا تو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر آپ دونوں تحریک اسلامی کے مفید کارکن ثابت ہوں گے۔ لیکن جب مجھے لگا کہ آپ نے امریکہ ہی میں رہنا مناسب سمجھا ہے تو میں نے اپنے ارادے کر دیے۔ لیکن اب جب میں آپ کے مسائل پر غور کرتا ہوں تو خود کو اپنی پیشکش دہرانے پر مجبور پاتا ہوں۔ زرِ مبادلہ پر پابندیوں کی وجہ سے میں امریکہ میں آپ کی مالی امداد نہیں کر سکتا لیکن میری رائے ہے، اس سے پہلے کہ آپ کی مالی حالت مزید دگرگوں ہو جائے، آپ وہ ملک چھوڑ دیں اور یہاں آ جائیں۔ جب آپ یہاں پہنچ جائیں گی تو ان شاء اللہ آپ کو مستقبل کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ میں آپ کے والدین کو پوری صورت حال صاف صاف بتانا چاہتا ہوں۔ آپ کو بھی انہیں بلا تکلّف یہ بتا دینا چاہیے کہ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کا امریکہ میں رہنا مشکل ہوگا۔ آپ سے بھلائی کا تقاضا ہے کہ وہ راضی برضا آپ کو پاکستان آ کر بسنے کی اجازت دیں۔ آپ انہیں یہ بھی بتائیں کہ جو شخص آپ کو یہ مشورہ دے رہا ہے اور یہ انتہائی قدم اٹھانے کی دعوت دے رہا ہے، انہی (والدین) کی طرح کا ہے اور آپ کا خیر اندیش۔ وہ صرف مشورہ ہی نہیں دے رہا بلکہ مشورہ قبول ہونے کے بعد تمام تر حالات کی ذمہ داری بھی قبول کر رہا ہے۔ اگر آپ اور آپ کے والدین اس پر اعتماد

Marfat.com

کریں گے تو ان شاء اللہ ان کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچے گی۔۔۔۔۔"

میں نے فوراً اس کا جواب لکھا:

"آپ نے مجھے جس مدد کی پیشکش کی ہے اس پر میں دل کی گہرائیوں سے آپ کی شکر گزار ہوں۔ یہ محض اللہ کی عنایت ہے کہ اپنی جدوجہد میں، میں اکیلی نہیں ہوں۔ اللہ آپ پر مہربان رہے۔۔۔۔"

مولانا مودودی نے جواب دیا:

"مجھے آپ کا 7 اپریل کا لکھا ہوا خط کل ملا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میرا مشورہ قبول کرتے ہوئے پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ آپ کو یہ سمجھنے میں رہنمائی کرے کہ آپ کے لیے بہتری کس میں ہے اور آپ کا بہترین مفاد کس میں ہے۔ میری رائے بھی یہی ہے کہ آپ بحری جہاز سے سفر کریں۔ ایک تو یہ کہ آپ کو سستا پڑے گا، دوسرے آپ بحری سفر میں اپنا زیادہ سے زیادہ سامان لا سکتی ہیں۔ آپ کراچی اتریں گی اور وہاں سے بذریعہ ریل لاہور آئیں گی۔ لاہور سے کراچی چھ سو میل دور ہے۔ لاہور سٹیشن پر یا تو میں خود آپ کو لینے آؤں گا یا میرے سیکرٹری ملک غلام علی وہاں موجود ہوں گے اور آپ کو میرے گھر لے آئیں گے۔ بہتر ہوگا کہ جون کے تیسرے ہفتے سے زیادہ تاخیر نہ ہو۔ میرا جولائی کے وسط میں افریقہ جانے کا ارادہ ہے۔ آپ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار رہیں کہ جب آپ لاہور پہنچیں گی تو ملک کا یہ حصہ اس وقت سخت گرمی کی لپیٹ میں ہوگا۔ جون جولائی اور اگست میں گرمی اپنے عروج پر ہوتی ہے اور درجہ حرارت 120 ڈگری فارن ہائٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ ہمارے پاس ایئر کنڈیشنر نہیں ہیں لیکن بجلی کے پنکھے ضرور ہیں۔ بعد میں تو خیر آپ ہمارے موسموں کی عادی ہو جائیں گی لیکن ذہنی طور پر اس انتہائی گرم موسم کا پہلا حملہ برداشت کرنے کے لیے تیار رہیں۔ آپ اپنا وہ سارا ضروری سامان ساتھ لائیں جو آسانی سے لا سکتی ہیں۔ بھاری کسٹم ڈیوٹی کی وجہ سے غیر ملکی اشیاء کی قیمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ آپ امریکہ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ اس لیے کوئی ایسی چیز چھوڑ کر مت آئیں جس

Marfat.com

کی آپ کو یہاں ضرورت پڑسکتی ہے۔ یہ مت سوچیں کہ یہ چیزیں آپ بآسانی پاکستان سے خرید لیں گی۔ ہمارے رہن سہن کے طریقے اور معاشرتی حالات امریکی طرز زندگی سے بہت مختلف ہیں۔ ہمیں یہاں بہت سی وہ سہولتیں حاصل نہیں ہیں جو امریکہ میں عام میسر ہیں۔ زبان کا اختلاف بھی کسی حد تک آپ کو پریشان کرے گا۔ جب تک آپ خود کو ہمارے طرز زندگی پر ڈھالنے اور اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ مرنے جینے کا مصمم ارادہ نہ کرلیں، آپ کو ابتدائی مرحلوں میں آنے والی مشکلات سے سمجھوتا کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آسکتی ہیں۔ آپ کے والدین کو میں ایک الگ خط لکھ رہا ہوں۔ لیکن بہتر ہے کہ آپ میرا تعارف ان سے کروائیں اور ہمارے درمیان ہونے والی خط وکتابت کا خلاصہ انہیں سنائیں یا پڑھوائیں تاکہ وہ میرے خط کے پس منظر کو پوری طرح سمجھ سکیں۔۔۔"

جب آپ ٹرنیڈاد اور ٹوبیگو میں تعطیلات گزار کر واپس آئے اور آپ نے میرے فیصلے پر نہ کوئی اعتراض کیا نہ روڑے اٹکائے بلکہ مولانا کی پیشکش کا جو جواب دیا تھا، مجھے دکھایا تو مجھے انتہائی خوشی ہوئی۔ آپ نے انہیں لکھا تھا:

"میں آپ کے 18 اپریل کو لکھے گئے اس خط کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں جس میں آپ نے میری بیٹی کو اپنے گھر میں ٹھہرنے کی دعوت دی ہے۔ میں اور میری اہلیہ آپ کی شاندار مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوئے۔ جب سے وہ مسلمان ہوئی ہے، ایک راسخ العقیدہ لڑکی بن گئی ہے اور ایسے شخص کا ہمارے معاشرے میں رہنا عملی مشکلات کو جنم دیتا ہے۔ مارگریٹ آپ کی پیشکش قبول کرنے کے لیے بے چین ہے اور ہم اس کے اس فیصلے پر صاد کرتے ہیں اگرچہ وہ ہم سے بہت دور ہو جائے گی۔ اس کے جوش و جذبے کو دیکھتے ہوئے ہمیں امید ہے کہ یہ تبدیلی اسے خوشگوار اور بامعنی زندگی گزارنے کا موقع دے گی۔ وہ ہماری مکمل رضامندی سے آپ کے ملک آرہی ہے۔ وہ بے داغ کردار کی مالک ہے اور ہم اس کی فلاح و بہبود کے لیے مستقل رابطہ رکھیں گے۔ براہ مہربانی آپ جب بھی چاہیں، مجھے خط لکھیں۔ دل کی گہرائیوں سے آپ کا، آپ کی

Marfat.com

بیوی اور بچوں کا شکریہ، بہت بہت، اور اس شکریے کی ادائیگی میں میری اہلیہ میرے ساتھ ہیں۔"

ایک مایوس کن صورت حال سے نکلنے کا راستہ پانے اور بہتر مستقبل کا دروازہ چوپٹ کھلا پانے کے بعد میں نے سفر کی تیاری میں جو چھ ہفتے گزارے، اس دوران میں مسرت وانبساط سے سرشار رہی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ یہ میری زندگی کا اہم موڑ اور فیصلہ کن مرحلہ ہے۔ بارہ سال کی عمر سے اب تک جبکہ میری اٹھائیسویں سالگرہ سر پر تھی، جوانی کی اٹھان کا یہ سارا عرصہ میں نے امریکی طرز زندگی کے عام رواج سے ہٹ کر غیر یقینی صورت حال میں گزارا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے لگتا تھا کہ اس طویل عرصے میں، میں نے صحیح معنوں میں زندگی نہیں گزاری بلکہ کسی نہ کسی طرح محض وقت کاٹنے کی کوشش کی ہے۔ میں اپنے کمرے میں تنہا، اپنی کتابوں کے ساتھ مگن رہتی تھی اور اپنے خاندان اور قریبی رشتے داروں کے سوا میرا کسی سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ مولانا مودودی نے مجھے ایک ایسا راستہ دکھا دیا تھا جس پر چل کر میں اس خوفناک انجام سے بچ سکتی تھی جو امریکہ میں رہتے ہوئے میرے لیے ناگزیر تھا۔ میں جلد از جلد اس راستے پر جانے کے لیے بے تاب تھی۔ عمر کے تیسویں سال میں داخل ہوتے ہوئے مجھے شدت سے احساس تھا کہ میری جوانی ختم ہونے کو ہے اور میں بروقت امریکہ سے نکل رہی ہوں۔

اس فیصلے کے بعد کئی ہفتے طویل سفر کی تیاریوں کی بھاگ دوڑ میں گزرے۔ سب سے پہلا شخص، جن سے میں نے رابطہ کیا، پاکستان ہاؤس کے مسٹر چودھری تھے۔ میں نے انہیں ویزے کے لیے کہا انھوں نے وعدہ کیا کہ بآسانی مل جائے گا۔ انہوں نے بحری سفر کا انتظام کرنے کی پیشکش بھی کی جو میری خواہش بھی تھی کیونکہ یہ سستا ترین ذریعہ سفر تھا۔ انہوں نے ایک یونانی جہاز ران کمپنی "دی ہیلینک لائنز" کے ایک جہاز میں میری نشست مخصوص کروا دی۔ میں بالکل ناتجربہ کار تھی۔ اس انتخاب کی حکمت پر کوئی شک کیے بغیر میں نے بنک سے اپنی ساری رقم نکلوائی اور 475 ڈالر کمپنی کو بھجوا دیے۔ اس کے ساتھ میں نے پاسپورٹ کے لیے درخواست دی۔ مارتھا واشنگٹن

Marfat.com

ہوٹل سے وابستہ ایک ڈاکٹر سے ٹیکے لگوانے کا وقت لیا۔ مجھے سفر کی اجازت نہ ملتی جب تک میں ٹائیفائڈ، چیچک اور زرد بخار کے ٹیکے نہ لگواتی۔ بعض ٹیکوں سے میری طبیعت سخت خراب ہوئی۔ خاص کر ٹائیفائڈ کے ٹیکے سے، جس سے میرے پورے بازو میں شدید درد ہوا اور بخار بھی ہو گیا، لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی اور سفر کی تیاریوں اور ضروری چیزوں کی خریداری میں مصروف رہی۔

گمبلز ڈیپارٹمنٹ سٹور سے میں نے کاٹن کا دبیز کپڑا خریدا جس پر خوبصورت ڈیزائن تھے۔ میرے پاس نہ سلائی کی مشین تھی نہ مجھے اس پر سینا آتا تھا۔ چنانچہ ہاتھ سے میں نے پانچ سکرٹ سیے، جن کی لمبائی ٹخنوں تک تھی۔ اتنے ہی بلاؤز سیے جو بند گلے کے تھے اور جن کی آستینیں کلائیوں تک تھیں۔ پھر میں نے سر ڈھانپنے کے لیے بڑے بڑے سکارف خریدے۔ ان سے میں نے حجاب بنانا تھا۔ کیونکہ اسلام میں عورت کے لیے ضروری ہے کہ چہرے، ہاتھوں اور پیروں کے سوا، وہ اپنے جسم کا ہر حصہ ڈھانپ کر رکھے۔ جب تک چلتے، میں نے یہی کپڑے پہننے تھے اور پھر پاکستانی لباس۔ اسلام خواتین سے جس حیا کا تقاضا کرتا ہے، امریکی فیشن کے لباس اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ چنانچہ میں نے اپنی ساری امریکی فراکیں ملنے جلنے والوں میں تقسیم کر دیں۔ جوتوں کے لیے نیو یارک کے ففتھ ایوینیو کے ایک بہترین سٹور پر گئی اور دس ڈالروں کے چمڑے کے موٹے تلے والے جوتے، نیچی ایڑی اور گول پنجوں والے سینڈل اور مکیشن کا ایک پائیدار جوڑا خریدا۔ پھر دوبارہ میں تہ خانے میں بنے ہوئے گمبلز کے سستے سٹور پر گئی اور سیل پر لگے ہوئے دو تین موٹے اونی سویٹر خریدے جو مجھے صرف دو دو ڈالر میں مل گئے۔ گھٹنوں تک کی چار موٹی جرابیں خریدیں۔ چاروں جرابیں مجھے ایک ڈالر میں مل گئیں۔ مجھے مسٹر چودھری نے بتایا تھا کہ موسم سرما میں لاہور میں بڑی سخت سردی پڑتی ہے اور امریکہ کی طرح گھروں میں سنٹرل ہیٹنگ کا کوئی انتظام نہیں ہوتا، تو میں بر وقت موسم سرما کی سیل کی دکانوں پر پہنچی جہاں سے پندرہ ڈالروں میں ایک بہت اچھا سلا ہوا بھاری کوٹ مل گیا۔ پھر میں "وول ورتھس فائیو" اور

Marfat.com

"ٹین سینٹ سنٹر" گئی جہاں سے مختلف رنگوں کے کاٹن اور ریشمی دھاگے، سوئیاں، قینچیاں، ٹیپ، انگشتہ اور اسی طرح کی دوسری چیزیں خریدیں جو سلائی کے کام آتیں اور جن کی مدد سے میں اپنے پھٹے ہوئے کپڑے سی سکتی تھی۔ آخر میں، میں پھر گمبلز سٹور پر گئی اور وہاں سے دو بڑے لیکن وزن میں ہلکے سوٹ کیس خریدے جو تھے تو فضائی سفر کے لیے لیکن میرا سامان ان میں بخوبی سما سکتا تھا۔ پھر میں نے کینوس کا بھورے رنگ کا چھوٹا سا بیگ خریدا جس میں بالوں کا برش، کنگھا، سلائی کی چیزیں، چند چھوٹی چھوٹی کتابیں اور ضرورت کی دوسری چیزیں رکھی جا سکتی تھیں۔

مجھے ٹائپ رائٹر کا مسئلہ بھی حل کرنا تھا۔ جو میرے پاس موجود تھا، وہ کافی بڑا اور بھاری تھا۔ اسے ساتھ لے جانا مشکل تھا۔ اگر اسے بک کرواتی تو کافی مہنگا پڑتا۔ ایک ہی حل تھا کہ میں اسے بیچ کر کوئی ہلکا ٹائپ رائٹر خریدوں جسے بآسانی اٹھایا جا سکے۔ مارتھا واشنگٹن ہوٹل کے بالکل قریب، جہاں میں رہتی تھی، دفتروں میں استعمال ہونے والی مشینوں اور ٹائپ رائٹروں کا سٹور تھا۔ میں جلدی میں تھی اور یہ سٹور میرے قریب بھی تھا۔ میں اس کے مالک سے ملی جو ادھیڑ عمر کا ایک یہودی تھا۔ اس کا کاروبار بہت مختصر تھا۔ اس کے پاس کوئی ملازم بھی نہیں تھا۔ سارے کام خود ہی کرتا تھا۔ مجھے زندگی میں اس جیسا شاندار اور دیانتدار کاروباری آدمی نہیں ملا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں سیکنڈ ہینڈ سمتھ کرونا کا ٹائپ رائٹر خریدلوں جو بڑا پائیدار تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ زندگی بھر چلے گا اور اس میں خرابیاں پیدا ہونے کے امکانات بہت کم ہیں۔ اس کی قیمت اس نے پچاس ڈالر بتائی لیکن یہ مجھے پچیس ڈالر میں پڑا کیونکہ میرا ٹائپ رائٹر اس نے پچیس ڈالر میں خرید لیا۔ یہ ٹائپ رائٹر ابھی تک میرے پاس ہے اور تسلی بخش کام کر رہا ہے بلکہ کئی لحاظ سے میرے پرانے ٹائپ رائٹر سے بہتر ہے۔

اپنی روانگی سے دو ہفتے پہلے میرے دوستوں اور خیر خواہوں کے کئی ٹیلیفون آئے۔ لندن سے "مسلم نیوز انٹرنیشنل" کے سرپرست احمد باوانی کا فون آیا اور انہوں نے درخواست کی کہ میں فوراً لندن پہنچوں اور ان کے میگزین کے ادارتی عملے کی نگرانی

Marfat.com

سنبھالوں لیکن میں نے بڑی نرمی سے معذرت کر لی چونکہ میں مولانا مودودی کی پیشکش کو ترجیح دیتی تھی۔ تاہم میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں ہر مہینے ان کے رسالے کے لیے کوئی نہ کوئی مضمون بھیجا کروں گی۔ میں نے یہ وعدہ بڑے اہتمام سے نبھایا۔ پھر کینیڈا کے شہر مونٹریال سے مجھے ظفر اسحاق انصاری کا فون آیا۔ وہ کراچی سے نکلنے والے رسالے "وائس آف اسلام" کے مدیر رہے ہیں اور ان دنوں میک گل یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انہوں نے میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا لیکن ساتھ ساتھ تنبیہ بھی کی کہ جب تک میں پاکستان کے لوگوں کے اطوار و آداب نہ سمجھ لوں، مجھے وہاں کی زندگی سے ہم آہنگ ہونے میں مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ ان کی تنبیہ بالکل درست ثابت ہوئی۔ پھر ہاورڈ یونیورسٹی سے محمد احمد اکبر کا فون آیا جو حسن البناء کی جماعت اخوان المسلمون سے منسلک تھے۔ انہوں نے مجھے الوداع کہا اور مولانا مودودی کو سلام بھجوایا۔ کچھ دنوں بعد مجھے ایک لفافہ ملا جس پر جوابی پتہ نہیں لکھا تھا۔ اس میں سو ڈالر کا چیک تھا اور ایک سادہ سا رقعہ جس پر صرف یہ لکھا تھا، "آپ کے مسلمان بھائی!"

امریکہ میں آخری ہفتہ میں نے اپنی سہیلی خدیجہ فیصل کے ساتھ گزارا جو اسلامک مشن سے وابستہ تھیں اور عیدالاضحیٰ کی نماز کے لیے آنے والوں کے لیے زبردست ڈنر کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ میں نے ممکنہ حد تک ان کا ہاتھ بٹایا۔ عیدالاضحیٰ میں نے اپنی ایک گہری سہیلی بلقیس کے ساتھ گزاری اور اس کے مدعو مہمانوں اور بچوں کے ساتھ مل کر زبردست ڈنر کیا۔

عید کا خوش باش دن گزارنے کے بعد بروکلین سے واپس اپنے ہوٹل آتے ہوئے میرے سر میں شدید درد اٹھا۔ کافی بے چین رہنے کے بعد میں چند گھنٹوں کے لیے سو گئی۔ رات دو بجے پیٹ میں شدید درد کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے الٹیاں بھی آرہی تھی اور پیچش بھی لگ گئی تھی۔ جب میری حالت نہ سنبھلی بلکہ خراب سے خراب تر ہوتی گئی تو میں نے فون کا چونگا اٹھایا اور بمشکل بتایا کہ مجھے کسی ڈاکٹر کی سخت ضرورت

Marfat.com

ہے۔ اس نے مجھے کچھ گولیاں دیں اور ٹیکے لگائے اور بتایا کہ جسم میں پانی کی شدید کمی واقع ہوگئی ہے اور پیٹ کا درد اور اسہال صبح تک ٹھیک نہ ہوئے تو مجھے ٹیکوں کے ذریعے سے خوراک کی فراہمی کے لیے "بیلویو ہسپتال" لے جانا پڑے گا، ورنہ زندگی خطرے میں ہوگی۔ میں نے ڈاکٹر کو بتایا کہ میں بیلویو ہسپتال نہیں جاسکتی کیونکہ ایک بحری جہاز میں پاکستان جانے کے لیے میری نشست محفوظ تھی اور وہ جہاز دو دنوں میں روانہ ہونے والا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اس نے صبح ایمبولینس منگوائی ہے اور میری نازک صورت حال کے پیش نظر مجھے بیلویو لے جایا جائے گا۔ تاہم صبح تک میری حالت کافی سنبھل گئی اور ڈاکٹر نے بتایا کہ مجھے ہسپتال جانے کی ضرورت نہیں۔ اس نے مجھے کچھ اور گولیاں دیں اور ٹیکے لگائے۔ دن کا باقی حصہ میں نے بستر میں ہی گزارا۔ مجھے سخت بخار تھا اور مجھ پر ایسی غنودگی طاری تھی کہ مجھے اردگرد کے کمروں سے آنے والوں کا کچھ پتہ نہیں چلا جنہیں میری حالت پر سخت تشویش تھی۔ میرے ساتھ والے کمرے میں ایک سیاہ فام عورت رہتی تھی جو ایک فیکٹری میں سلائی کا کام کرتی تھی۔ اس نے اس دن چھٹی لے اور سارا دن میری تیمارداری میں گزارا۔ وہی میرا کھانا بھی کمرے میں لاتی رہی۔ وہ کٹر کیتھولک عیسائی تھی اور اس نے مجھ سے اجازت چاہی کہ وہ اصطباغ کے روحانی عمل یا قریب الموت افراد کو دیے جانے والے انضماد کے عمل کے لیے کسی پادری کو بلالے لیکن میں نے اسے بتایا کہ میں مسلمان ہوں۔ شام کو میں نے ہوٹل کے صفائی کے عملے کو بلوایا اور الٹیوں سے کمرے میں جو گندگی پھیل گئی تھی، صاف کروائی۔ اس کے لیے میں نے انہیں پانچ ڈالر ادا کیے۔ دوسری صبح مجھے اتنی کمزوری لاحق تھی کہ میں اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتی تھی لیکن میں زبردستی اٹھی اور دو چار قدم چلی پھری۔ مجھے معلوم نہیں کہ اتنی ہمت مجھ میں کہاں سے آگئی تھی۔ بخار اتر چکا تھا لیکن کمزوری باقی تھی۔ مجھے جلد از جلد افاقہ چاہیے تھا کیونکہ دوسرے دن ہیلینک ٹارچ کی روانگی تھی۔ مجھے ڈاکٹر کو آدھی رات کو آنے پر پچاس ڈالر ادا کرنے تھے۔ یہاں کسی مسلمان بھائی کے بھیجے ہوئے پیسے کام آئے۔ امی، ابو! آپ کو میری اس بیماری کا کچھ علم نہیں کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے آپ کو

Marfat.com

بتایا تو آپ کو سخت تشویش ہوگی اور شاید آپ مجھے جہاز پر جانے سے روک دیں۔ معجزہ یہ ہوا کہ اتنی مہلک بیماری کے باوجود، جس سے میری جان کے لالے پڑ گئے تھے، میں صرف دو دن بستر پر رہی۔ تیسرے دن اگرچہ میری رنگت زرد تھی لیکن ویسے میں مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی تھی۔ یہ ان چند معجزوں میں سے ایک ہے جن کے مجھے تجربے ہوئے۔ پاکستان کے سفر کے چھ ہفتوں کے دوران میں سمندری متلی کے سوا میری طبیعت بالکل ٹھیک رہی۔ یہ یقیناً خوش قسمتی تھی اور سراسر اللہ کی رحمت کیونکہ جہاز پر کوئی ڈاکٹر میسر تھا نہ طبّی امداد۔

مجھے نہیں یاد کہ مجھے زندگی میں کبھی ایسی گہری جذباتی کشمکش کا سامنا ہوا ہو جیسی میں نے 18 مئی کی رات نو بجے محسوس کی۔ "دی ہیلینک ٹارچ" نیویارک کی بندرگاہ سے نکل رہا تھا، میں عرشے پر کھڑی تھی۔ نیویارک شہر کی روشنیاں مدھم سے مدھم ہوتی جا رہی تھیں اور مجھے پتہ تھا کہ میں پھر کبھی ان ساحلوں کو نہیں دیکھ پاؤں گی۔

میرا خیال ہے، میں نے اپنے پچھلے خط میں ذکر کیا تھا کہ کراچی میں ڈھائی دنوں کے قیام کے دوران میں ایڈووکیٹ عباسی اور ان کی جرمن بیوی لارا نے میری زبردست میزبانی کی۔ میرا خیال تھا کہ لارا میری گہری سہیلی بن گئی ہے۔ چنانچہ جب مجھے یہاں کچھ مسائل پیش آئے تو مشورے کے لیے میں نے اسے خط لکھا۔ اس کے جواب سے مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ اس نے میرے لباس اور رویے پر کڑی تنقید کی۔ اس پر لارا کے لیے میرے سارے پرتپاک جذبات بھک سے اڑ گئے اور اس کے بعد سے ہمارے درمیان کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی۔

مولانا مودودی کی بیٹیاں حمیرا اور اسماء مجھ سے اکثر ذکر کرتی ہیں کہ جب میں اس پاکستانی لباس اور برقع میں جو کراچی میں جماعت اسلامی کی خواتین نے خاص میرے لیے بنایا تھا، لاہور پہنچی تو وہ مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوئی تھیں۔ وہ اور گھر کی دوسری خواتین تو کسی "میم صاحب" کو دیکھنے کی امید لیے بیٹھی تھیں جو مغربی خواتین جیسی نظر آئے اور انہی جیسے لباس میں ہو۔ ان کا خیال تھا کہ میرے بال سنہرے ہوں گے

Marfat.com

اور کٹے ہوئے، آنکھیں نیلی ہوں گی، رنگت بالکل سفید ہوگی، مختصر چست سکرٹ پہنا ہوگا، بازو ننگے ہوں گے، اونچی ایڑیوں والے جوتے ہوں گے۔ انہوں نے جسے دیکھا وہ مضبوط ڈیل ڈول والی کوتاہ قد لڑکی تھی جس کے بال سیاہ تھے، آنکھیں کالی، سامی النسل، یہودی خدوخال والی لڑکی اور وہ بھی برقع میں ملبوس۔ مجھے دیکھ کر ان کا سارا تجسس ہوا ہوگیا کیونکہ میں کسی طرح بھی ان کے" میم صاحب" کے تصور پر پوری نہیں اترتی تھی۔

اپنی نئی فیملی میں ہم آہنگ ہونے کے لیے مجھے کچھ مسائل اور مشکلات کا سامنا ہے، لیکن اس کے باوجود میرے اس یقین اور اعتماد میں قطعاً کوئی کمی نہیں آئی کہ نیویارک کی نسبت میں یہاں بہت بہتر ہوں۔

اپنی ساری محبتوں کے ساتھ

مریم

مریم جمیلہ

Marfat.com

لاہور سے تیسرا خط

مریم جمیلہ
معرفت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
5-اے ذیلدار پارک
اچھرہ لاہور
12 جولائی 1962ء

مسٹر اینڈ مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکڑز، اپارٹمنٹ نمبر 223-C
لارچمونٹ، نیویارک، یو۔ ایس۔ اے

پیاری امی اور ابو!

مولانا مودودی کے گھر پہنچنے کے بعد ایک ہفتے تک مجھے آپ کی طرف سے کوئی خبر نہیں ملی، تو آپ تصور کر سکتے ہیں کہ آپ کا دو جولائی کا خط پانے پر میں کتنی خوش ہوئی ہوں گی۔ میں تو یہ جاننے کے لیے پہلے ہی بے چین تھی اور کزن جم اور سیلیا کے ہاں ارنسٹ کی پیدائش سن کر مجھے بے انتہاء خوشی ہوئی اور میں نے انہیں فوراً مبارکباد کا خط لکھا۔

ابتدائی مشکلات کے بعد اب میں نئے حالات سے مطابقت اختیار کر چکی ہوں اور بہت خوش ہوں۔ میں ابھی تک زیادہ تر وہی کپڑے پہنتی ہوں جو میں نے امریکہ میں خود سیے تھے۔ لیکن اب بیگم مودودی اور ان کی دو بڑی بیٹیاں حمیرا اور اسماء میرے لیے پاکستانی لباس تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ اگرچہ عربی کھانوں کی نسبت میں پاکستانی کھانوں کے زیادہ شوقین نہیں ہوں لیکن اب یہ اچھے لگنے لگے ہیں اور مجھے تیز

Marfat.com

مرچوں اور گرم مسالوں کی عادت ہوگئی ہے۔ اب میں آسانی سے وہ کھانے کھا سکتی ہوں جو باقی فیملی کے لوگ کھاتے ہیں۔ ناشتے میں ہم عام طور پر ایک یا دو انڈے جنہیں تیل میں فرائی کیا جاتا ہے، چپاتیوں کے ساتھ لیتے ہیں۔ یہ چپاتیاں بھس ملے گندم سے بنائے گئے چپٹے کیک کی طرح ہوتی ہیں اور ڈبل روٹی کا نعم البدل ہیں۔ کبھی تلے ہوئے آلو جو سیاہ مرچ میں پکائے جاتے ہیں اور کے ساتھ تیز ذائقے والی دودھ ملی چائے۔ لنچ میں ہم سالن کے ساتھ چپاتیاں لیتے ہیں۔ سالن میں بکری کے گوشت کا شوربہ ہوتا ہے، جس میں شوربا زیادہ اور بوٹیاں کم ہوتی ہیں۔ کبھی دال یا لوبیے کا سالن یا بینگن کا، جس میں مسالے زیادہ پڑے ہوتے ہیں۔ ڈنر بھی لنچ ہی کی طرح ہوتا ہے۔ بس اس میں چاولوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ امریکہ میں جو کھانا کہیں نہیں کھایا جاتا اور میں نے پاکستان آ کر چکھا، وہ یہی بکرے کے گوشت کا سالن ہے۔ یہاں گوشت بہت مہنگا ہے اور زیادہ تر لوگوں کی بساط سے باہر۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمیں یہ میسر ہے۔ ایک پاؤنڈ گوشت کو شوربا بڑھا کر اس طرح پکایا جاتا ہے کہ ہم تیرہ کے لیے کافی ہو جائے۔ دودھ بھی کافی مہنگا ہے چنانچہ اس میں چینی اور پانی ڈال کر اتنا بڑھا لیا جاتا ہے کہ سب کو کافی ہوجائے۔ یہاں دودھ کو امریکہ کی طرح پاسچرائی تطہیر سے نہیں گزارا جاتا لیکن اسے پینے کے قابل بنانے کے لیے خوب ابالا جاتا ہے۔ کبھی کبھی کھانے کے ساتھ آم بھی ہوتے ہیں۔ آم گرم علاقوں کا پھل ہے اور جلد خراب ہوجاتا ہے۔ پاکستان آنے سے قبل میں نے کبھی یہ پھل نہیں چکھا۔ بہت لذیذ ہوتا ہے۔ مٹھائی صرف شادیوں کی تقریب یا مذہبی تہواروں کے موقع پر کھائی جاتی ہے۔ بچے بھی بہت کم ٹافیاں، بسکٹ کیک یا آئس کریم کھاتے ہیں۔ یہ جو پاکستانیوں کے دانت اتنے خوبصورت ہوتے ہیں، یقیناً اس کی ایک وجہ یہی ہے۔ صرف جوانوں ہی کے نہیں بلکہ چالیس پچاس برس کے ادھیڑ عمر لوگوں کے بھی پورے دانت سلامت ہوتے ہیں۔ بہت ہی بوڑھے لوگوں کے دانت نہیں ہوتے۔ مولانا مودودی کے سارے بچوں کے سب دانت سلامت ہیں جبکہ کوئی ایک بھی کبھی کسی ڈنٹسٹ کے پاس نہیں گیا۔ یہاں دانتوں کا علاج بہت کم

Marfat.com

میسر ہے اس لیے میں ہر کھانے کے بعد دانت صاف کرتی ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ اگر میں لاپروائی برتوں گی تو دانتوں سے محروم ہو جاؤں گی۔ ناشتہ ہم صبح ساڑھے چھ سے سات بجے کے درمیان کرتے ہیں۔ لنچ دوپہر کو اور ڈنر ساڑھے آٹھ بجے کے بعد بلکہ کبھی کبھی دس بجے تک کیا جاتا ہے۔ جیسا میں نے پچھلے خط میں ذکر کیا تھا، ہم کھانا ہاتھوں سے کھاتے ہیں، کبھی کبھار چمچ بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ میز پر چھریاں نہیں ہوتیں اور جہاں تک کانٹوں کا تعلق ہے، لوگوں کو پتہ ہی نہیں کہ وہ کیا ہوتے ہیں۔ ہمارا کھانے کا کمرہ باورچی خانے کے ساتھ ہی ہے۔ اس میں لکڑی کی ایک میز ہے جس پر سرخ رنگ کی پلاسٹک شیٹ بچھی رہتی ہے۔ سیدھی پشت والی لکڑی کی کرسیاں ہیں۔ اگرچہ ہم کھانا ہاتھوں سے کھاتے ہیں لیکن عربوں کی طرح ایک ڈش سے نہیں بلکہ ہر فرد کی پلیٹ علیحدہ ہوتی ہے۔ مولانا مودودی اور ان کی بیگم کو ایک مہنگا شوق ہے، پان کا۔ ایک پاؤنڈ پان بیس روپے یعنی تقریباً پانچ ڈالروں میں آتے ہیں۔ بیگم مودودی تو صرف کھانے کے بعد پان کھاتی ہیں لیکن مولانا مودودی سارا دن پان چباتے ہیں۔ چبانے کے لیے پان تیار کرنا ایک تفصیلی، مشقت طلب کام ہے اور اس کے لیے ضروری ساز و سامان چاندی کے ایک خوبصورت منقش بکس (پان دان) میں رکھا جاتا ہے۔ سب سے پہلے بیگم مودودی عام سا نظر آنے والا پان کا پتا اٹھاتی ہیں، اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹتی ہیں، پھر ہر ٹکڑے پر سرخ رنگ کی لبدی (جو کسی درخت کا رس ہوتا ہے) لگاتی ہیں، اس پر تمباکو چھڑکتی ہیں پھر اسے تہ کر دیا جاتا ہے اور یہ کھانے کے لیے تیار ہے۔☆ ایک پان تقریباً تین گھنٹے چلتا ہے۔ کھانے والے کا منہ اور ہونٹ کتھے سے سرخ ہو جاتے ہیں۔ تھوکنے کے لیے مولانا مودودی کے پاس چاندی کا ایک بڑا خوبصورت پیک دان ہے۔

☆ مصنفہ نے یا تو مشاہدہ نہیں کیا یا ذکر کرنا بھول گئیں، پان میں چونا اور چھالیہ بھی استعمال ہوتا ہے۔

ہمارا گھر کافی بڑا ہے۔ سیمنٹ اور پتھروں سے بنا ہے۔ ایک امریکن کو جو امریکی باورچی خانوں کا عادی ہو، ہمارا باورچی خانہ شاید قدیمی عہد کا نظر آئے۔ انگیٹھی ایسی

Marfat.com

ہے جیسے کھلی جگہوں پر آگ جلانے کی جگہ ہوتی ہے۔ کھانے پکانے کا کام فرش پر بیٹھ کر کرنا پڑتا ہے۔ جیسے آپ امریکہ میں پکے پکائے کھانے خرید لیتے ہیں، برف میں منجمد یا بند ڈبوں میں محفوظ، یہاں اس کا کوئی تصور نہیں۔ ہر کھانا ابتدا سے پکانا پڑتا ہے اور ہر کھانے کی تیاری میں گھنٹوں صرف ہو جاتے ہیں۔ نمک ڈلیوں کی شکل میں ملتا ہے اور کسی چٹان کے پتھروں کی طرح ہوتا ہے۔ اسے کھانے کے قابل بنانے کے لیے پتھروں کے سل بٹے پر پیسا جاتا ہے۔ تاہم ڈائننگ روم میں ہمارے پاس ویسٹنگ ہاؤس کا ایک خوبصورت امریکی فرج ہے۔ دو باتھ روم ہیں۔ ایک اوپر والی منزل کے لیے اور ایک نیچے۔ ٹائلٹوں میں پیشاب دان استعمال ہوتے ہیں جنہیں خاکروب دن میں دو مرتبہ صاف کر جاتا ہے۔ ان کے مقابل ایک شاور نصب ہے جو شاید ہی کبھی چلتا ہو۔ پانی کا نلکا بھی ہے، گرم پانی کا کوئی انتظام موجود نہیں ہے۔ البتہ گرمیوں میں نہانے کے لیے نلکے سے جو پانی آتا ہے وہ خوش گوار اور نیم گرم ہوتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ پمپنگ سسٹم اکثر ناکارہ ہو جاتا ہے اور دن کے اکثر اوقات میں نلکے میں پانی نہیں آتا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ میں نہا رہی ہوں، پورے جسم پر صابن ملا ہوا ہے اور پانی بند ہو گیا۔ یہاں پانی بہت نایاب ہے، خاص طور پر گرمیوں میں۔ اتنا قیمتی کہ اسے ضائع نہیں کیا جاسکتا۔ تین چار سونے کے کمرے ہیں جن میں بہت کم فرنیچر ہے۔ بھارتی اور پاکستانی اٹاٹ بھرے ہوئے کمرے پسند نہیں کرتے۔ ہمارے بستر کم اونچائی والے لکڑی کے فریموں کے بنے ہوئے ہیں جو ایک خاص طرح کی ڈوریوں (بان مراد ہے) اور رسی سے بنے جاتے ہیں۔ اس پر دریاں اور چادریں بچھائی جاتی ہیں اور ان پر ہم سوتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں جو شیٹ یا گدے استعمال ہوتے ہیں، ان کا یہاں کوئی رواج نہیں۔ تاہم سردیوں میں گھر کی بنی ہوئی رضائیاں استعمال ہوتی ہیں۔ مجھے ڈوریوں اور رسیوں سے بنے ہوئے بستر آرام دہ لگتے ہیں اور میں ویسے ہی آرام سے سو جاتی ہوں جیسے میں گھر میں اپنے بستر پر سوتی تھی۔ کپڑوں کی الماریوں کا بھی کوئی رواج نہیں۔ تمام کپڑے ٹین کے بکسوں میں رکھے جاتے ہیں۔ درجہ حرارت 100

Marfat.com

ڈگری فارن ہائٹ سے بھی زیادہ ہوتا ہے لیکن یہ گرمی مجھے تنگ نہیں کرتی کیونکہ میں دھوپ میں نکلتی ہی نہیں۔ ویسے ہر کمرے میں ایک بڑا بجلی کا پنکھا ہے جس سے کافی آرام رہتا ہے۔ رات کو ہر کوئی ستاروں بھرے آسمان کے نیچے صحن میں سوتا ہے۔ یہاں پاکستان میں رواج ہے کہ موسم گرما میں دن کا زیادہ گرم حصہ، عموماً دوپہر ایک بجے سے شام پانچ بجے تک، سوکر گزارتے ہیں۔ میں اس رواج سے بہت خوش ہوں کیونکہ میں ہمیشہ سے دوپہر کو جھپکی لگانا پسند کرتی ہوں۔ مولانا کو چھوڑ کر گھر کے سارے افراد ایک بڑے کمرے میں جمع ہو جاتے ہیں جہاں فرشی بستر اور تکیے لگے ہوتے ہیں۔ ہر شخص لیٹ جاتا ہے اور گہری نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔

پہلے ہفتے کے دوران میں مجھے وقت کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ میری ہاتھ کی گھڑی پورٹ سوڈان میں ٹوٹ گئی تھی جو میں نے مرمت کے لیے مولانا مودودی کو دی تھی۔ یہاں گھر کے کمروں میں باوا آدم کے زمانے کے کئی گھڑیال لگے ہوئے ہیں لیکن زیادہ تر خراب ہیں اور ہر گھڑیال مختلف وقت بتاتا ہے۔ ویسے بھی ہمارا وقت مشینی گھڑیوں کے مطابق نہیں بلکہ نماز کے لیے پکار یعنی اذانوں کے حساب سے گزرتا ہے۔

مولانا مودودی نے یہ سوچ کر کہ اتنے طویل سفر کے بعد مجھے مکمل آرام کی ضرورت ہوگی، مجھے ایک الگ کمرہ دیا ہے۔ یہ باقاعدہ بیڈ روم نہیں ہے۔ تمام بیڈ روم گھرے ہوئے ہیں اور کوئی بھی خالی نہیں کروایا جا سکتا۔ میرا کمرہ مولانا مودودی کی لائبریری سے ملحق ایک راہداری میں ہے۔ اس کا فرش سیمنٹ کا ہے۔ چھت کا بجلی کا پنکھا ہے اور روشنی کے لیے بجلی کا ایک ننگا بلب ہے۔ دیواروں پر، قطار در قطار فرش سے چھت تک لکڑی کے شیلف ہیں جن میں ہزاروں کتابیں ہیں جو مولانا مودودی کی لائبریری کا حصہ ہیں۔ کتابیں ہی کتابیں، انگریزی، عربی، فارسی اور اردو میں۔ ان کے علاوہ شیلف میں دنیا بھر سے آئے ہوئے رسالے رکھے ہیں۔ مولانا مودودی نے اپنی کتابوں کا ایک شیلف میرے لیے خالی کر دیا جہاں میں نے اپنی کتابیں اور کپڑے رکھے ہوئے ہیں۔ میرے سردیوں کے بھاری کوٹ اور سویٹر سوٹ کیس میں بند ہیں جو

Marfat.com

میری چارپائی کے نیچے پڑا رہتا ہے۔ میرے ٹائپ رائٹر رکھنے کو مجھے ایک چھوٹی سی میز اور سیدھی پشت والی ایک کرسی بھی مہیا کی گئی ہے۔ یہ میرا "دفتر" ہے۔ میں اپنی ساری لکھائی پڑھائی اور خط و کتابت یہیں بیٹھ کر کرتی ہوں۔ مجھے اپنا کمرہ بہت پسند ہے کیونکہ میں اتنی ڈھیر ساری کتابوں کے درمیان سونا پسند کرتی ہوں، اس اطمینان کے ساتھ کہ یہ ساری کتابیں میری دسترس میں ہیں اور میں جب چاہوں ان سے استفادہ کر سکتی ہوں۔

ویکیوم کلینز یا قالین صاف کرنے والی مشین کے بغیر گھر کی صفائی کا عمل بڑا سادہ ہے۔ گرد و غبار دور کرنے کے لیے کپڑے کا ایک ٹکڑا ایک لمبے ڈنڈے کے سرے سے باندھ دیا جاتا ہے اور اس ڈنڈے کی مدد سے آپ کپڑے کو فرش پر خوب رگڑتے ہیں۔ فرش کو گرد و غبار سے صاف کرنے کے لیے آپ تنکوں کا ایک بنڈل لے کر اسے کسی رسی سے باندھ لیتے ہیں اور یہ ایک جھاڑو بن جاتی ہے۔ اس میں کوئی دستہ نہیں ہوتا اور جھاڑو دینے کے لیے آپ کو ایڑیوں کے بل زمین پر بیٹھنا پڑتا ہے۔

ہمارے گھر کے سامنے ایک وسیع باغ ہے جس میں جھاڑیاں ہیں، گملوں میں پودے ہیں اور ہری بھری گھاس کا ایک لان۔ یہاں کے پودے اور جانور نیویارک سے بہت مختلف ہیں۔ یہاں کی گلہریوں کی کھال سمور جیسی ہوتی ہے اور ان کی پشت پر کالے اور سیاہ رنگ کی دھاریاں ہوتی ہیں۔ یہ چھوٹی سی مخلوق ہے بڑی چنچل۔ میں اکثر تین چار گلہریوں کو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے، درختوں پر اترتے چڑھتے دیکھتی ہوں۔ پھر بہت ہی خوبصورت چھوٹی چھوٹی چڑیاں جو کھانے پینے کی گری ہوئی چیزیں چگنے کچن میں آتی رہتی ہیں۔ یہ شمالی امریکہ کی پھدکیوں جیسی ہوتی ہیں۔ سیاہ رنگ کے کوے کافی بڑے ہیں، ان کی چونچیں کافی سخت اور آواز بڑی کریہہ ہوتی ہے۔ ہم اکثر آسمان پر چیلوں اور گدھوں کو بھی اڑتا دیکھتے ہیں جو کسی مردہ جانور کی تلاش میں ادھر ادھر منڈلاتے رہتے ہیں۔ ان گدھوں اور چیلوں کو لاہور میں کھانے کی کوئی کمی نہیں کیونکہ یہ کوڑے کرکٹ میں سے بھی اپنی خوراک چن لیتے ہیں اور اس طرح گلیاں

Marfat.com

صاف کرنے میں بڑے مستعد کارکن ثابت ہوتے ہیں۔ رات کو مینڈک نمودار ہوتے ہیں اور چاروں طرف پھدکتے پھرتے ہیں۔ یہاں کیڑے مکوڑوں کی بے شمار ورائٹی ہے۔ یہ بڑے بڑے سیاہ مکوڑے، مکھیاں، مکڑیاں، بھنورے، مچھر، بھڑ اور دیگر بہت سی مخلوق جن کا کوئی شمار نہیں۔ ہمارے پڑوس والوں نے مرغوں مرغیوں کا ایک پورا غول پال رکھا ہے جو گھر کے اندر اور باہر آزادانہ مٹر گشت کرتا رہتا ہے۔

یہاں آنے کے بعد میں نے کچھ دنوں ہی میں اردو کے تقریباً پچیس لفظ سیکھ لیے تھے لیکن اس کے بعد ان میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ ان کا خیال ہے کہ میں خود بخود ان کی زبان سیکھ جاؤں گی لیکن میرا خیال ہے کہ جب تک کوئی وقت نکال کر پورے صبر سے مجھے نہ پڑھائے، میں یہ زبان نہیں سیکھ سکتی۔ میں نے سب سے پہلے جو اردو لفظ سیکھا تھا، وہ "پانی" تھا۔ اب تک میں نے جو چند الفاظ سیکھے ہیں وہ کھانے پینے کی چیزوں ہی سے متعلق ہیں۔ یعنی اردو میں، میں صرف کھا پی سکتی ہوں۔ ہر شخص مجھ سے بات چیت کر کے انگریزی سیدھی کرنا چاہتا ہے، مجھے اردو پڑھانے کی فکر کسی کو نہیں۔ بچوں کو چھوڑ کر سبھی تھوڑی بہت انگریزی بول لیتے ہیں لیکن مولانا مودودی سمیت کوئی بھی فرفر انگلش نہیں بولتا۔ مولانا مودودی، ان کی بیگم اور بڑی بیٹیاں برطانوی انگلش کی عادی ہیں اس لیے میری زبان میں آسانی سے ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ مجھ پر یہ انکشاف ہوا تو سخت حیرانی ہوئی کہ مولانا مودودی نے ایک خط بھی مجھے خود نہیں لکھا۔ وہ اردو میں اپنے سیکرٹری ملک غلام علی کو املا کرواتے تھے اور وہ بہت اچھی انگریزی میں ترجمہ کر کے، ٹائپ کر کے مجھے بھیجتے تھے۔

یہاں لاہور میں مسلمان خواتین ساڑھی نہیں پہنتیں کیونکہ اسے ہندو لباس سمجھا جاتا ہے۔ ہم زیادہ تر شلوار قمیص پہنتی ہیں۔ پیروں میں سینڈل اور سروں پر دوپٹے سے لباس مکمل ہوتا ہے۔ اپنی فیملی کی ساری بڑی خواتین کی طرح، میں بھی سخت پردہ کرتی ہوں اور جب باہر جانا ہو تو سر سے پاؤں تک ایک برقع پہنتی ہوں۔ ویسے مجھے کبھی گھر سے باہر گلی تک جانے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ میری ساری ضرورتیں یہیں

Marfat.com

پوری ہو جاتی ہیں۔ ہمارا مذہب عورتوں اور مردوں کو الگ الگ رہنے کی سختی سے تلقین کرتا ہے اور دونوں صنفوں کا آزادانہ میل جول منع ہے۔ سعودی عرب کی طرح یہاں بھی چھوٹی بچیاں بالغ ہونے سے پہلے تک مغربی لباس پہن لیتی ہیں۔ مولانا مودودی اور ان کے بیٹے سفید پائجامے پہنتے ہیں۔ سر پر بکروٹے کی کھال کی خمدار ٹوپیاں (جناح کیپ) پہنتے ہیں۔ زیادہ غریب لوگ دھوتیاں پہنتے ہیں۔ زیادہ تر لباس گھروں میں خواتین ہاتھ سے یا مشین پر سیتی ہیں۔

ہمارا گھرانہ مولانا مودودی، ان کی اہلیہ، ان کے نو بچوں اور دو ملازموں پر مشتمل ہے جو ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ مولانا مودودی 1903ء میں پیدا ہوئے تھے لیکن وہ ساٹھ سال کے بجائے اسّی سال کے لگتے ہیں، ان کے سر اور ڈاڑھی کے بال بالکل سفید ہیں۔ وہ کئی قسم کی دوائیں لیتے ہیں اور ان کے پاس دواؤں کا اتنا ذخیرہ ہے کہ وہ دواؤں کی اچھی بھلی دکان کھول سکتے ہیں۔ وہ طویل عرصے تک جیلوں میں قید رہے ہیں اور 1953ء میں انہیں سزائے موت بھی سنائی گئی تھی۔ قید میں رہنے سے ان کی صحت بری طرح تباہ ہوگئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے کام پہلے سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ صبح سویرے سے لے کر آدھی رات کے بعد تک وہ ملاقات کے لیے آنے والوں سے ملتے ہیں، خط و کتابت میں مصروف رہتے ہیں، لاہور کی مسجدوں میں قرآن و حدیث اور اسلام سے متعلق دیگر موضوعات پر لیکچر دیتے ہیں۔ دو ہفتوں کے بعد وہ تین مہینے کے دورے پر افریقہ جا رہے ہیں۔ میرے یہاں پہنچنے سے چند روز پہلے وہ سعودی عرب کے دورے سے واپس آئے تھے جہاں انہوں نے شاہ عبدالعزیز بن سعود سے مدینے میں ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کے بارے میں تفصیلی تبادلۂ خیال کیا۔ مولانا مودودی شاہ ابن سعود کے قریبی دوست ہیں اور گزشتہ چند سالوں میں چار مرتبہ سعودی عرب جا چکے ہیں۔ مولانا مودودی پاکستان کی اہم شخصیات میں سے ایک ہیں۔ وہ جماعت اسلامی کے سربراہ ہیں جس پر آج کل پابندیاں عائد ہیں۔ یہ جماعت پاکستان کو ایک مکمل اسلامی مملکت بنانے کے لیے کوشاں ہے جس میں قرآن و حدیث ہی ملک کا

Marfat.com

قانون ہو۔ مجھے مولانا مودودی کی بیگم بہت پسند ہیں۔ ان کی عمر چالیس سال ہے لیکن وہ اس سے بڑی دکھائی دیتی ہیں۔ گھر کی ذمہ داریاں نبھانے کے ساتھ ساتھ وہ پڑوس کے کئی گھروں میں قرآن وحدیث کا درس دیتی ہیں اور خواتین انہیں غور سے سنتی ہیں۔ وہ ان دروس میں مجھے ساتھ لے جاتی ہیں۔ خواتین فرش پر بیٹھتی ہیں بعض خواتین کے چھوٹے بچے بھی ان کے ساتھ ہوتے ہیں جنہیں وہ دودھ پلاتی رہتی ہیں۔ درس کے بعد سوال و جواب بھی ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ کئی گھنٹوں تک جاری رہتا ہے۔ مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے کیونکہ میرے پلے کچھ نہیں پڑتا۔

آج ہمارے گھر میں بڑا جوش وخروش ہے۔ کے ایل ایم ایئر لائنز کے ذریعے سے مولانا مودودی کے نام سعودی عرب سے ایک بڑا پیکٹ آیا تھا۔ جب مولانا نے اسے کھولا تو اس میں سے غلاف کعبہ کا ایک بڑا سا سیاہ ٹکڑا نکلا جس پر طلائی دھاگے سے قرآن کی آیات لکھی ہوئی ہیں۔ کسی مسلمان کے لیے اس سے بڑا کوئی تحفہ نہیں ہوسکتا۔ یہ شاہ ابن سعود کی طرف سے مولانا مودودی کے لیے خاص تحفہ تھا اور اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے دل میں مولانا کا کیا مقام ہے۔ اس قیمتی خزانے کو بستر پر پھیلایا گیا جب کہ گھر والے خوش گوار حیرت سے اس کے اردگرد کھڑے تھے۔

عمر فاروق مولانا کا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ ان کے بعد احمد فاروق ہے جس کی عمر تقریباً پچیس سال ہے۔ (عمروں کے بارے میں یہ سب اندازے ہیں کیونکہ یہاں نہ سالگرہ وغیرہ منائی جاتی ہیں نہ ان کا حساب رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے)۔ وہ ڈاکٹر بننے کی تیاریاں کررہا ہے۔ اس کی میڈیکل کی کتابیں پورے گھر میں بکھری رہتی ہیں۔ عمر فاروق پورے انہماک سے عربی کے مطالعے میں مصروف رہتے ہیں۔ میں جب سے آئی ہوں، عمر یا احمد فاروق نے مجھ سے ایک لفظ کی بات نہیں کی نہ میری طرف کوئی توجہ کی۔ وہ مجھے مسلسل نظر انداز کرتے ہیں، جیسے میں ہوں ہی نہیں۔ میں نے جب اس بارے میں بیگم مودودی سے بات کی تو انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ انہیں مجھ پر کوئی اعتراض نہیں ہے ان کا یہ رویہ اس لیے ہے کہ اسلام مردوں کو اجنبی عورتوں سے بات

Marfat.com

چیٹ کرنے سے منع کرتا ہے۔ عمر اور احمد اپنی بہنوں سے بھی کم بات کرتے ہیں لیکن اپنے والد اور امی سے کھل کر بات کرتے ہیں۔ عمر اور احمد کا بہت زیادہ احترام کیا جاتا ہے بلکہ ان کے احترام میں تھوڑا سا خوف بھی شامل ہے کیونکہ وہ اسلامی تعلیمات کی پابندی کرتے ہیں اور بہت راسخ العقیدہ ہیں۔ حمیرا بیس، بائیس سال کی ہیں اور انگریزی ادب میں تخصص حاصل کر رہی ہیں۔ انیس سالہ اسماء معاشیات میں ایم اے کر رہی ہیں۔ میں نے جب مولانا مودودی سے پوچھا کہ ان کی بیٹیوں نے ان مغربی مضامین کا انتخاب کیوں کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ملک میں برطانیہ اور امریکہ کا اتنا گہرا اثر ہے کہ کسی پڑھے لکھے کی اس وقت تک کوئی عزت نہیں کی جاتی جب تک اسے مغربی علوم پر عبور حاصل نہ ہو۔ جو شخص محض علوم اسلامیہ سیکھ لے لیکن اسے انگریزی نہ آتی ہو تو لوگوں کی نظروں میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی نہ وہ اس کا احترام کرتے ہیں۔ اسماء اور حمیرا اور ان کی عمر کی امریکی لڑکیوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ کم گو اور نرم خو ہیں، نفیس عادتوں کی مالک، اپنے والدین کی انتہائی فرمانبردار۔ مولانا مودودی کے بیٹوں میں جو میرے گہرے دوست بنے ہیں اور جنہوں نے ابتدائی دنوں کی مشکلات میں پوری گرمجوشی سے میرا ہمدردانہ ساتھ دیا ہے، اٹھارہ سالہ محمد فاروق اور پندرہ سالہ حیدر فاروق ہیں۔ محمد فاروق ہائی سکول کے آخری سال میں ہے۔ وہ کرکٹ کا چمپئن کھلاڑی ہے، اور روزانہ کھیلنے جاتا ہے۔ بظاہر ہمارے درمیان کوئی دلچسپی مشترک نہیں ہے لیکن وہ بہت نرم طبیعت والا، مشفق انسان ہے۔ میں زیادہ وقت حیدر فاروق کے ساتھ گزارتی ہوں۔ اس کی طبیعت میں بڑی شوخ حس مزاح ہے اور ہمارا وقت بہت اچھا گزرتا ہے۔ ہم زیادہ وقت لان میں بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے گزارتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک ریکٹ ٹوٹ گیا لیکن اس سے حیدر کی حوصلہ شکنی نہیں ہوئی۔ اس نے ایک اور ٹوٹا ہوا ریکٹ اٹھایا اور رسی سے دونوں کو آپس میں باندھ لیا اور یوں ہمارا کھیل جاری رہا۔ دنیا کے باقی بچوں کی طرح حیدر بھی پرندوں اور چھوٹے جانوروں سے پیار کرتا ہے۔ ایک دفعہ اسے کبوتر کا ایک بچہ مل گیا جو ابھی اڑنے کے قابل نہیں تھا۔ اس نے

Marfat.com

ایک ہفتے تک اسے اپنے کمرے میں رکھا، اسے کھلاتا پلاتا رہا اور دیکھ بھال کرتا رہا۔ وہ کل ہی اڑ گیا۔ بیگم مودودی نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ وہ کسی کتیا کے پلّوں کا پورا جھول گھر اٹھا لایا جس پر اس کے والد سخت خفا ہوئے کیونکہ ہمارے مذہب میں کتا نجس ہے اور اسے گھر میں رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔ حیدر مجھے تحفے دیتا رہتا ہے۔ جب میں پہلی دفعہ آئی تو اس نے مجھے ایک انگوٹھی دی جس میں نیلے شیشے کے پتھر کے ارد گرد مصنوعی ہیرے لگے ہوئے تھے۔ دو دنوں میں دو ہیرے گر گئے ہیں لیکن اس کے باوجود انگوٹھی خوبصورت ہے اور میں اسے ہر وقت پہنے رہتی ہوں۔ ان کے بعد دس سالہ خالد ہے جس کی آنکھیں سوئی سوئی رہتی ہیں۔ اس کے پسندیدہ ساتھی اڑوس پڑوس کے غریب خاندانوں کے بچے ہیں جن کے ساتھ اکثر وہ قریبی نہر پر پیراکی کرنے جاتا ہے۔ مولانا مودودی کی سب سے لاڈلی بچی چھ سالہ عائشہ ہے جو پوری فیملی کی "بے بی" ہے۔ وہ کسی چھوٹے بندر کی طرح شرارتی، چنچل اور شوخ ہے۔ اس کے نزدیک میں کوئی "لطیفہ" ہوں۔ پورٹ سوڈان کے امام کی طرح وہ میری انگریزی کی نقلیں اتارتی ہے اور کھکھلا کر ہنستی ہے۔ اس نے حال ہی میں سکول جانا شروع کیا ہے اور وہ اردو اور عربی لکھنا پڑھنا سیکھ رہی ہے۔ ذہن اس کا تیز ہے۔ بچوں کے پاس کسی طرح کے کھلونے نہیں ہیں۔ عائشہ کے پاس کوئی گڑیا تک نہیں ہے اور میرا نہیں خیال ہے کہ اس نے کبھی کوئی گڑیا دیکھی بھی ہو۔ اسے کسی گڑیا گڈے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اسے کھیلنے کے لیے اس کا کزن حسن ہی کافی ہے۔ عائشہ کو چھوٹے بچوں سے بہت لگاؤ ہے اور وہ اپنی ساری شفقتیں حسن پر نچھاور کرتی رہتی ہے۔ اگرچہ وہ خود دبلی پتلی ہے اور حسن موٹا تازہ، لیکن پھر بھی وہ اسے کولہے پر اٹھائے پھرتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اس نے اسے اب گرایا کہ گرایا۔ حسن اتنا توانا اور صحت مند ہے کہ سات مہینے کا ہونے کے باوجود سہارے سے کھڑا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی طرح روتا ہوا بچہ بھی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ رونا اس کا مشغلہ ہے۔ دن رات روتا ہے۔ کبھی کبھار ہی چپ ہوتا ہے اور بغیر دانتوں کے مسکراتا ہے۔

Marfat.com

حسن کی والدہ بالکل ویسی ہی ہے جیسے ایک مسلمان خاتون کو ہونا چاہیے۔ گھر داری کے کاموں میں ماہر ہونے کے علاوہ وہ اردو عربی لکھ پڑھ سکتی ہیں۔ آدھے سے زیادہ قرآن انہیں زبانی یاد ہے۔ اپنا قرآن وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ہیں اور ان کے ہونٹوں پر ہمیشہ تلاوت جاری رہتی ہے۔ وہ صبح سویرے چار بجے اٹھتی ہیں اور فجر کی نماز کے بعد قرآن کی تلاوت کرتی ہیں۔ دن کے باقی حصوں میں بھی تلاوت جاری رہتی ہے۔ وہ گھنٹوں اپنی نماز اور عبادت میں مصروف رہتی ہیں اور اس دوران میں حسن کو بھی تھپکتی رہتی ہیں۔ رات کی نماز کے بعد وہ سو جاتی ہیں اور صبح قرآن پڑھتے ہوئے اٹھتی ہیں جب حسن ان کے پہلو میں مچل رہا ہوتا ہے۔ جب بھی حسن ایسا اشارہ دیتا ہے کہ اسے حاجت محسوس ہو رہی ہے تو وہ اس کا پاجامہ اتارتی ہیں اور ننگے کو لان میں لے جاتی ہیں اور پھر سیٹی بجاتے ہوئے حسن کو اکساتی ہیں کہ وہ فارغ ہو لے۔ "آسمانوں سے نیچے زمین کی طرف" حیدر نے ایک بار تبصرہ کیا۔

جیسا میں نے پہلے ذکر کیا تھا، ہمارے دو ملازم ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ ہماری باورچی ایک بوڑھی خاتون ہے جس کا رنگ سانولا ہے اور چہرے پر ایسے جھریاں پڑی ہوئی ہیں جیسے خشک آلوچہ۔ ان کا نام کریمہ بی بی ہے۔ خاموش رہتی ہیں اور بیگم مودودی کے علاوہ بہت کم کسی اور سے بات کرتی ہیں۔ شاندار باورچی ہیں، اپنے کام میں ماہر اور بہت سلیقہ شعار۔ وہ گزشتہ دس برسوں سے ہمارے ساتھ ہیں۔ دوسرا ملازم بارہ سال کا ایک بچہ ہے جو پنجاب کے کسی گاؤں کے کسی غریب خاندان سے متعلق ہے۔ اس کے والدین اسے سکول تو کیا بھیجتے، وہ اس کی پرورش بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا نام ادریس ہے۔ جب وہ گھر کی صفائی کے کاموں سے فارغ ہوتا ہے تو عائشہ اور خالد کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے۔ وہ بھی حسن سے بہت پیار کرتا ہے۔ ادریس کے علاوہ مولانا مودودی کے سیکرٹری ملک غلام علی اور مولانا مودودی کی کتابوں کے پبلشر میاں طفیل محمد کے بچے بھی اکثر ہمارے گھر آتے رہتے ہیں اور عائشہ اور خالد سے کھیل کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ملازموں پر نہ ڈانٹ ڈپٹ کی جاتی ہے نہ ان سے ملازموں جیسا

Marfat.com

برتاؤ کیا جاتا ہے بلکہ وہ ایک طرح کے گھر کے فرد ہیں۔ گھر کا سارا کام ان کے ذمہ نہیں ہے بلکہ بیگم مودودی اور حسن کی والدہ کام کاج کرتی ہیں۔ حمیرا اور اسماء ان کا ہاتھ بٹاتی ہیں اور ملازم چھوٹے موٹے کاموں میں مدد کرتے ہیں۔

ہمارے ساتھ والے گھر میں صوفیوں کی ایک خوش باش فیملی رہتی ہے۔ ان کے ہاں بچوں کا ہجوم ہے جو اتنا اودھم مچاتے ہیں کہ دس عائشہ مل کر بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ کبھی کبھی وہ گھر کو مسجد کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ پورے لاہور سے صوفی درویش ان کے گھر میں جمع ہوتے ہیں۔ ننگے سر فرش پر ساتھ ساتھ جڑ کر بیٹھتے ہیں اور پھر آگے پیچھے ہلتے ہوئے زور زور سے کچھ پڑھتے ہیں۔ میں نے جب بیگم مودودی سے ان کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے وضاحت کی کہ ان کا یا مولانا مودودی کا ان کے سلسلے سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ شریعت کی صحیح معنوں میں پابندی نہیں کرتے۔

میرے کمرے کے ساتھ ہی مولانا مودودی کا دفتر ہے۔ صبح پانچ بجے سے آدھی رات تک یہ سفید کپڑوں میں ملبوس ڈاڑھی والے لوگوں سے بھرا رہتا ہے۔ چونکہ گھر کی دیواریں دبیز ہیں اور دروازے مضبوط، اس لیے میں ان کی موجودگی سے بالکل پریشان نہیں ہوتی۔ ان کی گفتگو کی بڑی مدھم آوازیں ہم تک پہنچتی ہیں۔ اردو بڑی نرم اور شائستہ زبان ہے۔ یہ عربی کی طرح درشت اور کرخت نہیں ہے۔ یہ زیادہ تر مولانا مودودی کی سیاسی جماعت کے افراد ہوتے ہیں۔ ہر شام پچھلے صحن میں بیس پچیس افراد ایک دائرے کی شکل میں ان کے اردگرد بیٹھے ہوتے ہیں اور مولانا بڑے انہماک سے ان کی باتیں سنتے ہیں ایک دفعہ حیدر نے انہیں دیکھ کر تبصرہ کیا" میرے بابا کی فیملی"۔ جب مغرب کی نماز کا وقت ہوتا ہے تو وہ وہیں صفیں بنا لیتے ہیں۔ مولانا امامت کرواتے ہیں۔

میں ایک سرگرم سوشل لائف گزار رہی ہوں۔ بیگم مودودی کی فیملی کے لوگ اور ان کی سہیلیاں، سبھی مجھ سے ملنے کے مشتاق ہیں اور ہر شام پانچ بجے میں کہیں نہ کہیں چائے پر مدعو ہوتی ہوں۔ میں ان پارٹیوں سے بھر پائی۔ چائے میری نس نس میں

Marfat.com

سرایت کرگئی ہے۔ اگرچہ بیگم مودودی ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کے چھوٹے بھائی بہنیں ان جیسے نہیں ہیں۔ ہم خود تو مڈل کلاس فیملی ہیں لیکن پاکستانی معیار سے بیگم مودودی کے کئی بھائی اور بہنیں کافی متمول اور امیر ہیں۔ صحیح بتاؤں تو میں ان ٹی پارٹیوں سے قطعاً لطف اندوز نہیں ہوتی کیونکہ ان کا ماحول اسلامی نہیں ہوتا اور ان میں بے معنی، بے مغز گفتگو ہوتی ہے۔ میں چونکہ صرف انگریزی جانتی ہوں اس لیے میں ہائی کلاس کے ان مغرب زدہ لوگوں تک محدود رہنے پر مجبور ہوں۔ جب میں اردو سیکھ جاؤں گی تو اس قابل ہوسکوں گی کہ اپنی پسند کے دوست بناؤں۔

پرسوں البتہ مجھے ایک ایسے گھر میں چائے پر مدعو کیا گیا جو مجھے بہت اچھا لگا۔ یہ ان تمام گھروں سے اچھا تھا جہاں میں اب تک جا چکی ہوں۔ مغرب کے اثرات سے بالکل پاک، خالص پاکستانی گھرانہ۔ یہ جماعت اسلامی کے ایک ہمہ وقتی کارکن کا گھر تھا جو 1951ء میں اپنی جوانی میں جماعت میں شامل ہوئے اور جب سے اب تک مولانا مودودی کے قریبی ساتھی ہیں۔ ان کا نام محمد یوسف خان ہے۔ ان کا گھر اگرچہ پرانا اور خستہ حالت میں ہے لیکن ہے بڑا کشادہ۔ اتنا بڑا ہے کہ ان کے سب بھائی، بہنیں اور چچا زاد، تایا زاد بہن بھائی بھی اپنے کنبوں سمیت اسی میں مقیم ہیں۔ گھر ایک غریب سی بستی میں واقع ہے۔ بیگم مودودی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گئیں اور میں نے برقع اتارا تو دیکھا کہ صحن بیسیوں خواتین سے بھرا ہوا ہے جس میں نوجوان لڑکیاں بھی تھیں اور بہت بوڑھی نانیاں دادیاں بھی۔ ان بوڑھی خواتین کو جو احترام دیا جا رہا تھا، میں اس سے بہت متاثر ہوئی۔ جب بھی کوئی بڑی عمر کی خاتون آتی تھی تو نوجوان لڑکیاں احتراماً کھڑی ہوجاتی تھیں اور اپنی نشستیں انہیں پیش کرتی تھیں۔ یہ خواتین ہاتھ کی سلی ہوئی خوبصورت قمیصوں، ساٹن کی شلواروں اور سفید لیس کے گوٹے کناروں والے دوپٹوں میں ملبوس تھیں۔ ان کے جوتوں کے پنجے مڑے ہوئے تھے اور ان پر خوبصورت کشیدہ کاری کا کام ہوا تھا (کھسے مراد ہیں)۔ اگرچہ جوان لڑکیاں بھی اچھی لگ رہی تھیں لیکن ان کا لباس اتنا بھڑکیلا نہیں تھا۔ زیادہ تر بوڑھی خواتین فربہ جسم کی

Marfat.com

مالک تھیں جب کہ جوان لڑکیاں دبلی پتلی اور سمارٹ تھیں۔ ان کی صحت ان کے چہروں سے جھلکتی تھی۔ بچے اتنے صحت مند نہیں تھے۔ وہ بیمار اور خوراک کی کمی کا شکار نظر آتے تھے۔ ان کے چہرے زرد اور ان کی آنکھوں میں بھوک کی اشتہا دکھائی دیتی تھی۔ ان کی ہڈیاں تک نظر آتی تھیں۔ وہ بالکل ان تصویروں کی طرح لگتے تھے جن کے خاکے میں اپنے ناول "احمد خلیل" کے لیے بنایا کرتی تھی۔ محمد یوسف خان اپنے مخلوط خاندان کے سبھی افراد کا بہت خیال کرتے ہیں، اس لیے وہ خود اپنی بیوی اور چار چھوٹے بچوں کے ساتھ، ان کے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ بہن بھائی، ان کے چچا زاد، تایا زاد، پھوپھیاں اور والدہ، سبھی اسی ایک گھر میں رہتے ہیں۔ ملا جلا کر تیس کے قریب افراد تو ہوں گے۔ بچوں والے چھ کنبے بارہ کمروں میں سمائے ہوئے ہیں۔ ہر کنبے کے پاس ایک یا دو کمرے ہیں۔ جب بیگم مودودی نے میرا تعارف کروایا تو سب کے چہرے مسکرا اٹھے اور خوشی سے دمکنے لگے۔ ہر شخص نے آ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں ہر کسی کو "السلام علیکم" کہتی تھی لیکن ہماری گفتگو بس یہیں تک محدود تھی کیونکہ میں اردو سے ناآشنا تھی اور وہ انگریزی سے۔ میں خاموش بیٹھی مسکراتی رہی اور بیگم مودودی ایک گھنٹے تک ان سے باتیں کرتی رہیں۔ خواتین کی اس خوش باش صحبت میں، میں نے دیکھا کہ صحن کے ایک کونے میں ایک شخص چارپائی پر لیٹا ہے۔ غور سے دیکھنے پر احساس ہوا کہ وہ انیس بیس سال کا جوان ہے لیکن بہت بیمار۔ وہ بہت کمزور تھا اور ہڈیوں کا پنجر دکھائی دیتا تھا۔ وہ تنہائی کا شکار تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اسے کچھ خبر نہیں کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ بیگم مودودی نے سرگوشی میں مجھے بتایا کہ وہ نارمل نہیں ہے، اور اس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بچپن ہی سے ایسا ہے۔

پھر ساری خواتین کھڑی ہو گئیں اور انہوں نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ بیگم مودودی نے مجھے بتایا کہ چائے تیار ہے۔ مجھے ایک بڑے کمرے میں لے جایا گیا جہاں ایک طویل میز تھی جس پر سفید لیس کی بے داغ اجلی چادر بچھی ہوئی تھی۔ میز پر انتہائی عمدہ کوالٹی کی قیمتی مٹھائی، بسکٹ، کیک، اور پیسٹریوں کے انبار لگے ہوئے تھے اور مزیدار

Marfat.com

چائے جو انتہائی نفیس پیالیوں میں پیش کی جا رہی تھی۔ خواتین نے اصرار کر کے مجھے اتنا کھلایا کہ ایک لقمے کی بھی گنجائش باقی نہ رہی۔ مٹھائیوں کا ذائقہ انتہائی شاندار تھا لیکن مجھے یہ احساس کچوکے دے رہا تھا کہ اس سارے اہتمام پر گھر والوں کا کافی خرچ آ گیا ہوگا اور اس کے بعد جانے کتنے دنوں تک انھیں بھوکا رہنا پڑے۔ لیکن خواتین تھیں کہ ہنس رہی تھیں اور پیار سے اصرار کر رہی تھیں کہ میں اور کھاؤں اور ہر چیز چکھوں۔ بالآخر بیگم مودودی نے اعلان کیا کہ مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا ہے۔ ہم نے میز چھوڑ دی اور صحن میں آ گئے جہاں چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ نماز کے بعد بیگم مودودی نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔ ہم نے اپنے سیاہ برقعے پہنے اور جب ہم باہر نکل رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ وہ بیمار جوان اپنے بستر پر اٹھ بیٹھا ہے اور اپنی کسی بہن سے دھیمی آواز میں گفتگو کر رہا ہے۔

اس رات ڈنر پر میں نے مولانا مودودی سے ٹی پارٹی کا ذکر کیا تو انہوں نے بتایا: ”ہندوستان میں یوسف خان ایک امیر آدمی تھا۔ اس کی فیملی کے لوگ خوشحال زمیندار تھے۔ 1947ء میں جب وہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے اور پاکستان آئے تو ان کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ محمد یوسف ایک دیانتدار، کھرا آدمی ہے۔ ایسے آدمیوں کو یہاں کچھ نہیں ملا جبکہ چالاک اور مکار لوگوں نے ہر چیز ہتھیا لی۔“

اپنی تمام محبتوں کے ساتھ

مریم

Marfat.com

لاہور سے چوتھا خط

مریم جمیلہ

معرفت مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

5-اے ذیلدار پارک

اچھرہ لاہور

22 جولائی 1962ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس

لارچمونٹ ایکڑز، اپارٹمنٹ نمبر 223-C

لارچمونٹ، نیویارک، یو۔ ایس۔ اے

پیاری امی اور ابو!

آپ کا اٹھارہ جولائی کا خط ملا تو مجھے بڑا سکون اور خوشی ملی۔ یہ جان کر اور بھی خوشی ہوئی کہ میرا دوسرا خط آپ کو مل گیا ہے۔ میں نے پہلا خط کراچی ہی میں لکھا تھا لیکن اسے مکمل یہاں مولانا مودودی کے گھر پہنچ کر کیا تھا۔ اس میں، میں نے اپنی کراچی آمد، وہاں کے قیام اور لاہور کے سفر کی تفصیلات لکھی تھیں۔ امی، ابو! آپ کبھی نہ سوچنا کہ میں آپ کو خط لکھنے کی طرف سے لاپروائی کروں گی۔ اگر آپ کو میرے خط نہ ملیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں خط لکھنا بھول گئی ہوں۔ اس کا صرف یہ مطلب ہوگا کہ ڈاک کے آنے میں تاخیر ہوگئی۔ آپ یہ بات بھی سمجھ لیں کہ مولانا مودودی کے گھر آنے والی ساری ڈاک اور باہر جانے والے خطوط سنسر ہوتے ہیں اور پڑھے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کی فوٹو کاپیاں بھی تیار کی جاتی ہیں۔ اس لیے آپ کو میرے خط دیر سے ملتے ہیں۔ ہوسکتا ہے آئندہ کوئی خط فضائی ڈاک سے بھیجا جائے تو وہ بھی ایک مہینے

Marfat.com

میں پہنچے۔

"سیّد" ایک باعزت خطاب ہے جس سے مراد وہ شخص ہے جو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ہو۔ مولانا بھی ایک باوقار خطاب ہے جس کا مطلب ہے عالم اور کسی پڑھے لکھے شخص کو دیا جاتا ہے۔ مودودی کے انگریزی میں تمام ہجے ٹھیک ہیں۔

ہاں شیخ محمد اشرف مجھ سے ملنے آئے تھے اور انہوں نے مولانا مودودی کے دفتر میں مجھ سے انٹرویو لیا تھا۔ وہ ایک طویل قامت، دبلے پتلے، تیکھے نقوش والے شخص ہیں۔ انہوں نے سفید پاجامہ اور ترکی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ان کے مزاج میں عاجزی ہے اور وہ شائستگی سے بات کرتے ہیں۔ میں نے ان سے اپنی کتاب "اسلام بمقابلہ مغرب" کے نظر ثانی شدہ ایڈیشن کی اشاعت کے بارے میں بات چیت کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں دو نئی کتابوں" اسلام اور ماڈرن ازم" اور" اسلام اِن تھیوری اینڈ پریکٹس" پر بھی کام کر رہی ہوں۔ گفتگو کے آخر میں انہوں نے مجھے ڈیڑھ سو روپے کا ایک چیک دیا۔

ان چند ڈالروں کے سوا جو مجھے بحری جہاز سے اپنی ڈاک بھیجنے پر خرچ کرنے پڑے، میں نے اور کچھ خرچ نہیں کیا۔ میری ساری ضرورتیں مولانا مودودی پوری کرتے ہیں۔ مجھے جن کتابوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے وہ سب مولانا مودودی کی لائبریری میں موجود ہیں اور مجھے خریدنے کی ضرورت نہیں۔ پاکستان میں کرنسی پر بڑی پابندیاں ہیں اور کوئی پیسہ بیرون ملک نہیں بھیجا جا سکتا۔ وہ تمام اسلامی رسائل جن میں میرے مضامین شائع ہوئے ہیں اور آپ کو وصول ہوئے ہیں، آپ بلا تاخیر مجھے بھجوا دیں۔ یہاں مجھے کوئی رسالہ نہیں ملا اور میں انہیں دیکھنے کے لیے بے تاب ہوں۔ اگر کسی رسالے کی دو کاپیاں ہوں تو آپ چاہیں تو بڑے شوق سے ایک کاپی اپنے پاس رکھ لیں۔

آج کل میں اپنے وقت کا زیادہ حصہ مضامین، مقالے اور خط لکھنے میں صرف

Marfat.com

کرتی ہوں یا اردو سیکھنے میں۔ میرا اردو زبان کا ذخیرۂ الفاظ 65 الفاظ کے قریب ہو چکا ہے لیکن ابھی میں کوئی مکمل فقرہ اردو میں ادا نہیں کرسکتی۔ بیگم مودودی نے مجھے پڑھانے کے لیے ایک مہذب خاتون کا انتظام کیا ہے جو ایک مقامی یونیورسٹی میں اردو پڑھاتی ہیں۔ بدقسمتی سے وہ باقاعدگی سے نہیں آسکتیں کیونکہ ایک تو ان کا گھر یہاں سے کئی میل دور ہے، دوسرے بارشوں کی وجہ سے سڑکوں پر اتنی کیچڑ ہو جاتی ہے کہ چلنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں مون سون کا موسم شروع ہو چکا ہے۔

امی! اگر آپ کیڑے مکوڑوں سے ڈرتی ہیں تو آپ یہاں ایک دن نہیں رہ سکتیں۔ مون سون کے آنے سے اگرچہ انتہائی گرم موسم معتدل ہو گیا ہے اور اس نے گرمیوں کو قابل برداشت بنا دیا ہے لیکن یہ اپنے ساتھ حشرات الارض کا ایک ریوڑ بھی ساتھ لایا ہے۔ رات کو یہ جھنڈ کی شکل میں نکلتے ہیں، ہزاروں نہیں لاکھوں۔ میں نے زندگی میں اتنے کھٹمل کبھی نہیں دیکھے۔ انہیں میرا کمرہ خاص طور پر پسند ہے۔ یہ پورے فرش پر رینگتے ہیں اور میرے بستر میں بھی گھس جاتے ہیں۔ میں ایک کو مارتی ہوں تو ہزار اور پہنچ جاتے ہیں۔ پچھلی رات میں نے اپنے بستر میں کئی سو کھٹمل مارے ہوں گے۔ میں یہ فیصلہ نہیں کرسکی کہ زندہ کھٹملوں کے ساتھ سونا بہتر ہے یا مردہ کھٹملوں کے ساتھ۔

گرچہ زبان کی مجبوری کی وجہ سے ہماری زیادہ بات چیت تو نہیں ہوتی تھی لیکن پھر بھی مجھے حسن کی والدہ بہت یاد آتی ہیں۔ وہ واپس اپنے گھر کراچی چلی گئی ہیں۔ وہ ہر لحاظ سے ایک سچی مسلمان ہیں اور میں ان سے دوستی کرنا چاہتی تھی۔ وہ یہاں ایک مہینے سے زیادہ عرصہ رہیں۔ ہمارے ہاں اس بڑے خاندان کے اکثر لوگ آتے ہی رہتے ہیں اور کافی کافی دنوں تک ٹھہرتے ہیں۔

میں نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ مولانا مودودی کے نو بچے ہیں لیکن میں نے صرف آٹھ کی تفصیل لکھی تھی۔ جن کا ذکر میں چھوڑ گئی تھی وہ سترہ سالہ حسین فاروق ہیں جو ان دنوں اپنے ایک چچا کے پاس کراچی گئے ہوئے تھے۔ وہ دو مہینے وہیں رہے۔

Marfat.com

ان کے یہ چچا کافی مغرب زدہ ہیں۔ انہوں نے اپنی تعلیم انگلینڈ میں مکمل کی اور ابھی حال ہی میں امریکہ ہو کر آئے ہیں۔ وہ نہ روزے رکھتے ہیں نہ نماز پڑھتے ہیں۔ صرف نام کے مسلمان ہیں۔ مولانا مودودی نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بیٹے پر ان کے اثرات پڑیں لیکن وہ اسے روکنے سے لاچار تھے کیونکہ اتنے بڑے خاندان میں مراسم قائم رکھنے کے اپنے کچھ تقاضے ہیں۔ گزشتہ اتوار حسین فاروق بڑے بڑے صندوق اٹھائے کراچی سے واپس آئے۔ ان صندوقوں میں مغربی لباس، جسم سے چپکنے والی چست جین کی پتلونیں، نوکدار جوتے، امریکی سگریٹوں کے بنڈل اور لڑکیوں کی تصاویر والے رسالے بھرے ہوئے تھے۔ وہ پاکستانی لڑکے اور لڑکیاں جو مغربی طور طریقوں کی نقل کرتے ہیں "ٹیڈی بوائے" یا "ٹیڈی گرل" کہلاتے ہیں۔ یہ خاص برطانوی محاورہ ہے جو میں نے یہاں آنے سے پہلے کبھی نہیں سنا۔ یہاں کے مسلمانوں کے لیے اس کے تعبیری معانی بڑے خوفناک ہیں اور وہ اس کلچر سے نفرت کرتے ہیں۔

میں نے جب مولانا مودودی سے پوچھا کہ ان کے چھوٹے بیٹے محمد، حسین اور حیدر بڑے دو بیٹوں عمر اور احمد سے اتنے زیادہ مختلف کیوں ہیں، تو انہوں نے وضاحت کی کہ بڑے دونوں بیٹوں کی پرورش ان کی براہ راست نگرانی میں ہوئی اور ان دونوں پر ان کی شخصیت کا اثر ہے، لیکن چھوٹے بیٹوں کے ان سالوں میں جو شخصیت کی تعمیر میں اہم ہوتے ہیں وہ سیاسی قیدی تھے، جیلوں کی سلاخوں کے پار۔ انہیں وہ باپ میسر نہیں آیا جو ثابت قدمی سے ان کی تربیت کرتا، جس کی انہیں سخت ضرورت تھی۔ اب وہ اپنی غیر حاضری کی وجہ سے ہونے والے نقصان کا ازالہ کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔

مولانا مودودی کی دو بڑی بیٹیوں انیس سالہ اسماء اور تیئیس سالہ حمیرا سے میرے دوستی بتدریج بڑھ رہی ہے۔ دونوں بہت پیاری بچیاں ہیں۔ اپنی عادات اور رویے میں وہ سچی مسلمان ہیں۔ حمیرا ایم اے انگریزی کے حتمی امتحان کی تیاری کر رہی ہے۔ اگرچہ اس کے امتحان میں ابھی آٹھ مہینے باقی ہیں لیکن وہ اپنے کمرے میں بند ہو کر پندرہ گھنٹے روزانہ پڑھتی ہے۔ ہم سب کی کوشش ہوتی ہے کہ گھر میں خاموشی رہے تا کہ اس کی

Marfat.com

پڑھائی میں خلل نہ پڑے۔ امی! آپ میں اور حمیرا میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ آج کل حمیرا انگریزی کا کلاسیکی ادب پڑھ رہی ہے، قدیم اور جدید، اور اس معاملے میں اسے گہری دلچسپی ہے۔ ابھی اس نے شیکسپیئر کا ڈرامہ " رچرڈ ثالث" ختم کیا ہے۔ کیا آپ یقین کریں گی کہ اس نے چوسر کو پرانی انگریزی کے اصل متن کے ساتھ پڑھا ہے۔ وہ مارگریٹ مچل کے ناول " گون ود دی ونڈز" سے بہت متاثر تھی۔ اس نے ایک رات مجھے بتایا کہ وہ تصور میں خود کو سکارلٹ اوہیرا کی جگہ محسوس کرتی رہی ہے۔ میں نے جب اسے بتایا کہ میں نے عربی شاعری اور ادب کے کچھ اچھے ترجمے پڑھے ہیں اور مجھے عربی شاعری اور ادب بہت اچھا لگتا ہے، تو اس نے کہا کہ اسے عربی ادب سے نفرت ہے کیونکہ وہ ناشائستہ اور حد سے زیادہ جذباتی ہے۔ میں نے جب مولانا مودودی سے اس بارے میں بات کی تو انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ جب وہ مزید سمجھ دار ہو گی تو انگریزی ادب کے بارے میں اس کی رائے اور ادبی ذوق میں یقیناً تبدیلی آئے گی۔ عربی ادب سے نفرت کے بارے میں مولانا نے کہا کہ تعلیمی اداروں میں جو نصاب رائج ہے، وہ برطانوی تسلط کے زیر اثر ترتیب دیا گیا۔ جان بوجھ کر ایسی عربی پڑھائی جاتی ہے کہ طلبہ اس کے بارے میں اچھی رائے قائم نہ کر سکیں۔ حمیرا کو بھی عربی ادب کا جو حصہ تفویض کیا گیا ہے وہ ناقص ترین تھا لیکن اسے تاثر یہ دیا گیا کہ یہی پورے عربی ادب کی نمائندگی کرتا ہے۔ حمیرا نے مجھے بتایا کہ جب اسے انگریزی زبان پر عبور حاصل ہو جائے گا تو وہ اپنے والد کی اردو کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کرے گی۔

میری ایک بات مولانا کو سخت ناپسند ہے، ان کا کہنا ہے کہ میں بولتی بہت ہوں۔ ان کے محدود وقت میں سے میں بہت زیادہ وقت لیتی ہوں اور ان کی بیوی اور بچوں کو ان کے حصے سے محروم کر دیتی ہوں۔ مجھے اس بارے میں بہت افسوس ہے لیکن میں کیا کروں؟ میرے اتنے سارے مسائل ہیں جن پر میں صرف انہی سے تبادلۂ خیال کر سکتی ہوں۔ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ باہمی دلچسپی کے بہت سے موضوعات پر بات کرنے میں مجھے لطف آتا ہے لیکن گھر کے باقی افراد اس سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔ حمیرا نے ایک

Marfat.com

مرتبہ مجھے سمجھایا،

" ہم سب طالب علم ہیں۔ میں سارا دن اپنے کمرے میں بند ہو کر انگریزی ادب کا مطالعہ کرتی ہوں۔ میری بہن معاشیات کی طالبہ ہے۔ عمر عربی کے مطالعہ میں غرق رہتے ہیں اور احمد کی دوستی اپنی طب کی کتابوں تک محدود ہے۔ مریم! تم نے دیکھا نہیں، ہم آپس میں بھی بہت کم بات چیت کرتے ہیں۔ ہم ایک دو فقروں کی گفتگو پر اکتفا کرتے ہیں۔ میں خود بھی کسی سے فری نہیں ہوں۔ اپنے بھائیوں تک سے نہیں۔ تم عائشہ، خالد، حیدر، حسین اور محمد سے فری ہو، اس لیے وہ تمہارا احترام نہیں کرتے۔ جب تک تم چپ رہنا نہ سیکھو اور ایک تہذیب یافتہ پاکستانی خاتون کے طور طریقے نہ اپناؤ، تمہیں کہیں سے احترام نہیں ملے گا۔"

کل رات کھانے کے دوران میں مولانا مودودی کو ایک ٹیلیفون آیا۔ انہوں نے کھانا چھوڑ کر فون پر بات کی۔ اس فون سے میں بہت پریشان ہوئی۔ ان کے کسی دوست کا فون تھا، جنہوں نے پیشکش کی تھی کہ میں لاہور کے ایک سکول" مدرستہ البنات" میں ہمہ وقتی استاد کی حیثیت سے بچوں کو انگریزی پڑھاؤں۔ جب میں نے کہا کہ مجھے نہ بچوں کو پڑھانے سے دلچسپی ہے نہ میرے پاس اس کی مطلوبہ قابلیت ہے، تو مولانا مودودی بہت مضطرب ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں انگریزی کی استاد بنوں لیکن میرے انکار سے انہیں بہت مایوسی ہوئی۔ انہوں نے کہا:" میں تمہیں اپنے پاؤں پر کھڑا دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم سوچو کہ ایسا کیا کام کر سکتی ہو جس سے اتنی آمدنی ہو کہ تم ایک اچھی اور خوشحال زندگی گزار سکو۔ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ میری صحت بھی ٹھیک نہیں۔ مجھے تمہارے مستقبل کے بارے میں کافی فکر ہے۔" میں نے کہا کہ چند سال پہلے تک میرے والدین بھی امریکہ میں میرے بارے میں ایسی ہی تشویش میں مبتلا تھے۔ تو انہوں نے کہا:" میں اب تمہارے والدین کی جگہ ہوں۔ ان کی تشویش میری تشویش ہے۔ تمھاری ذمہ داری مجھ پر ہے اور تم میرے لیے مشکلات پیدا کر رہی ہو۔"

انہوں نے وضاحت کی کہ پاکستان ایک غریب ملک ہے، پڑھے لکھے لوگوں کا

Marfat.com

تناسب بہت کم ہے، میری تحریروں سے اتنی آمدنی متوقع نہیں ہے کہ اس پر زندگی گزاری جا سکے۔ ٹائپنگ میں میری مہارت کسی کام کی نہیں۔ پاکستان میں سارے ٹائپسٹ اور سیکرٹری مرد ہیں۔ وہ کچھ دیر خاموش رہے، پھر بولے:

"اگر آپ کام نہیں کرنا چاہتیں تو یہی راستہ باقی ہے کہ آپ کی شادی کر دی جائے۔ آپ شادی نہ کرنے پر چاہے جتنا بھی اصرار کریں مجھے یقین ہے کہ اسی میں آپ کی بھلائی ہے۔ یقین کریں آپ کے اندر جو عورت ہے وہ مر نہیں گئی۔ وہ خوابیدہ ہے۔۔۔۔۔"

اپنی تمام تر محبتوں کے ساتھ

مریم

Marfat.com

لاہور سے پانچواں خط

مریم جمیلہ
معرفت مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی
5-اے ذیلدار پارک
اچھرہ، لاہور
2 اگست 1962ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکٹرز، اپارٹمنٹ نمبر C-223
لارچمونٹ، نیویارک، یو۔ایس۔اے

پیاری امی اور ابو!

آپ کے 21 اور 29 جولائی کے لکھے خط پا کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور یہ جان کر بڑا اطمینان ہوا کہ میرے سارے خط آپ کو مل گئے ہیں۔ آپ کو پتہ ہونا چاہیے کہ خواہش کے باوجود آپ کو جلدی جلدی خط نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ میں خط و کتابت میں بہت زیادہ مصروف ہوگئی ہوں۔ انگریزی اخبار "پاکستان ٹائمز" نے میری آپ بیتی شائع نہیں کی، لیکن لاہور سے نکلنے والے ایک اردو اخبار روزنامہ "کوہستان" نے اسے شائع کر دیا ہے اس کے بعد سے مجھے مسلسل خط آرہے ہیں جن کا نرمی سے جواب دینا ضروری ہے۔ مولانا مودودی نے مجھے بتایا کہ میرے آنے کے بعد، ایک مہینے میں انہیں میری شادی کے قریباً پچاس رشتوں کی تجاویز وصول ہو چکی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر میری بجائے انہیں وصول ہوئے ہیں کیونکہ وہی میرے سرپرست ہیں۔ ایک دن مجھے کسی ابراہیم ادریس ابراہیم کا ایک خط ملا۔ اس نے لکھا: "میں ایک تنہا درخت

Marfat.com

ہوں جو صحرا کی وسعتوں میں کھڑا سوکھ رہا ہوں۔ میرے سینے کی بھٹی میں تمہارے لیے ایک آگ سلگ رہی ہے۔" ترغیب مزید کے لیے اس نے مجھے بتایا کہ بنک کے بچت اکاؤنٹ میں اس کے آٹھ ہزار روپے جمع ہیں۔ میں نے جب مولانا مودودی کے بچوں کو یہ خط پڑھ کر سنایا تو انہیں یہ بڑا پر لطف لگا اور وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔

آج سہ پہر مجھے ایک اور سر پھرے کا خط ملا۔ اس نے لکھا کہ اس کے پاس اسلام کی سچائی کے بارے میں پندرہ ناقابل تردید ثبوت ہیں اور وہ روسی کافروں کو چیلنج کرنے کے لیے یہ ثبوت مولانا مودودی کی معرفت پاکستان میں روسی سفیر کو بھیجنا چاہتا ہے۔ ان شاندار ثبوتوں کے کچھ نمونے یہ ہیں:

" جب یہودی بادشاہ ابرہہ نے مکہ میں خانہ کعبہ کو تباہ کرنے کے لیے ایک فوج بھیجی تو اللہ تعالیٰ نے ابابیلوں کا ایک جھنڈ بھیجا جو اس کی فوج پر پتھر گراتے تھے اور وہ فوج تباہ ہوگئی۔

غیر مسلم کوئی کوبرا سانپ لے کر آئیں اور اسے سورج کی روشنی میں رکھیں۔ ہم اس کے اردگرد ایک دائرہ کھینچ دیں گے اور کہیں گے کہ یہ دائرہ حضرت پیر دستگیر کا ہے۔ سانپ اس دائرے سے باہر نہیں نکل سکے گا اور وہیں مر جائے گا۔

غیر مسلم ایک بھیڑیا اور ایک بکری لے کر آئیں اور انہیں خانہ کعبہ کے حدود میں چھوڑ دیں۔ بھیڑیا بکری کو کچھ نہیں کہے گا۔ اس سے یہ ثابت ہوگا کہ اسلام امن اور اخوت کا مذہب ہے۔۔۔۔۔"

اس سب کچھ کے لیے بس کسی اخبار میں ایک مضمون شائع ہونے کی ضرورت ہے اور" ان کے سینوں میں ایک آگ بھڑک اٹھے گی۔" مجھے مولانا مودودی نے بتایا کہ اس وقت پاکستان میں، میں ایک ایسی کنواری ہوں جس کے لیے رشتوں کی سب سے زیادہ بھرمار ہے۔

میں اپنے خط خود سپرد ڈاک نہیں کرتی بلکہ مولانا مودودی کو دے دیتی ہوں۔ ٹیلیفون کا بھی یہی حال ہے۔ میری طرف سے سارے فون وہی کرتے ہیں۔ اسی

Marfat.com

طرح میں اکیلی باہر نہیں جاتی۔ اگر جانا بھی ہو تو مولانا مودودی کی فیملی کے افراد یا ان کے دوستوں کے ساتھ جاتی ہوں، سرتاپا برقع میں ملبوس۔ گھر کے وہ حصے جہاں مولانا مودودی کے احباب ان سے ملتے ہیں، ہمارے لیے ممنوع ہیں۔ گھر کے افراد اور بچوں کے لیے سامنے والا صحن ہے۔ عقبی حصہ مردوں کی سرگرمیوں کے لیے مخصوص ہے۔ ہماری خلوت کو یقینی بنانے کے لیے گھر کے چاروں طرف اینٹوں کی ایک اونچی دیوار کھنچی ہوئی ہے جس کے بیرونی دروازے پر رات کو قفل چڑھا دیا جاتا ہے۔ بیگم مودودی اپنے شوہر کے دوستوں سے نہیں ملتیں بلکہ وہ انہیں جانتی تک نہیں، ان کے ناموں تک سے واقف نہیں ہیں۔ اسی طرح مولانا مودودی نہ اپنی بیگم کی سہیلیوں سے ملتے ہیں نہ انہیں جانتے ہیں۔ یہ پردے کی عملی شکل ہے۔ بیگم مودودی نے کس بلاغت سے اس کی تشریح کی:" اسلام میں مرد مردوں سے رابطہ رکھتے ہیں اور عورتیں عورتوں سے۔ عورتوں اور مردوں کا اختلاط ممنوع ہے۔"

آج دوپہر ہم نے ریڈیو پر ایک زبردست خبر سنی۔ تین سال کی طویل مدت کے بعد مارشل لاء اٹھالیا گیا ہے اور جماعت اسلامی سمیت تمام سیاسی جماعتیں بحال کر دی گئی ہیں۔ گھر کے پچھلے حصے میں کافی چہل پہل ہے۔

کل مولانا مودودی کے ایک دوست پہلی مرتبہ مجھے لاہور کے دلچسپ مقامات کی سیر کے لیے لے گئے۔ سب سے اہم مقام بادشاہی مسجد ہے جو اب سے تین سو برس پہلے مغل بادشاہ اورنگ زیب نے تعمیر کروائی تھی۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی اور خوبصورت ترین مسجد ہے۔ یہ پوری کی پوری گلابی رنگ کے گرینائٹ کے پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ گنبد سفید ہیں اور چاروں کناروں پر شاندار مینار ہیں۔ نماز کے اوقات کے علاوہ سیاحوں کو میناروں کے اوپر جانے کی اجازت ہے جہاں سے وہ پورے لاہور کو اپنے قدموں تلے بچھا دیکھ سکتے ہیں۔ مجھے کچھ امریکی سیاح بھی نظر آئے۔ دبلی پتلی سنہرے بالوں والی لڑکیاں جنہوں نے بغیر آستین کے بلاؤز، مختصر چست سکرٹ اور اونچی ایڑی والے جوتے پہن رکھے تھے۔ ان کے ساتھ جو مرد تھے، دھوپ کی وجہ سے

Marfat.com

ان کی جلد براؤن ہوگئی تھی اور انہوں نے کھلے گلوں کی قمیصیں اور اونچے نیکر پہنے ہوئے تھے۔ میں نے خود کو ان سے اتنی دور محسوس کیا جیسے چاند۔ کسی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ میرے کالے برقع میں مجھے امریکی کی حیثیت سے پہچان لے۔ حقیقت میں، میں دوسرے سیکڑوں کالے کوؤں میں ایک بڑا کوا دکھائی دے رہی تھی۔

ہفتہ پہلے ایک ٹی پارٹی میں ایک افسوسناک واقعہ پیش آیا۔ یہ بیگم مودودی کی ایک چھوٹی بہن کے گھر کا ذکر ہے۔ ان کی زندگی کے طور طریقے بالکل مغربی طرز کے ہیں۔ ان کے شوہر عاشق علی نے بڑے شد و مد سے جدید طرز حیات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ پاکستان کو مغربی طرز زندگی اپنانا چاہیے۔ جب میں نے اس کے برعکس خیالات کا اظہار کیا تو ہمارے درمیان سخت جملوں کا تبادلہ ہوا۔ مجھے اتنا غصہ آیا کہ میں تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ جب اس کی خبر مولانا مودودی کو ملی تو وہ بڑے ناخوش ہوئے۔

"لیکن" میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا:" میں اب تک جن لوگوں سے ملی ہوں، یہ ان میں سب سے زیادہ قابل نفرت شخص ہے۔ یہ بنا بنایا "اسمٰعیل" ہے (میرے ناول کے کردار" احمد خلیل" کا مغرب زدہ بیٹا)۔"

مولانا مودودی نے بڑی سنجیدگی سے مجھے دیکھا اور کہا:

"ہوسکتا ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن تم نے شائستگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تم ایک مہمان تھیں اور تمھیں میری بیوی کے بہنوئی کی، اس کے گھر میں بے عزتی کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اگر تم اسلام کی ایک سچی مبلغ بننا چاہتی ہو تو تمھیں ہر طرح کے لوگوں کو برداشت کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ تمھیں پتہ ہونا چاہیے کہ عاشق علی بہت سے امور پر مشورہ کرنے میرے پاس آیا کرتا تھا۔ اس رات کے بعد اس نے اس وقت تک میرے پاس آنے سے انکار کر دیا ہے جب تک تم میرے ہاں ٹھہری ہوئی ہو۔ اس طرح کے غیر مہذب اور گستاخ رویے سے لوگ دور ہوجاتے ہیں اور اسلام کے مخالف ہوجاتے ہیں اور اس سے ہمارے مقصد کو کوئی تقویت نہیں ملتی۔ مریم! تمھیں پتہ ہے کہ

Marfat.com

میرے ساتھ آنے والوں میں سیکڑوں لوگ بالکل عاشق علی کی طرح تھے، صبر اور شفقت آمیز رویے نے ان کی زندگیاں بدل دیں اور وہ اسلام کے سچے خادم بن گئے۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو صبح سویرے سے آدھی رات تک کام کرتے ہیں۔ اچھا، اب میں چلوں، کچھ کھا لوں، رات کے دس بج رہے ہیں، میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ میں نے آج اٹھارہ گھنٹے مسلسل کام کیا ہے اور اس وقت سخت تھکا ہوا ہوں، بھوک لگ رہی ہے، مجھے اجازت دو۔۔۔۔"

میری زندگی کا پریشان کن پہلو یہی ہے کہ مولانا مودودی کے پاس میرے ساتھ گزارنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ میں ان سے اسلام کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتی ہوں، میرے بہت سے ایسے سوالات ہیں جن کے جواب صرف انھی کے پاس ہیں، لیکن ان کے پاس وقت ہی نہیں۔ میں ان سے یہ امید نہیں رکھتی کہ وہ وقت جو وہ اپنی بیوی اور بچوں کو نہیں دے سکتے، مجھے دے دیں لیکن میں کیا کروں۔ ان کے بچے، خاص طور پر اُن کے بڑے بچے اس بات کو زیادہ محسوس نہیں کرتے کیونکہ وہ خود کفیل ہیں اور اپنی ضرورتیں خود پوری کر سکتے ہیں۔ البتہ چھ سالہ عائشہ کی بات الگ ہے۔ وہ مولانا کی لاڈلی ہے اور ان کے پاس ہی گھس کر سوتی ہے۔ وہ خوش باش، ملنسار بچّی ہے۔ کبھی کبھی شرارتوں میں آپے سے باہر ہو جاتی ہے۔ ویسے ہنستی کھیلتی رہتی ہے، کھانے کے وقت بدل جاتی ہے۔ پاکستان میں مجھے وہ واحد بچی ملی ہے جسے کھانا کھلانا ایک مسئلہ ہے۔ باقی سب لوگ جو حاضر ہو، شوق سے کھاتے ہیں بلکہ پلیٹیں تک چاٹ جاتے ہیں۔ لیکن جب بیگم مودودی اسے کھانے کے لیے بلاتی ہیں تو وہ میز تلے گھس کر ٹھن ٹھن رونے لگتی ہے۔ لیکن والد موجود ہوں تو اس کا رویہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ مولانا مودودی اپنے ہاتھ سے لقمے بنا بنا کر اسے کھلاتے ہیں اور وہ کسی پرندے کے بھوکے بچے کی طرح چوگا لیتی رہتی ہے۔

عائشہ کی سب سے گہری سہیلی، مولانا مودودی کے پبلشر میاں طفیل محمد کی چھوٹی بیٹی رشیدہ ہے جو اس کی ہم عمر ہے۔ دونوں لکڑی کا کوئی پرانا کریٹ لے کر اسے کسی

Marfat.com

بوری سے ڈھانپ دیتی ہیں اور گھنٹوں "گھر، گھر" کھیلتی رہتی ہیں۔ رشیدہ اکثر کھانا ہمارے ساتھ کھاتی ہے اور عائشہ ان کے ہاں۔ رشیدہ عائشہ سے بھی کم کھاتی ہے۔ حیدر نے ایک مرتبہ کہا کہ اس کا محض ہوا پر گزارہ ہے۔ عائشہ ہے تو دبلی پتلی لیکن اس کی آنکھوں میں چمک ہے اور وہ صحت مند ہے، جبکہ رشیدہ بہت ہی دبلی پتلی ہے اور اس کی ہڈیاں تک نظر آتی ہیں۔ وہ عائشہ سے کئی سال بڑی ہے لیکن عائشہ سے چھوٹی نظر آتی ہے۔ وہ عائشہ کی نسبت بہت کم گو ہے لیکن ہے بہت پیاری۔ اتنی اچھی طبیعت کی مالک لڑکیاں میں نے بہت کم دیکھی ہیں۔ مولانا کے سبھی بچے توانا اور صحت مند ہیں لیکن رشیدہ کی رنگت زرد ہے اور وہ بیمار دکھائی دیتی ہے۔

گزشتہ دس دنوں کے دوران میں سترہ سالہ حسین کافی خاموش ہوگیا ہے اور اس کے رویے میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ اس کا اپنا کوئی کمرہ نہیں، چنانچہ وہ اپنی چیزیں والدہ کے کمرے میں رکھتا ہے۔ اس کے "خزانے" شیشے کی ایک الماری میں سجے رہتے ہیں جو اصل میں کتابوں کی الماری ہے۔ اس میں اس نے ہندو رقاصاؤں اور بھارت کی سیکسی اداکاراؤں کی تصویریں سجا رکھی ہیں۔ اس کے اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں بھی ہیں۔ اور مجھے حیرت ہوئی یہ دیکھ کر کہ ان میں یسوع مسیح کی ایک تصویر بھی ہے جو کسی پُرامید عیسائی مبلغ نے تحفتاً دی تھی۔ میں نے جب مولانا مودودی سے اس بارے میں بات کی تو انہوں نے کہا:

"مریم! میں خود یہ چیزیں قطعاً پسند نہیں کرتا۔ کسی بھی مسلمان گھرانے میں ایسی چیزوں کا وجود قطعاً قابل برداشت نہیں۔ میں ان حرکتوں کو عارضی طور پر برداشت کرتے ہوئے بتدریج ان بچوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر چھڑی کو تیزی سے موڑنے کی کوشش کی جائے تو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ اگر میں ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہوں اور سختی سے پیش آؤں تو وہ اور زیادہ مشتعل ہو سکتے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ میرا احترام کرنا ہی چھوڑ دیں۔ اصلاح کے لیے وقت، صبر اور شفقت کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔۔"

Marfat.com

کل رات ساڑھے گیارہ بجے میں باتھ روم جارہی تھی کہ میں نے حسین فاروق کو عشاء کی نماز میں مشغول پایا۔ وہ اتنے انہماک اور سوز سے نماز میں مستغرق تھا کہ اسے میرا احساس تک نہ ہوا۔ ہاں مجھے امید ہے کہ بالآخر وہ بالکل سیدھے راستے پر آجائے گا۔

ہمارے گھر میں دو نئے اضافے بلی کے دو بچے ہیں جو حیدر کہیں سے اٹھا لایا ہے۔ پتہ نہیں ان کی ماں اور باقی بچے کہاں گئے۔ حیدر کو جب وہ ملے ہیں تو اتنے چھوٹے تھے کہ ان کی آنکھیں بھی نہیں کھلی تھیں۔ لیکن اب وہ پورے گھر میں ایک دوسرے سے کھیلتے پھرتے ہیں۔ انسانوں سے ڈرتے ہیں اور کوئی ان کے قریب جائے تو عجیب وغریب خوفزدہ آوازیں نکالتے ہیں۔ بیگم مودودی انہیں ہڈیاں یا کھانے کے بچے کھچے ٹکڑے ڈال دیتی ہیں لیکن حیدر انہیں روزانہ دودھ کا ایک پیالہ اور گوشت کے پارچے دینے کا اہتمام کرتا ہے۔ حیدر تمام جانوروں سے پیار کرتا ہے اور جب سے اس کے کبوتر کا بچہ اڑا تھا، اس کی زندگی میں ایک خلا تھا جو ان بلونگڑوں کے آنے سے پر ہوگیا ہے۔ اسے سب سے زیادہ تشویش عائشہ سے رہتی ہے جسے وہ ان کے قریب نہیں پھٹکنے دیتا کیونکہ وہ ان سے اکھڑپن سے پیش آتی ہے۔

ہمارے گوشت کے شوربے، لوبیے یا دالوں کے سالن اور چپاتیوں پر مشتمل کھانے کچھ عرصے کے بعد بے کیف لگنے لگتے ہیں۔ حکومت نے منگل اور بدھ کا گوشت کا ناغہ کر رکھا ہے۔ لیکن ہم نے اس مسئلے کا یہ حل نکالا ہے کہ ہم گوشت فریج میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ خوش قسمتی سے مولانا مودودی کے کئی خوشحال دوست ہیں جو پھلوں کے تحفے بھیجتے رہتے ہیں، آم، تربوز، ناشپاتیاں، آلو بخارے اور اناناس وغیرہ۔ یہ تحفے ہماری روزمرہ کی یکسانی میں خوشگوار ورائٹی پیدا کردیتے ہیں۔ مجھے یہاں آئے تقریباً ایک مہینہ ہوگیا اور اس دوران میں مولانا کو پھلوں کے کم از کم دس کریٹ وصول ہو چکے ہیں۔ جب بھی کوئی کریٹ آتا ہے، اسے بڑے شوق سے کھولا جاتا ہے اور یہ بڑا پرمسرت سماں ہوتا ہے۔ دودھ یہاں بہت مہنگا ہے، ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمیں میسر ہے۔ بیگم مودودی بڑی احتیاط سے سب کا حصہ انہیں دیتی ہیں۔ یہاں دودھ بھینسوں کا ہوتا ہے۔

Marfat.com

گایوں کا نہیں۔ آج کے کھانے پر ہمارے لیے ایک سپیشل ڈش تھی، کویت سے آئی ہوئی منجمد مچھلی۔ میں جب سے پاکستان آئی ہوں، میں نے پہلی مرتبہ مچھلی کھائی ہے۔ حیدر نے مچھلی کے سارے کانٹے اور بچے کھچے ٹکڑے جمع کیے، انہیں ایک پلیٹ میں رکھ کر صحن میں لے گیا، آواز دی تو بلی کے بچے دم ہلاتے ہوئے بھاگے بھاگے آئے۔ جس شوق سے وہ کھا رہے تھے، لگتا تھا انہیں بھی یہ ڈش پسند آئی تھی۔ دوسری رات ہم نے ایک پارٹی کا اہتمام کیا۔ مشرقی پاکستان سے ایک خاتون سرکاری افسر مجھ سے ملنے آئی۔ اس نے نیلے رنگ کی شاندار ساڑھی پہنی ہوئی تھی، اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور خدوخال سے وہ پاکستانی سے زیادہ چینی لگتی تھی۔ بیگم مودودی نے اس موقع پر بہترین مٹھائی اور پیسٹریوں کا اہتمام کیا تھا۔ جیسے ہی مہمان خاتون رخصت ہوئی، کئی بڑے بڑے کالے بھوکے کوے میز پر پل پڑے۔ وہ بن بلائے مہمان جو پارٹی سے لطف اندوز ہونے پر اتل تھے۔

پاکستانی جسمانی صفائی کے بارے میں بڑے محتاط ہیں۔ لوگوں کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ میں دن میں صرف ایک بار نہاتی ہوں۔ لوگ تین تین، چار چار بار نہاتے ہیں، البتہ یہ بار بار کپڑے تبدیل نہیں کرتے۔ یہاں شب خوابی کا الگ لباس جیسے نائٹ گاؤن یا پاجاموں کا رواج نہیں ہے۔ لوگ انھی کپڑوں میں سوجاتے ہیں جو دن کے وقت پہنے ہوتے ہیں۔ نہاتے ہوئے ہم شاور استعمال کرتے ہیں۔ پاکستان میں مسلمانوں کے نزدیک مغربی لوگوں کا ایک ٹب میں پانی بھر کر اس میں نہانا غلیظ عمل ہے۔ ہر کھانے کے بعد دانت بڑے اہتمام سے صاف کیے جاتے ہیں۔ البتہ گھروں اور گلیوں میں صفائی کا خاص خیال نہیں رکھا جاتا۔ سونے اور رہنے کے کمرے تو صاف ستھرے رکھے جاتے ہیں لیکن کوئی امریکی گھریلو خاتون یہاں کے باتھ روم اور باورچی خانہ دیکھ لے تو حیرت زدہ رہ جائے گی۔ کھانا فرش پر بیٹھ کر کھایا جاتا ہے جس پر پچھلے کھانے کے بچے کھچے ٹکڑے بکھرے ہوتے ہیں۔ یہاں غلاظت سوز بھٹی یا کوڑے کرکٹ کو ٹھکانے لگانے کا کوئی اور انتظام نہیں ہوتا۔ کھانے کے بعد ملازم انڈوں کے

Marfat.com

چھلکے، آم کی گٹھلیاں، ہڈیاں وغیرہ اکٹھی کرتا ہے اور گھر سے باہر پھینک دیتا ہے۔ وہاں کی صفائی کی کسی کو پروا نہیں۔ پرندے، بلیاں، چھپکلیاں، مینڈک اور کیڑے مکوڑوں کی عیش ہو جاتی ہے۔ میز کے ادب آداب سہولت پر مبنی ہیں۔ چمچے استعمال کریں یا ہاتھ سے کھائیں، آپ کی مرضی۔

ہمارا چھوٹا ملازم ادریس گزشتہ چند دنوں سے بیمار تھا، اسے ملیریا ہو گیا تھا۔ بخار اتنا تیز تھا کہ اس سے ٹھیک سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ زیادہ تر چادر میں لپٹا اپنی چارپائی پر پڑا رہتا تھا۔ بھارتی اور پاکستانی، سوتے وقت، چادر یا رضائی کو مکمل ڈھانپ لیتے ہیں، سر اور چہرے سمیت، جیسے کسی مردے کو ڈھانپتے ہیں۔ مجھے یہ بات بڑی پر اسرار لگتی ہے کہ یہ سانس کیسے لیتے ہیں لیکن ان کا سانس چلتا ہے اور وہ مزے کی نیند سوتے ہیں۔ بیگم مودودی نے ادریس کو کونین کی کڑوی دوائیں زبردستی کھلائیں اور اب وہ کافی بہتر ہے۔

چھت کے باتھ روم سے مجھے ساتھ والے صوفیوں کا گھر صاف نظر آتا ہے۔ ان کا صحن ہر عمر، سائز اور شکل کی عورتوں سے بھرا رہتا ہے۔ ان کے ہاں روٹیاں بنتی ہیں۔ صبح فجر سے لے کر رات گئے تک عورتیں روٹیاں پکاتی رہتی ہیں۔ ہزاروں روٹیاں بنتی ہوں گی۔ یہ صحیح معنوں میں چپاتیوں کا کارخانہ ہے۔ چھوٹے بچے کھیل میں مگن رہتے ہیں، کبھی اندر، کبھی باہر۔ مرغیاں بھی پال رکھی ہیں جو آزادی سے ٹہلتی رہتی ہیں۔ آج صبح چھ بجے کے قریب میں نے ایک دلچسپ منظر دیکھا۔ ایک نیم برہنہ بچہ جس کی عمر چھ سال کے لگ بھگ ہوگی، اپنی ماں کے پاس بیٹھا تھا جو روٹیاں پکا رہی تھی۔ بچہ ہل ہل کر ماں کو سورہ فاتحہ سنا رہا تھا۔ درمیان میں اس نے غلطی کی، ماں نے ہاتھ روک کر اس کی طرف گھورا، اسے لقمہ دیا اور ہاتھ والی روٹی توے پر تھوپ دی۔ بچہ تلاوت کرتا رہا، وہ روٹیاں پکاتی رہی۔

ساری محبتوں کے ساتھ

مریم

Marfat.com

پتوکی سے پہلا خط

مریم جمیلہ
معرفت حکیم رائے نعمت علی خان
صدر طبیہ ایسوسی ایشن
مین بازار پتوکی، ضلع قصور، پاکستان
13 اگست 1962ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکٹرز، اپارٹمنٹ نمبر 223-C
لارچمونٹ، نیویارک، یو۔ ایس۔ اے

پیاری امی اور ابو!

میں نے کزن کیرول اور مارٹن کی شادی کی خبر بڑی دلچسپی سے پڑھی۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر چچی رنیور کی معرفت انہیں مبارک باد کا خط لکھ دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ باہم خوش رہیں گے اور دونوں کا مستقبل بڑا تابناک رہے گا۔ مجھے ان دونوں کا بروکلین کا پتہ بھجوایئے گا۔

یوں ہوا کہ مولانا مودودی کے ایک قریبی دوست حکیم رائے نعمت علی خان نے مجھے دعوت دی کہ میں کچھ دن ان کی فیملی کے ساتھ آکر رہوں جو ان کی بیوی اور اٹھارہ سالہ بھانجی ام کلثوم پر مشتمل ہے۔ ام کلثوم کالج کی طالب علم ہے اور موسم گرما کی تعطیلات ان کے ساتھ گزارنے کے لیے کراچی سے آئی ہے۔ یہ خط اتنی محبت سے لکھا گیا تھا کہ مجھے شکریے کے ساتھ ان کی پیشکش قبول کرتے ہی بنی۔ حکیم صاحب نے لکھا تھا کہ ان کی بیوی خورشید بی بی کے کوئی اولاد نہیں ہے اور وہ مجھے بیٹی بنا کر اپنے ساتھ

Marfat.com

رکھنا چاہتی ہیں۔ یہ لوگ پتوکی کے ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتے ہیں جو لاہور سے پچاس میل (80 کلومیٹر) دور ہے۔ میرے قیام کے دو دن بعد حکیم صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں مستقل ان کے ساتھ رہنا پسند کروں گی؟ میرا وہاں قیام اتنا خوشگوار تھا کہ میں نے ہاں کر دی۔ واپس مولانا مودودی کے گھر گئی اور سارا سامان اکٹھا کر کے یہاں آ گئی۔ پچھلے ایک ہفتے سے میں یہیں ہوں۔

لاہور سے پتوکی کا سفر میں نے حکیم صاحب کے بہنوئی محمد انور (ام کلثوم کے چچا) کے ساتھ ریل کے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں کیا۔ میں خواتین کے کمپارٹمنٹ میں بیٹھی تھی جو عورتوں اور ان کے سامان سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پاکستان میں مردوں اور عورتوں کے لیے بسوں اور ریلوں میں الگ جگہیں ہوتی ہیں اور وہ اکٹھے نہیں بیٹھتے۔ چنانچہ محمد انور مردوں کے الگ ڈبے میں بیٹھے تھے۔ میں اپنے ڈبے میں دوسری عورتوں کے ساتھ جڑی بیٹھی تھی جب ایک نوجوان لڑکی نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں؟ میں نے جب اپنا تعارف کروایا تو ڈبے میں بیٹھی عورتوں کے چہرے کھل اٹھے۔

"اچھا تو آپ ہیں مریم جمیلہ! ہم سب آپ کو جانتے ہیں۔ ہم نے آپ کے بارے میں اخباروں میں پڑھا ہے۔ آپ کی کتاب" اسلام بمقابلہ مغرب" یقیناً بہترین کتاب ہے۔"

اگلے ایک گھنٹے تک میں نوجوان لڑکیوں میں گھری، اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں خوشگوار گفتگو کرتی رہی۔ جب رات ہوگئی تو سب لوگ اونگھنے لگے اور سونے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ جنہیں بھوک لگی انہوں نے گھر سے لائے ہوئے توشہ دان کھولے جن میں چاول، چپاتیاں اور سالن موجود تھا۔ انہوں نے مزے مزے سے کھانا کھایا۔ کئی لوگوں نے رضائیاں نکالیں اور نشستوں پر دراز ہو کر خواب خرگوش کے مزے لینے لگے۔ جنہیں نشستوں پر جگہ نہ ملی انہوں نے فرش پر ہی جہاں جگہ ملی، بستر بچھا لیے۔ اس طرح راستہ بند ہو گیا اور چلنے پھرنے کی کوئی جگہ باقی نہ رہی۔

ریل سے اتر کر باقی سفر ہم نے ایک بس میں کیا۔ بس دور دراز کے دیہاتیوں

Marfat.com

سے بھری ہوئی تھی۔ انٰ میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی۔ چھوٹے بچے بالکل ننگ دھڑنگ تھے۔ مجھ سے اگلی نشست پر پولیس کے چار اہلکار بیٹھے ہوئے تھے جنہوں نے نو قیدیوں کو حراست میں لیا ہوا تھا۔ ان سب کے ہاتھوں میں بھاری ہتھکڑیاں تھیں اور انہیں جیل میں بند کرنے کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔

حکیم صاحب اپنی عمر کی تیسری دہائی میں ہیں، سر سے گنجے اور چھوٹی چھوٹی سیاہ چھدری ڈاڑھی۔ دھوتی پہنتے ہیں اور سر پر مصری ٹوپی۔ وہ اور ان کے بہنوئی محمد انور ایک خستہ حالت دکان میں دواؤں کا مشترکہ کاروبار کرتے ہیں۔ "شرفیہ میڈیسن کمپنی" دواؤں کا سٹور بھی ہے اور بیماروں کے لیے کلینک بھی۔ حکیم صاحب کی بیوی خورشید بی بی، طویل قامت، مضبوط اور کسی مجسّمے جیسی خوبصورت خاتون ہے۔ تیس کے پیٹے میں ہیں اور جیسے میں نے پہلے ذکر کیا، بے اولاد ہیں۔ بظاہر وہ صحت مند نظر آتی ہیں لیکن ان کی دائیں ٹانگ میں عرق النساء کا درد رہتا ہے اور آدھے سر کے درد کی تکلیف بھی۔ وہ خود بے اولاد ہیں لیکن بچوں سے بہت محبت کرتی ہیں۔ ان کے بھانجے اور بھتیجیاں اکثر آتے رہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ہی کھانا کھاتے ہیں اور رات بھی یہیں گزارتے ہیں۔ دونوں راسخ العقیدہ مسلمان ہیں اور صحیح معنوں میں دین کے شیدائی۔ ان جیسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔

ان کی اٹھارہ سالہ بھانجی ام کلثوم دھیمی طبیعت کی بڑی پیاری، مہذب لڑکی ہے جو شروع ہی سے میرے ساتھ مشفقانہ برتاؤ کر رہی ہے اور مجھے بھرپور توجہ دیتی ہے۔ وہ کراچی کے ایک ویمن کالج میں پری میڈیکل کی طالب علم ہے۔ وہ مترجم کے طور پر میرے لیے قیمتی اثاثہ ہے کیونکہ حکیم صاحب اور ان کی بیگم دونوں ہی انگریزی نہیں سمجھتے۔

میں نے جب محمد انور کو پہلی مرتبہ دیکھا تو میں سمجھی کہ وہ کوئی انگریز ہے یا امریکی جس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ ان کی رنگت مجھ سے کہیں زیادہ سفید ہے، بال بھورے سرخ اور گھنگریالے۔ وہ میری عمر کے انتہائی خوبصورت جوان ہیں۔ اجلے سفید کپڑے

Marfat.com

اور قراقلی ٹوپی پہنتے ہیں۔ وہ پتوکی کے ان چند لوگوں میں سے ہیں جو بالکل ٹھیک ٹھاک انگریزی بولتے ہیں، مجھ پر بہت مہربان ہیں اور میری ضرورتیں سمجھنے اور انہیں پورا کرنے میں بڑے مددگار ثابت ہوئے ہیں۔

محمد انور کی لاڈلی بیٹی چار سالہ فرحت ہے۔ اپنے والد کی طرح وہ بھی ناقابل یقین حد تک گوری ہے۔ بال سنہرے اور آنکھیں ہلکی بھوری۔ مجھے بتایا گیا کہ پیدائش کے وقت وہ اور بھی زیادہ گوری چٹی تھی لیکن پاکستان میں سورج کی جھلستی شعاعوں سے دوسرے بچوں کی طرح اس کا رنگ قدرے براؤن ہوگیا ہے۔ وہ بہت ہی پیاری بچی ہے اور میں اس کی دلدادہ ہوتی جا رہی ہوں۔ مولانا مودودی کی لاڈلی بیٹی عائشہ قدرے شرارتی ہے لیکن فرحت قدرے سنجیدہ ہے۔ وہ سارا وقت ہمارے ساتھ گزارتی ہے، کھانا بھی ہمارے ساتھ کھاتی ہے اور تقریباً ہر رات سوتی بھی یہیں ہے۔

محمد انور نے فرحت کے استاد کو مجھے پڑھانے پر بھی مامور کر دیا ہے۔ وہ صبح سویرے آتے ہیں اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ مجھے اردو لکھنا پڑھنا سکھاتے ہیں وہ وسطی عمر کے اونچے قد کے دبلے پتلے، گھنی ڈاڑھی والے آدمی ہیں۔ چہرے کی رنگت قدرے جھلسی ہوئی۔ نفیس حس مزاح کے مالک۔ وہ دھوتی اور لمبے کرتے میں ملبوس رہتے ہیں اور سر پر پگڑی باندھتے ہیں۔ ان کی فیملی کافی بڑی ہے۔ ان کے بچے فرحت کے کھیل کود کے ساتھی ہیں اور بیوی خورشید بی بی کی سہیلی۔ وہ اکثر خورشید بی بی سے گپ شپ کرنے یہاں آتی ہے اور گفتگو کے دوران میں اپنے ننگ دھڑنگ بچے کو دودھ پلاتی رہتی ہے۔ وہ واضح طور پر ایک غریب آدمی ہیں، کیونکہ ان کے کپڑے مسکے ہوئے اور کئی جگہوں سے پیوند لگے ہوتے ہیں۔ فرحت کی اور میری الگ الگ تختیاں ہیں جن پر ہم گھر میں بنائی گئی روشنائی سے اپنے سبق لکھتے ہیں۔ یہ روشنائی آسانی سے دھل جاتی ہے اور تختی کو بار بار استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس سے کاغذ کی بچت ہو جاتی ہے۔ میں فرحت کا قاعدہ ہی استعمال کر رہی ہوں اور ہم دونوں ایک ہی سبق پر ہیں۔ فرحت مجھ سے کہیں بہتر شاگرد ہے۔

Marfat.com

میں اس گھر کے ایک اور اہم فرد "میاں مٹھو" کا ذکر کرنا تو بھول ہی گئی۔ میاں مٹھو پالتو طوطا ہے۔ وہ اردو بولتا ہے اور اس کا ذخیرہ الفاظ محدود ہے۔ وہ اکثر بولتا ہے، "مجھے روٹی دو" لیکن وہ آموں اور دوسرے پھلوں کا بھی رسیا ہے۔ روٹی مانگنے کے علاوہ بھی اکثر ٹائیں ٹائیں کرتا رہتا ہے جو خورشید بی بی کو سخت ناگوار گزرتا ہے کیونکہ وہ پہلے ہی سر درد کی تکلیف میں مبتلا ہیں۔

پتوکی کے دوسرے گھروں کی طرح ہمارا گھر بھی بہت پرانا ہے، شاید سو سال پرانا ہو۔ یہ اینٹوں کا بنا ہوا پختہ گھر ہے۔ کھلے صحن کے اردگرد دو کمرے ہیں جن میں ہم رہتے ہیں۔ صحن رہنے کے کام بھی آتا ہے اور خواب گاہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ ایک کمرہ مجھے دے دیا گیا ہے جس میں، میں اپنا ٹائپ رائٹر، کتابیں، کپڑے اور دوسرا سامان رکھے ہوئے ہوں۔ کمرے کی دیواروں پر سفیدی پھری ہوئی ہے اور ان پر قرآنی آیات اور حدیثوں سے مزین فریم لٹکے ہوئے ہیں۔ انہوں نے میرے لیے خاص طور پر ایک ڈریسنگ ٹیبل، صوفہ سیٹ اور دو کرسیوں کا انتظام کیا جو میرے آنے سے پہلے ہی میرے کمرے میں رکھوا دیے گئے تھے۔ جب مجھے ٹائپنگ کرنی ہو تو ڈریسنگ ٹیبل کو میں ڈیسک کے طور پر استعمال کرتی ہوں جبکہ صوفہ اور کرسیاں مہمانوں کے آنے پر استعمال ہوتے ہیں۔ گرمیوں میں کوئی بھی کمروں کے اندر نہیں سوتا۔ ہم سب چارپائیاں اٹھا کر چھت پر چلے جاتے ہیں جہاں کھلے آسمان تلے ہوا ٹھنڈی اور خوشگوار ہوتی ہے۔ یہاں باقاعدہ باورچی خانہ نہیں ہے۔ کھانے پکانے کا کام صحن کے ایک کونے میں ایک سٹوو پر کیا جاتا ہے جو مٹی کے تیل سے جلتا ہے۔ کھانا زمین پر بیٹھ کر پکایا جاتا ہے۔ امریکہ اور پاکستان میں گھرداری کے کاموں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مجھے کھانے پکانے اور صفائی کے کام نئے سرے سے سیکھنے پڑے۔ کھانا پکانے میں تین چار گھنٹے لگ جاتے ہیں اور یہ کام تقریباً سارا دن جاری رہتا ہے۔ آٹے کو پتھر کی چکی پر پیسنا پڑتا ہے۔ نمک ڈلیوں کی شکل میں ملتا ہے جسے پتھر کے کھرل میں کوٹا جاتا ہے۔ کپڑے دھونے کا صابن تک گھر میں بنایا جاتا ہے۔ بھینس کے دودھ سے

Marfat.com

مکھن بھی ہم خود ہی بناتے ہیں۔ ہم دہی کو ایک بڑے برتن میں ڈال کر کافی دیر تک بلوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ مکھن سفید گولے کی شکل میں جمع ہو جاتا ہے۔ اگر اس کو پگھلا لیں تو یہ گھی بن جاتا ہے جو کھانا پکانے میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک سالن میں چھ سات قسم کے مسالے پڑتے ہیں۔ میں آہستہ آہستہ ان گرم مسالوں اور تیز مرچوں کی عادی ہوتی جا رہی ہوں۔ اب اس سے میرا منہ نہیں جلتا بلکہ میں انہیں پسند کرنے لگی ہوں۔ مولانا مودودی نے کہا تھا کہ سال بعد مجھے کوئی اور کھانے پسند نہیں آئیں گے۔ یہاں پتوکی میں نلکوں کا بھی کوئی تصور نہیں ہے۔ ایک دیسی پمپ ہے۔ اس کا پانی پینے کے لیے استعمال نہیں ہوتا کیونکہ کھارا ہوتا ہے۔ اسے صرف نہانے دھونے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ پینے کے پانی کے لیے ایک ماشکی کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جو روزانہ بکرے کی کھال کی ایک بڑی مشک میں تازہ پانی لے کر آتا ہے۔ یہ چونکہ کم دستیاب ہے اور مہنگا بھی اس لیے بڑی احتیاط سے استعمال کیا جاتا ہے اور ضائع ہونے سے بچایا جاتا ہے۔ چونکہ یہاں فریج بھی نہیں ہیں اس لیے پکا ہوا کھانا فوراً ہی استعمال کر لیا جاتا ہے۔ یہاں پتوکی کے گھروں میں غلاظت کی صفائی کا اپنا انتظام ہے۔ ہمارے گھر میں دو باتھ روم ہیں جن کے درمیان چوکور خلا ہے جس کے کنارے پر سیمنٹ کے قدمچے بنے ہوئے ہیں۔ ان سے دوہرا کام لیا جاتا ہے۔ یہ رفع حاجت کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں اور کوڑا کرکٹ بھی انھی میں پھینکا جاتا ہے۔ فضلے اور کوڑے کرکٹ کو پانی کی بالٹیوں کی مدد سے بہا دیا جاتا ہے جو گلی کی طرف بہ جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اندھیرے میں گلی سے گزرے تو خدشہ ہے کہ غلاظت میں اس کے پاؤں لت پت ہو جائیں یا غلاظت کے چھینٹوں سے اس کے کپڑے خراب ہو جائیں۔ یہاں ہر شخص بار بار نہاتا ہے اور ہاتھ منہ دھوتا ہے، خاص طور پر سخت گرمی کے دنوں میں۔ نہانے کے لیے ہم دستی پمپ سے پانی کی بالٹی بھرتے ہیں۔ پانی خوشگوار حد تک ٹھنڈا ہوتا ہے۔ باتھ روم میں سیمنٹ کے فرش پر کھڑے ہو کر جسم کو گیلا کرتے ہیں، صابن ملتے ہیں اور پھر مگ سے پانی ڈال کر اسے بہا دیتے ہیں۔ پتوکی میں نہ

Marfat.com

کوئی فون ہے اور نہ کسی کے پاس کوئی کار۔کوئی مشینی ٹریفک نظر نہیں آتی۔گلیوں میں بھینسیں، گائیں، گدھے اور تانگے نظر آتے ہیں۔پتھروں سے بنی گلیاں تنگ ہیں اور انتہائی شکستہ، مرمت طلب۔

کراچی اور لاہور جیسے بڑے شہروں میں لوگوں کو بڑے جانور رکھنے کی ممانعت ہے کیونکہ ان کی غلاظت سے وبائی بیماریاں پھیلنے کا خدشہ ہوتا ہے۔اس وجہ سے جانوروں سے حاصل ہونے والی خوراک شہروں میں کمیاب ہے کیونکہ یہ دور دراز فاصلوں سے لائی جاتی ہے۔لیکن یہاں پتوکی میں ہم ہر طرح خودکفیل ہیں اور اچھے سے اچھے کھانوں کے مصارف برداشت کر سکتے ہیں۔ہر خاندان کے پاس ایک دو بھینسیں ہیں۔خورشید بی بی کی ایک رشتہ دار ہمارے ساتھ والے گھر میں رہتی ہیں۔ان کے پاس ایک بھینس ہے جس کا ایک مہینے کا ایک بچہ بھی ہے۔جب بھی بھینس کو دوہا جاتا ہے تو اس کے بچے کو سخت غصہ آتا ہے۔بالآخر جب اسے دودھ پینے کے لیے چھوڑا جاتا ہے تو وہ اپنی ماں کے تھنوں کی طرف جانے کے بجائے دودھ کی بالٹی کی طرف لپکتا ہے اور اگر اسے روکا نہ جائے تو وہ سارا دودھ گرا دے۔اس کی آنکھوں میں ایسا تاثر ہوتا ہے جیسے کہہ رہا ہو،"تم نے میری ماں کا دودھ نکالنے کی جرأت کیسے کی؟ یہ تو میرا دودھ ہے۔" جتنی زیادہ بھینسیں ہوں گی اتنا زیادہ دودھ۔میں جتنا چاہوں، دودھ پی سکتی ہوں۔چاہوں تو دن میں تین چار بار۔اسی طرح جتنی زیادہ مرغیاں ہوں، اتنے زیادہ انڈے، جتنی زیادہ بکریاں ہوں اتنا زیادہ گوشت۔گائیں البتہ کم ہیں اور وہ بھی سوکھی سڑی جیسے بھوک سے مرنے والی ہوں۔پاکستانی مسلمان گایوں کے بارے میں کافی متعصب ہیں کیونکہ بھارت میں ہندو اس کی پوجا کرتے ہیں اور اسے مقدس جانتے ہیں۔

بھارت کے ذکر پر لوگوں کو جھرجھری آجاتی ہے۔پندرہ سال گزرنے کے باوجود لوگوں کے ذہنوں میں 1947ء کی تقسیم کے خوفناک واقعات کی یادیں تازہ ہیں۔دو تین دن پہلے خورشید بی بی کی ایک سہیلی نے ہمیں رات کے کھانے پر بلایا۔

Marfat.com

وہ مجھ سے کئی برس چھوٹی ہیں لیکن ان کے کئی بچے ہیں۔ان کے جسم اور چہرے پر زخموں کے بہت سے نشان نہ ہوتے تو وہ بہت خوبصورت دکھائی دیتیں۔وہاں سے واپسی پر میں نے ام کلثوم سے ان زخموں کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا،"تقسیم کے وقت وہ نو سال کی تھیں۔وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آ رہی تھیں جب راستے میں چھروں اور تلواروں سے مسلح غنڈوں نے ان پر حملہ کر دیا۔انہوں نے اس بچی کو چھین لیا۔ان کے سامنے کے دانت توڑ دیے اور مار مار کر لہولہان کر دیا۔وہ خوش قسمت تھیں کہ کسی نہ کسی طرح جان بچا کر ان کے چنگل سے نکل آئیں۔اس وقت سے ان کے چہرے اور جسم پر زخموں کے نشان ہیں۔ظاہر کے نشان تو نظر آتے ہیں لیکن دل میں بیٹھا ہوا خوف کبھی دور نہیں ہوگا۔

اگرچہ پتوکی ایک چھوٹا سا قصبہ ہے لیکن اس میں چار مسجدیں ہیں۔وہ کبھی خالی نہیں ہوتیں۔ان میں روزانہ پانچ وقت باآواز بلند اذان ہوتی ہے۔ہم مسلمان صبح سویرے اٹھنے کے عادی ہیں۔ٹھیک چار بجے،ان مسجدوں کے مؤذن، میناروں پر چڑھ کر اپنی استطاعت کے مطابق بلند آواز میں اذان دیتے ہیں اور پکار پکار کر کہتے ہیں"نماز نیند سے بہتر ہے۔" اگر ایک موذن کی آواز سے کسی کی آنکھ نہ کھلے تو یہ بات یقینی ہے کہ باقی تین اسے ضرور جگا دیں گے۔مرغے،کوّے، چڑیاں،آوارہ کتے،گدھے اور بھینسیں بھی موذن کی آواز کے ساتھ اپنے اپنے راگ الاپنے لگتے ہیں۔بچے ہنسی خوشی ایک گھر سے دوسرے گھر کی چھت پر چھلانگیں لگاتے پھرتے ہیں۔پتوکی میں گھر ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور ان کی چھتیں اتنی قریب قریب ہیں کہ آپ گلی میں قدم رکھے بغیر قصبے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا سکتے ہیں۔اذان، خاص طور پر صبح کی اذان سن کر میرا دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔دن کو شروع کرنے کا کوئی اور بہتر طریقہ آپ سوچ سکتے ہیں؟

اپنی ساری محبتوں کے ساتھ

مریم

Marfat.com

پتوکی سے دوسرا خط

مریم جمیلہ
معرفت حکیم رائے نعمت علی خان
صدر طبیہ ایسوسی ایشن
مین بازار پتوکی، ضلع قصور، پاکستان
27 اگست 1962ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکٹرز، اپارٹمنٹ نمبر 223-C
لارچمونٹ، نیویارک، یو۔ ایس۔ اے

بہت پیاری امی اور ابو!

آپ کا 13 اگست کا لکھا ہوا خط مجھے ایک ہفتہ پہلے مل گیا تھا اور مجھے امید ہے کہ پتوکی سے لکھا ہوا میرا پہلا خط بھی اب تک آپ کو مل چکا ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرے لاہور سے پتوکی آنے سے پریشان نہیں ہوں گے اور اس سے آپ کو کوئی صدمہ نہیں ہوگا۔ مولانا مودودی اور ان کی بیگم بھی میرے ساتھ بہت اچھی تھیں لیکن یہاں بھی میں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ مارشل لاء اٹھنے کے بعد مولانا مودودی کو اجازت مل گئی ہے کہ وہ اپنی سیاسی جماعت، جماعت اسلامی کی سرگرمیوں کو بحال کر سکیں جن پر گزشتہ تین سال سے پابندیاں عائد تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں اور اب انہیں میری طرف توجہ دینے کا بالکل وقت نہیں رہا۔ وہ اپنی بیوی بچوں کو بھی وقت نہیں دے پا رہے۔ اس سے گھر میں کشیدگی کی فضا ہے جس سے ہر شخص متاثر ہے۔

کیرول کی شادی کے مناظر آپ نے جس شگفتہ انداز میں بیان کیے ہیں، انہیں

Marfat.com

میں نے مزے لے لے کر پڑھا۔ ان کی مستقبل کی زندگی روشن رہنے کے واضح امکانات ہیں۔ امید ہے انہیں میرا مبارکباد کا خط مل گیا ہوگا اور انہیں یہ احساس ہوگا کہ میں انہیں بھولی نہیں۔

لاہور میں، میں نے جو مسجد دیکھی تھی" بادشاہی مسجد" کہلاتی ہے اور اسے یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی اور خوبصورت ترین مسجد ہے جسے تین سو سال پہلے مغل بادشاہ اورنگ زیب نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ جگہ اس لیے بھی مشہور ہے کہ ہمارے جدید شاعر اور مصور پاکستان علامہ اقبال (1876-1938ء) یہیں دفن ہیں۔ وہاں سے میں لاہور کے روحانی مرکز علی ہجویری صاحب کے مزار پر گئی تھی۔ وہاں کا ماحول بڑا مقدس تھا۔ بہت سی عورتیں بیٹھی قرآن اور تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ بعد میں مولانا نے مجھے دوبارہ وہاں جانے سے منع کر دیا تھا کیونکہ وہاں بہت سی ایسی غلط رسمیں ہوتی ہیں جو ان کے بقول اسلام کے بالکل خلاف ہیں۔ یہ مزار حضرت علی بن عثمان ہجویری کی قبر کے اوپر بنا ہوا ہے جنہیں لاہوری" داتا صاحب" کہہ کر پکارتے ہیں۔ وہ بہت مقدس آدمی تھے اور نو سو سال پہلے لاہور میں رہتے ہوئے انہوں نے کئی ہندوؤں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ ان کا انتقال بھی یہیں ہوا۔ مولانا مودودی اور ان کے پیروکاران کے مزار پر نہیں جاتے تو اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ان کے دل میں علی ہجویری صاحب کا کوئی احترام نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میاں طفیل محمد صاحب نے ان کی کتاب "کشف المحجوب" کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس میں صوفیانہ راستوں کی سائنس بیان کی گئی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اس کتاب کو تفصیل سے پڑھوں۔ لاہور کا تاریخی قلعہ بھی، جسے مغل بادشاہوں نے تعمیر کیا تھا، دیکھنے کے لائق ہے۔

جہاں تک موسم کا تعلق ہے تو مون سون کا تقریباً آدھا موسم گزر چکا ہے لیکن سارے مون سون میں بارش دو تین دن ہی رہی، ہلکی ہلکی پھوار البتہ کئی مرتبہ پڑی۔ مغربی پاکستان عام طور پر خشک ہی رہتا ہے اور یہاں بہت کم بارشیں ہوتی ہیں۔ جب مون سون میں بہت زیادہ بارشیں ہو جائیں تو شدید سیلاب آ جاتے ہیں۔ خوش قسمتی

Marfat.com

سے اس سال ہم سیلابوں سے محفوظ رہے ہیں۔ درجہ حرارت کے بارے میں کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ لاہور اور پتوکی میں دن کے وقت شاید ہی یہ کبھی 95 ڈگری فارن ہائٹ سے کم ہوتا ہو۔ اوسطاً اس سے زیادہ ہی رہتا ہے۔ اگر ہوا میں نمی کا تناسب بڑھ جائے تو حبس ہو جاتا ہے اور سانس لینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ ہر سال گرمیوں کی لہر اپریل کے وسط سے اکتوبر کے وسط تک کم از کم چھ مہینے جاری رہتی ہے۔ کبھی کبھی تیز ہواؤں کے جھکڑ چلتے ہیں یا تیز بارش ہو تو گرمی کا زور کچھ دیر کے لیے ٹوٹ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت غریب گھرانوں کو چھوڑ کر ہر گھر میں بجلی کے کم از کم ایک پنکھے کی عیاشی کا اہتمام ضرور کیا جاتا ہے۔ ایک طاقتور پنکھے سے گرمی برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہاں پتوکی میں بجلی تو موجود ہے لیکن بدقسمتی سے اس کا کرنٹ بہت کمزور ہوتا ہے اور آئے دن خراب رہتی ہے۔

آئندہ کئی مہینوں تک میں اپنے جاگنے کے سارے اوقات جلد از جلد اردو سیکھنے میں صرف کروں گی۔ کسی اور سرگرمی کا موقع بھی نہیں۔ ہمارے استاد ٹھیک آٹھ بجے صبح پہنچ جاتے ہیں اور دو گھنٹوں تک پڑھاتے ہیں۔ وہ جو کام دے کر جاتے ہیں دوپہر کا سارا وقت اسے مکمل کرنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ اور شام کو بھائی جان (حکیم صاحب کو میں احترام سے اسی لقب سے پکارتی ہوں) میرا سبق سنتے ہیں۔ یہ کافی مشقت طلب معمول ہے اور مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں نے نئے سرے سے سکول میں جانا شروع کر دیا ہو۔ لیکن سب لوگ میری تیزی سے اردو سیکھنے پر خوش ہیں۔ ایک مہینے میں، میں نے وہ قاعدہ ختم کر لیا ہے جو یہاں کے اوسط ذہانت کے طلبہ کو ایک سال میں پڑھایا جاتا ہے۔ شاید ضرورتاً ایسے ہوا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے ایک مہینے سے کم عرصے میں لاہور میں سیکھے گئے ذخیرۂ الفاظ کو چار گنا بڑھا لیا ہے۔ میں اردو کے کئی سو لفظ سیکھ چکی ہوں۔ اس کامیابی کا سہرا ام کلثوم کے سر ہے جس نے میری بڑی مدد کی۔ ایک ہفتے پہلے اس کے کراچی جانے سے قبل میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے ایسے تمام الفاظ اور فقرے لکھوا دے جو میری ضرورتیں پوری کرنے میں میرے کام آئیں۔ ام

Marfat.com

کلثوم نے مجھے جو کچھ سکھایا، ان کی مدد سے میں اپنی ضرورتوں کا بخوبی اظہار کر سکتی ہوں۔ اس طرح بھائی جان اور آپا مجھے جو ہدایات دیتے ہیں وہ میں آسانی سے سمجھ لیتی ہوں۔ میں جب یہاں آئی تو بھائی جان اور آپا میرے سامنے ہی میرے بارے میں گفتگو کر لیا کرتے تھے لیکن اب جب میں نے کئی فقرے سمجھنے شروع کر دیے ہیں تو وہ بہت محتاط ہو گئے ہیں۔

ام کلثوم نے مجھے کئی اردو فقرے سکھائے جو میں نے انگریزی کے الفاظ میں لکھ لیے تھے۔ اسی طرح اس نے بھائی جان کو بھی کئی انگریزی کے فقرے سکھائے جو انہوں نے احتیاط سے ایک کاپی میں لکھ لیے تھے۔ چونکہ وہ انگریزی نہیں جانتے اس لیے انہوں نے یہ فقرے عربی متن میں لکھے۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن حقیقت ہے کہ انگریزی بالکل ٹھیک عربی متن میں لکھی جا سکتی ہے۔

ام کلثوم کے کراچی جانے سے پہلے پتوکی میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا میلاد منایا گیا۔ اس موقع پر گلیوں کو خاص طور پر سجایا گیا تھا۔ مین بازار سے ایک جلوس گزرا، ہم خواتین پردے میں ہونے کی وجہ سے بازار میں تو نہیں اتر سکتی تھیں لیکن خوش قسمتی سے ہماری ایک پڑوسن نے ہمیں اپنے گھر بلا لیا اور اس کی چھت کی منڈیروں کے سوراخوں میں سے جھانکتے ہوئے ہم نے جلوس کا منظر دیکھا۔ میرا نہیں خیال کہ آپ کبھی ایسا جلوس دیکھ سکیں گے۔ سب سے آگے آگے جو لوگ تھے انہوں نے خاص یونیفارم پہن رکھی تھی جن پر بے تحاشا ربن اور بلے لگے ہوئے تھے۔ وہ زور زور سے بگل بجا رہے تھے۔ ان کے پیچھے سجی سجائی بیل گاڑیاں تھیں جنہیں دو دو بھینسے کھینچ رہے تھے۔ ان بھینسوں کو بھی ہار پہنائے گئے تھے۔ کچھ فلوٹ شیعہ حضرات کے تھے جو لاؤڈ سپیکر پر "یا علی، یا علی، یا حسن، یا حسین" پکار رہے تھے۔ اس کے بعد عربی لباس پہنے ہوئے بچے تھے جو اونٹوں پر سوار تھے۔ ان کے پیچھے لوگوں کا ایک منتشر ہجوم تھا جن میں کچھ لوگ گا رہے تھے، کچھ رقص کر رہے تھے۔ صوفیوں کے لیے یہ ایک شاندار موقع تھا۔ اصل تقریب تو انہوں نے منائی۔ صبح تین بجے وہ ایک مسجد میں جمع ہوئے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر

Marfat.com

انہوں نے نعتیں پڑھنی شروع کر دیں۔ یہ سلسلہ بغیر کسی وقفے کے سارا دن جاری رہا اور انہوں نے اس بات کو یقینی بنایا کہ کوئی ان کی نعتیں سننے سے محروم نہ رہ جائے اور یہ کہ کوئی سو بھی نہ سکے۔ بھائی جان اور محمد انور نے بتایا کہ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی میلاد منانے کے طریقے سے سخت بیزار ہیں۔ ان کے خیال میں ان طور طریقوں سے مسلمان ہندوؤں کی پیروی کرتے ہیں۔ محمد انور نے کہا، "ہمیں اس نمائشی اظہار کے طریقوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہمیں قرآن کا مطالعہ کرنا چاہیے اور نمازوں کی ادائیگی پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔۔۔۔"

مولانا مودودی کے برعکس بھائی جان تمام صوفیوں کو برا نہیں سمجھتے۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ صوفی ازم کے نام کو غلط استعمال کیا گیا ہے اور آج کل کے زیادہ پیر فقیر جعلی ہیں لیکن کچھ خدا والے بھی ہیں۔ ایک صوفی تو ان کے قریبی دوست ہیں۔ یوم میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھائی جان نے انہیں تلاوت قرآن کے لیے گھر بلوایا۔ آپا، ام کلثوم اور میں نے ایک سفید پردے کے پیچھے سے ان کی تلاوت سنی۔ ان کے پاس قرآن نہیں تھا بلکہ حافظے سے انہوں نے تلاوت کی اور اتنی خوش الحانی سے کہ ہم سب کے دل گداز ہو گئے۔

ایک بات جس کی وجہ سے میں پاکستان سے محبت کرتی ہوں، وہ دوسرے جانداروں کا وجود ہے جو انسانوں کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ جانور اور پرندے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ہمارا پالتو طوطا میاں مٹھو مجھے بہت پسند ہے۔ میں ٹائپنگ میں مصروف ہوں یا اردو کا سبق یاد کر رہی ہوں تو وہ خوش باش طریقے سے میرا ساتھ دیتا ہے۔ ایک سچے پاکستانی کی طرح وہ بھی باقی فیملی کی طرح کالی مرچوں، سبز مرچوں اور گرم مسالوں کا شیدائی ہے۔ زیادہ تر طوطے کمینے ہوتے ہیں لیکن میاں مٹھو ایسا نہیں ہے۔ اسے کبھی غصہ نہیں آتا اور جب میں اسے کھانا ڈالتی ہوں یا اس کا پنجرہ صاف کر رہی ہوں تو وہ کبھی نہیں کاٹتا۔

ہمارے ساتھ والے گھر کے پڑوسی ہمارے خونی رشتہ دار بھی ہیں۔ ان کے پاس

Marfat.com

ایک خوبصورت مرغا تھا۔ آج صبح ان کی بیٹی سلیمہ ہمارے گھر آئی اور بتایا کہ آج ان کے ہاں مرغ ذبح ہوگا اور اگر میں یہ کارروائی دیکھنا چاہوں تو اس کے ساتھ چلوں۔ وہ ہاتھ پکڑ کر مجھے ساتھ لے گئی۔ ایک بچے نے تکون نما ایک ٹوکرا سیدھا کیا تو نیچے سے وہ شاندار مرغا نکلا۔ میں اسے بازوؤں میں اٹھا کر سلیمہ کے والد کے پاس لے گئی جو ایک چھری تیز کیے تیار بیٹھے تھے۔ انہوں نے میرے ہاتھ سے مرغا لیا، اسے زمین پر لٹایا اور بسم اللہ، اللہ اکبر کہتے ہوئے چھری اس کے گلے پر پھیر دی۔ جب سارا خون بہ گیا تو سلیمہ کی امی اور ابو، فرش پر بیٹھے بیٹھے ہاتھوں سے اس کے پر کھینچنے لگے۔ سلیمہ خوشی سے بولی،" ذبح کی کارروائی مکمل، آج رات کا کھانا بہت لذیذ ہوگا۔"

وہ وقت جب موسم قابل برداشت اور قدرے خوشگوار ہوتا ہے، رات کا ہوتا ہے جب ہم سونے کے لیے اوپر چھت پر اپنی چارپائیوں پر چلے جاتے ہیں۔ چھت پر سے آپ جان سکتے ہیں کہ پورا پتوکی کیا کر رہا ہے۔ قریبی ہمسایوں کے بچے ریں ریں کر رہے ہوتے ہیں۔ آوارہ کتے بھونک رہے ہوتے ہیں اور ساری رات ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں۔ ٹھیک چار بجے چاروں مسجدوں کے مؤذن پورے پتوکی کو اللہ کی عبادت کے لیے جگا دیتے ہیں۔ جنگلی کتے، بلیاں، مرغ، کوے، چڑیاں، بکریاں اور بھینسیں بھی عبادت میں شامل ہو جاتی ہیں۔ مجھے پورے دن کا خوبصورت ترین وقت، یہی صبح چار بجے کا لگتا ہے۔ سلیمہ کے گھر میں بجلی روشن ہوتی ہے اور میں ان کے صحن میں دیکھتی ہوں کہ ان کے سفید ڈاڑھی والے والد ہل ہل کر قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ وہ روزانہ اسی وقت ایسے ہی تلاوت کرتے ہیں۔ اگرچہ صبح کی مطلوبہ نماز بڑی مختصر ہوتی ہے لیکن بھائی جان کی عبادت طویل ہوتی ہے۔ میں جب اٹھتی ہوں، انہیں مصلے پر بیٹھے عبادت میں منہمک پاتی ہوں۔ وہ پوری یکسوئی سے تسبیح پڑھتے رہتے ہیں۔

پتوکی اگرچہ ایک مسلم قصبہ ہے لیکن یہاں کچھ عیسائی بھی رہتے ہیں۔ مجھ سے ملنے کے لیے آنے والوں میں ایک نوجوان عیسائی خاتون بھی تھی جو نرس اور دایہ ہے۔

Marfat.com

کلف لگی سفید یونیفارم میں وہ جاذب نظر لگتی تھی اور سفید یونیفارم اس کے سانولے رنگ پر خوب کھلتی تھی۔ وہ اچھی طبیعت کی مالک تھی اور اس نے مجھے سہ پہر کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ اگرچہ میں نے یہ دعوت قبول کر لی تھی لیکن بھائی جان نے اس پر پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا کیونکہ انہوں نے بتایا کہ اس نرس کا تعلق "ہائی چرچ آف انگلینڈ" سے ہے اور اس کا گھر بھی چرچ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یہاں اسلام کے اثرات اتنے گہرے ہیں کہ عیسائی اپنے گرجوں کو مسجد اور اپنے پادریوں کو امام کہتے ہیں۔ ہماری گلی میں بھی ایک عیسائی خاتون رہتی ہے جو تیس گھروں کی لیٹرینیں دن میں دو بار صاف کرتی ہے لباس اور جسمانی خدوخال سے وہ باقی پاکستانی خواتین سے الگ نظر نہیں آتی، لیکن اس سے انتہائی ناگوار بو آتی ہے۔ میں دن میں دو بار اسے سر پر فضلے کی ٹوکری اٹھائے گزرتا دیکھتی ہوں۔ یہ پیشہ عیسائیوں کے لیے بالکل کھلا ہے، کوئی ان کے مقابلے پر نہیں کیونکہ مسلمان چاہے کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو، یہ کام نہیں کرتا۔

بات یہ ہے کہ اسلام کے علاوہ کوئی ایسا مذہب نہیں جو صفائی پر اتنا زور دیتا ہو۔ اسلام سختی سے ہم سے صفائی رکھنے کے ایسے کاموں کا مطالبہ کرتا ہے جس کا کسی اور مذہب میں تصور بھی نہیں۔ جسمانی صفائی اور وضو کیے بغیر، جو ایک خاص ترتیب سے کی جاتی ہے، ہماری فرض نماز بھی ادا نہیں ہوتی۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ مغربی دنیا کے لوگ مسلمانوں کو گندا کیوں اور کیسے سمجھتے ہیں۔ کوئی اس گھر میں آئے اور دیکھے کہ ان کے اپنے گھروں میں اس نہانے دھونے اور دانتوں کی صفائی کا عشر عشیر اہتمام بھی نہیں ہوتا جو یہاں ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسلمان ہیں جو مغربی لوگوں کو گندا سمجھ کر انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مولانا مودودی نے اپنے رسالے "ترجمان القرآن" کے ایک حالیہ شمارے میں اس بارے میں لکھا:

"مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ نماز سے پہلے وضو کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ امتیاز رکھنا چاہتا ہے کہ کون اس کے دربار میں حاضر ہونے کے لائق ہے اور کون نہیں۔ اس لیے جب بھی کوئی شخص نماز ادا کرنا چاہے اسے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کا جسم اور لباس صاف ہے

Marfat.com

یا نہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کے قابل ہے یا نہیں۔ اگر وہ پوری احتیاط اور توجہ سے وضو کرے گا تو اس کے دل میں نماز کی غیر معمولی اہمیت جاگزیں ہو جائے گی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیونکہ مغربی لوگوں کے ہاں ایسی صفائی کا کوئی اہتمام نہیں، ان کے سانسوں تک سے ناگوار بو آتی ہے اور اسی لیے ان کے جسموں سے بھی بدبو آتی رہتی ہے۔ ان کے پیروں سے بھی بدبو کے بھبھوکے اور ان کے جوتوں اور جرابوں سے سڑاند اٹھتی ہے۔۔۔۔۔۔۔"

مجھے اردو کے مطالعے کے لیے زیادہ وقت اور توانائی درکار ہے۔ اس لیے میں کچھ عرصے کے لیے آپ کو مختصر خط لکھا کروں گی اور ان میں وقفہ بھی زیادہ ہوگا۔ آپ فکر نہ کیجیے گا۔ اگر میرے خط دیر سے ملیں تو اس کا مطلب ہوگا کہ میں اردو سیکھنے میں مصروف ہوں۔

آپ سے ہمیشہ پیار کرنے والی بیٹی
تمام تر محبتوں کے ساتھ
مریم

Marfat.com

پتوکی سے تیسرا خط

مریم جمیلہ
معرفت حکیم رائے نعمت علی خان
صدر طبیہ ایسوسی ایشن
مین بازار پتوکی، ضلع قصور، پاکستان
7 ستمبر 1962ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکٹرز، اپارٹمنٹ نمبر 223-C
لارچمونٹ، نیویارک، یو۔ ایس۔ اے

پیاری امی اور ابو!

مجھے آپ کا 30 اگست کا لکھا ہوا خط دو تین روز پہلے ملا۔ یہ بہت مختصر سا جلدی میں لکھا ہوا مختصر نوٹ تھا، تاہم مجھے احساس ہے کہ دن کے اختتام پر آپ کتنا تھک جاتے ہیں اور آپ کے لیے لکھنا لکھانا کتنا مشکل ہوتا ہوگا۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ کو یہ پتہ رہے کہ میں آپ کی طرف سے تفصیلی خطوں کی منتظر رہتی ہوں۔

ابو! بھائی جان نے مجھے آپ کا وہ خط دکھایا جو آپ نے انہیں ان کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ یہ بہت ہی خوبصورت خط تھا۔ ادبی لحاظ سے بھی اور محبت کے جذبات کے اظہار میں بھی۔ مولانا مودودی کے ساتھ میرے تعلقات بالکل ٹھیک ہیں۔ میرے پتوکی آنے سے پہلے انہوں نے واضح کر دیا تھا کہ وہ میری ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو رہے۔ وہ میری مدد جاری رکھیں گے، میری حوصلہ افزائی کرتے رہیں گے اور میں جب چاہوں ان سے رابطہ کر کے مشورہ اور رہنمائی حاصل کر سکتی ہوں۔ آج

Marfat.com

کل میں اُن سے اسی طرح خط و کتابت کرتی ہوں جیسے امریکہ سے کیا کرتی تھی۔ خوش قسمتی سے پاکستان میں کوئی مجھے اس وجہ سے حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتا کہ میں مالی لحاظ سے اپنا بوجھ نہیں اٹھا سکتی، یہاں عورتوں سے یہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ گھروں میں رہیں ان کے مالی معاملات اور تحفظ کی ذمہ داری مردوں پر ہے۔ پردہ نشین عورتوں سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ باہر جائیں اور اپنی روزی خود کمائیں۔

پتوکی میں ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی گزارتے ہوئے مجھے اکثر ان مسلمان دوستوں کا خیال آتا ہے جنہیں میں نیویارک میں چھوڑ آئی ہوں۔ ان میں سے ہر ایک کو میں بڑی محبتوں سے یاد کرتی ہوں۔ میں کیسے بھول سکتی ہوں امیر رشید کے پاکیزہ کردار کو، محبت کے اس تعلق کو جو میں نے ان کے اور ان کے والدین کے درمیان دیکھا۔ بلقیس کی اس بہادری کو جس سے وہ کمینے ہمسایوں کے ساتھ اکیلے رہتے ہوئے بھی اپنے بچوں کی پرورش اچھے مسلمانوں کی طرح کر رہی ہے۔ محمد احمد سکر کے میٹھے بول اور ان کی بے غرض فیاضی، ایک فلسطینی مہاجر کی قربانیاں جس کا نام مجھے یاد نہیں آ رہا، جس کی پوری فیملی اسرائیل سے لڑائی میں شہید ہوگئی، جس کے بعد اس نے دو سال کا عرصہ اردن کی جیلوں میں گزارا کیوں کہ اس کی ہمدردیاں شیخ حسن البناء اور ان کی جماعت اخوان المسلمون سے تھیں۔ اور واشنگٹن ڈی سی میں اسلامک سنٹر کے ڈائریکٹر ڈاکٹر محمود حب اللہ کی دانائی، راست بازی اور دیانت داری اور ان کا بے داغ کردار۔ میں گلین اور علی تنگورن کو بھی نہیں بھول سکتی جنہوں نے ترکی میں کمال اتاترک کی حامی حکومت کے ہاتھوں انتہائی ظلم وستم برداشت کیے، پھر وہ نیویارک آ کر پوری دیانتداری سے میڈیکل پریکٹس کرنے لگے۔ اپنی تمام تر مصروفیتوں کے باوجود وہ آدھی آدھی رات کو اٹھ کر تہجد کی لمبی لمبی نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتی جب وہ دونوں میاں بیوی اپنے چھ ہفتے کے بچے کو مجھے دکھانے کے لیے لائے۔ وہ اپنی عمر سے بڑا اور ذہین لگتا تھا۔ گلین نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں ان کے بچے کے لیے دعا کروں کیونکہ وہ اس کے مستقبل کے بارے میں بڑی فکر مند تھی۔ مجھے عبدالقادر شریف بھی

Marfat.com

اچھی طرح یاد ہے۔ وہ جنوبی کیرولینا کے ایک زراعتی گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنی جوانی کا بیشتر حصہ جیلوں اور دماغی امراض کے ہسپتالوں میں گزارا۔ جیل ہی میں وہ عالیجاہ محمد کی نسل پرست جماعت "بلیک مسلمز" میں شامل ہو گیا اور ان کا پُرجوش کارکن بن گیا۔ لیکن بتدریج اسے احساس ہوا کہ عالیجاہ محمد گمراہ شخص ہے۔ اس میں سچا اسلام ڈھونڈنے کی ایک تڑپ پیدا ہوئی۔ وہ سکول میں چوتھی جماعت سے آگے نہیں جا سکا تھا اور ایک طرح کا ان پڑھ تھا لیکن وہ اپنے فارغ اوقات نیویارک پبلک لائبریری کے مشرقی شعبے یا واشنگٹن کی لائبریری آف کانگریس میں گزارتا تھا۔ اس نے اسلامی کتابوں کے مشکل ترجمے پڑھنے سیکھے۔ اصل اسلام کی حقانیت سے واقف ہونے کے بعد اس نے عالیجاہ محمد سے رابطہ مکمل طور پر ختم کر دیا اور ایک صحیح مسلمان بن گیا۔ عبدالقادر شریف بہت ذہین آدمی ہے۔ اس کی تقریر ویسی ہی مؤثر اور پرمغز ہوتی ہے جیسے کسی پڑھے لکھے آدمی کی لیکن اسے لکھنا بالکل نہیں آتا۔ یہ کام وہ اپنے دوستوں سے کرواتا ہے۔ وہ بمشکل اپنے دستخط کر سکتا ہے۔ پاکستان آنے سے پہلے میں اور شریف گھنٹوں ایک مسجد میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ وہ کہہ رہا تھا:

"میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ مجھے کوئی ایسا وظیفہ مل جائے جس کی مدد سے میں سعودی عرب کی مدینہ یونیورسٹی میں اسلامی قوانین کا مطالعہ کر سکوں۔ تم کسی ایسے شخص کو جانتی ہو جو اس معاملے میں میری مدد کر سکے۔"

میں بروکلین کے اسلامک سنٹر کی خدیجہ فیصل کو بھی فراموش نہیں کر سکتی جو اس خستہ حال جگہ کے فرش کو رگڑ رگڑ کر صاف کرتی تھی اور آلو چھیل چھیل کر ان لوگوں کے لیے کھانا بناتی تھی جو نیویارک کی مسجد میں نہیں جا سکتے تھے۔ بروکلین کا یہ سنٹر انہیں باہم مل بیٹھنے اور نماز کی ادائیگی کی جگہ فراہم کرتا تھا۔ مجھے ابھی تک اس کے چہرے پر چھائی تھکن یاد ہے، جب اس نے مجھ سے کہا تھا کہ کوئی اور خاتون میری مدد کو نہ آئی تو میرا خیال ہے کہ میں آئندہ رمضان تک زندہ نہیں رہوں گی۔ مجھے اس کا شوہر شیخ داؤد احمد فیصل بھی اسی محبت سے یاد آتا ہے۔ اس کی جھگڑالو طبیعت اور جہالت میں یقیناً کچھ

Marfat.com

خرابیاں تھیں اور میں اس کے ذہنی توازن کے بارے میں اس سے سوال جواب بھی کرتی تھی لیکن اس کی راست بازی اور تقویٰ میں کوئی شک نہیں تھا۔ وہ ایک بچے کی سی معصومیت کے ساتھ اپنے دین پر اپنے علم کی حد تک عمل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ لوگ اسے لالچی اور خودغرض سمجھتے تھے لیکن میں جانتی ہوں کہ ایک رات جب ایک مسلمان ملاح کو کسی نامعلوم شخص نے چھرا گھونپ کر ہلاک کر دیا تھا تو آدھی رات کو اٹھ کر اس نے اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا تھا تاکہ اسے اسلامی طریقے سے دفنایا جا سکے۔ وہ ناپختہ تو تھا لیکن اس کا ایمان مضبوط اور ناقابل شکست تھا۔ اسی شخص کے سامنے میں نے کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے اسلام قبول کیا تھا اور اسی نے مجھے اسلام کا سرٹیفکیٹ جاری کیا تھا۔ مجھے وہ صبح یاد ہے جب میں اور وہ بروکلین کی گلیوں میں گھوم رہے تھے۔ وہ ایک سفید لبادہ پہنے ہوئے تھا جو شاہ ابن سعود نے اسے تحفے میں دیا تھا اور اسے اس پر بڑا فخر تھا۔ اس نے اپنا جھریوں والا ہاتھ اٹھا کر راہ چلتے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا،" مریم! دیکھو، یہ ہزاروں لاکھوں لوگ ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنے خالق، خدا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔" وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا" میری بڑی خواہش تھی کہ پچھلی مرتبہ جب میں حج کرنے گیا تھا تو وہیں سعودی عرب میں رک جاتا، لیکن یہاں اپنے کام اور ذمہ داریوں کی وجہ سے میں ایسا نہ کر سکا۔ یہ بستی بہت فاسق اور شرانگیز ہے، یہ بہت جلد مجھے ہلاک کر دے گی۔۔۔۔"

اور میری یادوں کے دریچوں میں نیویارک کی مسجد کے امام ڈاکٹر شربیہ کی یاد کا چراغ بھی روشن ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ جب میں نیویارک کے مارتھا واشنگٹن ہوٹل میں تنہا رہتی تھی تو ان کے بغیر میرا گزارہ کیسے ہوتا۔ میں وہ رات کبھی نہیں بھول سکتی جب گزشتہ رمضان کے وسط میں میں تراویح پڑھنے مسجد گئی، اس رات بڑی سخت سردی تھی، درجہ حرارت صفر کے قریب ہوگا اور سرد ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ ٹریفک کے رش کی وجہ سے بس کے سفر میں مجھے گھنٹہ لگ گیا۔ جہاں مجھے اترنا تھا، وہیں ایک نابینا خاتون بھی اتری میں نے اس کی بھرپور مدد کی کوشش کی۔ اگرچہ شروع میں وہ مجھ سے خوفزدہ

Marfat.com

ہوئی لیکن بہرحال میں نے اسے اس کے گھر پہنچایا۔ میں نے جب اسے بتایا کہ میں کہاں جا رہی تھی تو وہ بڑی پریشان ہوئی اور فکرمندی سے بولی، "تم تو بہت لیٹ ہو جاؤ گی، میں نے تمہیں لیٹ کر دیا۔" میں نے نرمی سے جواب دیا، "فکر نہ کریں، یہ بات زیادہ اہم تھی۔"

میں جب مسجد پہنچی تو امیر رشید اور ان کے والد باہر ٹھٹھرتی سردی میں کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ جب ہم نے تراویح کا آغاز کیا تو رات کے نو بجے تھے۔ صف میں امیر رشید، ان کے والد، ایک بھارتی مسلمان، تین سیاہ فام مرد، ایک سیاہ فام عورت اور میں شامل تھے۔ تراویح کی نماز لمبی اور پرمشقت ہوتی ہے۔ اس کی ادائیگی میں دو گھنٹے لگتے ہیں۔ اس میں بیس رکعات پڑھنا ہوتی ہیں یعنی بیس بار اٹھنا بیٹھنا پڑتا ہے۔ میں نے کبھی قرآن کی ایسی خوبصورت تلاوت نہیں سنی، جیسی اس رات ڈاکٹر شریبہ نے کی۔ جب ڈاکٹر شریبہ پوری دلسوزی سے قرآن پڑھ رہے تھے تو مجھے یوں لگا جیسے پورا کمرہ اسلام کی روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ میں جب بھی ڈاکٹر شریبہ کو نماز میں شامل افراد یا دوسرے ملاقاتیوں سے نرمی اور شفقت سے گفتگو کرتے دیکھتی تو مجھے حضرت یسوع مسیحؑ کا وہ قول یاد آ جاتا جو انجیل میں یوں درج ہے: "چھوٹے بچوں کو میرے پاس آنے کی تکلیف گوارا کرنی چاہیے کیونکہ آسمانی بادشاہت اسی لائق ہے۔۔۔۔۔۔"

پاکستان آنے سے پہلے مجھے اپنے ہوٹل سے جو خطوط ملے، ان میں ایک خط میں لکھا تھا، "یہ خط اخوان المسلمون کے ان چند "رجعت پسندوں" کی طرف سے ہے جو آپ کے اس ایمان و ایقان کے ساتھ ہیں جن کا اظہار آپ کی تحریروں میں ہوتا رہتا ہے۔ آپ نے تاریخ اسلامی، مسلمان ملکوں کی معاشرتی حالت، جدید مسائل، اسلام کو درپیش خطرات اور "مصلحوں" کی اسلام کو مغربانے کی کوششوں سے پوری طرح واقف ہونے کا جو مظاہرہ کیا ہے، اس سے لگتا ہے کہ آپ اپنے وقت کا زیادہ حصہ تحقیقی کاموں پر صرف کریں گی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آپ کچھ مسلمان بھائیوں کا یہ حقیر ہدیہ قبول کریں گی جو آپ کے محدود بجٹ سے کچھ دباؤ کم کر سکے۔"

Marfat.com

یہ خط گمنام تھا لیکن ڈاک کی مہر دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ یہ کس کی طرف سے بھیجا گیا تھا، ایک فلسطینی مہاجر محمد احمد سکر کی طرف سے جو ہارورڈ یونیورسٹی میں طبیعات میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ وہ نہ صرف ذہین وفطین ہیں بلکہ بڑی نفیس طبیعت کے مالک ہیں اور نرم مزاج بھی۔ مولانا مودودی کی ایک مرتبہ سعودی عرب میں ان سے ملاقات ہوئی تھی اور انہوں نے کہا: "آج کل ان سے بہتر مسلمان میسر نہیں۔" جس حقیر ہدیے کا انہوں نے خط میں ذکر کیا تھا وہ سو ڈالر کا چیک تھا۔

شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ میں اپنے ان دوستوں کے بارے میں جنہیں میں امریکہ چھوڑ آئی، کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہی ہوں لیکن یہ یادیں مجھے ہمیشہ محبوب رہیں گی۔ بلقیس نے مجھے جہاز پر الوداع کہتے ہوئے کہا تھا: "فاصلے مومنوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔"

اگر اب آپ مجھے دیکھیں تو شاید پہچان نہ پائیں۔ میں اتنی دبلی پتلی ہو گئی ہوں کہ کبھی زندگی میں نہیں رہی۔ میرے بال بہت لمبے ہو گئے ہیں۔ یہاں پتوکی میں حسن کا معیار نیویارک کے معیار سے قطعاً مختلف ہے۔ جب آپا نے میرے ناخن دیکھے تو انہیں صدمہ پہنچا اور انہوں نے فوراً میرے سارے ناخن کاٹ دیے۔ انہوں نے کہا: "لمبے ناخن بدصورت لگتے ہیں، ان میں گند بھر جاتا ہے اور یہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے بھی خلاف ہے۔ گرچہ اس وقت میں ان سے اتفاق کرتے ہوئے جھجک رہی تھی لیکن میں نے کہا کچھ نہیں اور عاجزی سے جواب دیا: "آپ کی خوشی میں میری خوشی۔" اب میرے ایک ہاتھ میں بارہ اور دوسرے میں چھ جھنجھناتی ہوئی چوڑیاں ہیں۔ اگر میں اجازت دوں تو یہاں کی عورتیں میری ناک اور کان بھی چھید ڈالیں تاکہ مجھے نتھ اور بالیاں اور کانٹے پہنا سکیں۔"

پتوکی فقیروں سے بھرا پڑا ہے۔ درحقیقت یہ ایک پھیلتا ہوا کاروبار ہے۔ یہاں کے فقیروں میں بوڑھے مرد بھی شامل ہیں، نوجوان لڑکیاں بھی اور چھوٹے بچے بھی جنہیں ان کے والدین بڑی محنت سے بچپن ہی سے مانگنا سکھاتے ہیں۔ سارا دن وہ بازاروں

Marfat.com

میں پیسوں کی بھیک مانگتے ہیں اور سورج ڈھلے وہ ہر گھر میں چپاتیاں اور سالن مانگنے پہنچ جاتے ہیں۔ دن کو وہ پیسے بٹورتے ہیں اور رات کو کھانا مانگتے پھرتے ہیں۔ اس طرح ان کا کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ یہ اچھا بھلا چالباز دھندا ہے۔ مجھے لوگوں نے بتایا کہ فقیر کافی خوشحال ہیں۔ کئی فقیر تو سخت محنت مزدوری کرنے والوں سے زیادہ توانا اور خوش لباس ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ یہ پتوکی والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ انہیں مفت روزی فراہم کریں۔ ہمارے ہاں بھی ایسے فقیر بلاناغہ ایک مقررہ وقت پر آتے ہیں۔ وہ ایک خاص کردار کے مالک ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو پچھلے بیس، تیس سالوں سے باقاعدگی کے ساتھ ہماری گلی میں آرہے ہیں۔ لیکن ایک صبح گانے کی عجیب وغریب آواز سن کر میں بڑی حیران ہوئی۔ میں اور آپا کھڑکی طرف بھاگے اور پردے کے پیچھے سے جھانکا تو عین ہماری کھڑکی کے نیچے تین صوفی فقیر تھے۔ ایک نے سفید لمبا لبادہ پہنا ہوا تھا، اس نے سر پر بالوں کی ایک لٹ چھوڑ کر باقی سر گنجا کروایا ہوا تھا اور وہ ایک دائرے میں گھوم گھوم کر رقص کر رہا تھا۔ دوسرا گا رہا تھا اور تیسرا ایک ڈھول پیٹ رہا تھا۔ ہر پندرہ منٹ کے بعد وہ رکتے تھے اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر بھیک مانگتے تھے۔

اگرچہ بھائی جان اور آپا کی اپنی کوئی اولاد نہیں لیکن ان کا گھر صبح سے شام تک بچوں سے بھرا رہتا ہے۔ آپا کی بچوں سے محبت دیکھتے ہوئے محمد انور نے اپنی چھوٹی بیٹی فرحت کی پرورش انہی کے سپرد کر رکھی ہے جو ہمارے ساتھ رہتی ہے اور یہیں سوتی ہے۔ ان کے اپنے پانچ بچے ہیں اس لیے فرحت کو انہوں نے اپنی بے اولاد بہن کے حوالے کر دیا ہے۔ فرحت غیر معمولی پیاری اور ذہین بچی ہے اور میں اس سے پیار کرتی ہوں۔ یکم ستمبر کو پتوکی کے سارے سکول سال بھر کے لیے کھل گئے تھے۔ لیکن فرحت اور اس کی ہم جولیاں ہفتے میں صرف تین دن سکول جاتی ہیں اور وہ بھی آدھے دن کے لیے۔ بھائی جان اور آپا اسے تاکید کرتے رہتے ہیں کہ وہ گھر کا کام باقاعدگی سے کیا کرے۔ میرے اردو کے استاد بتاتے ہیں کہ فرحت اپنی کلاس کی سب سے ذہین بچی ہے۔ فرحت کے کھیل کود کا ایک ساتھی چھ سالہ ہارون ہے۔ اگرچہ وہ اپنی عمر سے چھوٹا

Marfat.com

نظر آتا ہے لیکن ہے بہت خوبصورت۔ اس کی جلد کی رنگت گندمی ہے، چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں اور نازک نازک خدوخال۔ اس کا چہرہ فرشتوں کی طرح معصوم ہے لیکن وہ کبھی کبھی کسی چھوٹے بندر کی طرح شرارتوں پر اتر آتا ہے۔ کئی رات پہلے کا ذکر ہے کہ ہارون نے ہمیں ہندوؤں کے مندروں میں کیا جانے والا رقص دکھایا۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کی حرکتوں میں زبردست تال میل تھا۔ میں اس کی نزاکت اور وقار پر بہت حیران ہوئی۔ رقص کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی خوبصورت آواز میں گیت بھی گا رہا تھا۔ اس کی چھوٹی عمر کے لحاظ سے اس کے رقص اور گیت کی مہارت قابل تعجب تھی۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ یہ سب اس نے کہاں سے سیکھا تو اس نے بتایا کہ ان ہندو رقاصاؤں سے جو اپنے تہوار کے موقع پر پتوکی آ کر رقص کرتی ہیں۔ جب یہ خبر اس کے والد کو ملی تو وہ ہارون پر سخت ناراض ہوئے۔ اسے ڈانٹ ڈپٹ کی اور کہا کہ مسلمانوں کو ہندو خواتین کی نقل نہیں کرنی چاہیے۔ انہوں نے تنبیہ کی کہ آئندہ ہارون نے اس طرح کی حرکت کی تو اسے سخت سزا ملے گی۔

لاہور میں مولانا مودودی کے گھر کے مقابلے میں پتوکی کے بچے سادہ کھلونوں سے ہی بہل جاتے ہیں۔ فرحت کے پاس پلاسٹک کا ایک ہیلی کاپٹر ہے جس میں چابی بھری جائے تو فرش پر ناچا ناچا پھرتا ہے۔ ذرا بڑے بچے چھتوں پر چڑھ کر پتنگیں اڑانے کے شوقین ہیں۔ ہارون شاید بڑا ہو کر کہیں باورچی خانے کا منتظم بنے گا۔ وہ صبح چھ بجے چپاتیاں بنانا کھیلتا ہے۔ چھوٹی فرحت کے پاس ایک پرانا بوسیدہ ڈبہ ہے جس میں وہ ادھر ادھر کی بے کار چیزیں جمع کرتی رہتی ہے اور گھنٹوں انہیں ترتیب سے رکھنے میں مصروف رہتی ہے۔ ایک دن میں نے گلی میں ایک بچے کو دیکھا جو کھیل کھیل میں مؤذن بنا ہوا تھا۔ اس نے مینار پر چڑھنے کی نقل کی اور پھر بالکل صحیح طریقے سے اذان دی۔

میں اپنی فیملی کے ایک تاریخی ورثے کے بارے میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ یہ چاندی کی ایک شاندار تلوار ہے جس پر بڑی خوبصورتی سے قرآن کی عربی آیات لکھی

Marfat.com

ہوئی ہیں۔ جب بھائی جان، آپا اور محمد انور ہجرت کر کے آئے تو خون کے پیاسے ہندوؤں سے تحفظ کے لیے انہوں نے اسی تلوار پر بھروسہ کیا تھا۔ میں نے محمد انور سے پوچھا کہ کیا راستے میں اس کے استعمال کی نوبت بھی آئی یا نہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ بخیریت پاکستان کی سرحدوں تک پہنچ گئے تھے اور راستے میں ان کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ لیکن یہاں بہت سے لوگ ہیں جو تقسیم کے خون آشام واقعات کے ذکر پر سراسیمہ ہو جاتے ہیں۔ یہاں سے بارڈر صرف پچیس میل دور ہے۔

وہ واحد اخبار جو مجھے کبھی کبھار دیکھنے کو مل جاتا ہے، لاہور سے شائع ہونے والا روزنامہ پاکستان ٹائمز ہے۔ اس میں زیادہ تر مقامی خبریں ہوتی ہیں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ باقی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ باہر کی کوئی خبر ملی بھی ہے تو یہ کہ امریکی اداکارہ مارلن منرو نے چند ہفتے پہلے خواب آور گولیوں کی پوری شیشی کھا کر خودکشی کر لی۔ مجھے یاد ہے کہ میرے امریکہ سے پاکستان آنے سے پہلے اپنے شوہر آرتھر ملر سے طلاق ملنے کے بعد مارلن منرو کا اعصابی نظام جواب دے گیا تھا اور وہ نیویارک ہسپتال میں داخل رہی تھی۔ میں بھی نفسیاتی مریض کی حیثیت سے کچھ دن وہاں رہی تھی۔ شاید وہ عین اسی جگہ رہی ہو جہاں میں رہی تھی ہوں۔ "نکولیس کاٹیج" میں، اور ہو سکتا ہے وہ اسی بستر پر سوتی رہی ہو جس پر میں سوتی تھی۔ کون جانے؟

پاکستان کے اخباروں میں، اردو ہوں یا انگریزی، سب سے نمایاں جگہ سینما اشتہاروں کو دی جاتی ہے۔ آج کل لاہور میں جو امریکی فلمیں زیر نمائش ہیں، ان میں "مسرور چور"، "دلوں کا راجہ"، "عریاں جنت" اور الزبتھ ٹیلر کی "گزشتہ موسم گرما میں اچانک" شامل ہیں۔ "عریاں جنت" کے اشتہار میں ایک سڈول جسم کی عورت کو دکھایا گیا تھا جو پیراکی کے مختصر اور مہین لباس میں محو پرواز تھی اور اس کا گٹھیلے جسم والا عاشق اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ بدقسمتی سے پاکستان میں جو امریکی فلمیں آتی ہیں وہ گھٹیا ترین ہوتی ہیں، لیکن اس سے بھی گھٹیا بات یہ ہے کہ یہاں جو فلمیں بنتی

Marfat.com

ہیں، ان میں ہالی ووڈ کی ان فلموں کی بھونڈی نقالی کی جاتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ پتو کی ان لغویات سے پاک ہے البتہ ریڈیو کے ذریعے سے کچھ نہ کچھ بے ہودگی پھیلتی ہے جو مقامی اور غیر ملکی فلموں کے لچر اور فحش گانے نشر کرتا رہتا ہے۔ ہمارے کچھ پڑوسیوں کے پاس ریڈیو ہیں اور وہ کان پھاڑ دینے والی آواز میں پروگرام سنتے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ بھائی جان اور آپا کے خیالات مجھ سے ملتے ہیں اور ہم اس لعنت سے محفوظ ہیں۔

آپ نے چچی رنیور اور چچا والٹر اور کزن کیرول اور مارٹن کی شادی کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا، وہ میں نے انتہائی دلچسپی سے پڑھا۔ مجھے خوشی ہے کہ ہمارے خاندان میں باہمی تعلقات میں بہتری آئی ہے۔ خدا کرے یہ ایسے ہی رہیں۔ اپنی ہمشیر روزلین کو بتایئے گا کہ میں انہیں بھولی نہیں۔ وقت ملنے پر انہیں تفصیلی خط لکھوں گی۔

اپنی ساری محبتوں کے ساتھ

مریم

Marfat.com

پتوکی سے چوتھا خط

مریم جمیلہ
معرفت حکیم رائے نعمت علی خان
صدر طبیہ ایسوسی ایشن۔
مین بازار پتوکی، ضلع قصور، پاکستان
25 ستمبر 1962ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکرز، اپارٹمنٹ نمبر 223-C
لارچمونٹ، نیویارک، یو۔ ایس۔ اے

پیاری امی اور ابو!

آپ کے 13 اور 20 ستمبر کو لکھے خط پا کر اور آپ کی سرگرمیوں کا حال جان کر میں بہت خوش ہوئی۔ امی! مجھے "نیویارک ٹائمز" میں برونکس چڑیا گھر میں گوریلے کی کہانی بڑی دلچسپ لگی۔ میں جب لاہور میں مولانا مودودی کے ہاں رہتی تھی تو ایک دن میں نے حیدر سے پوچھا تھا کہ کیا لاہور کے چڑیا گھر میں بندر ہیں؟ اس نے بتایا تھا کہ یقیناً ہیں۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کسی دن مجھے چڑیا گھر دکھانے لے جائے گا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ یہ وعدہ وفا کرتا، میں پتوکی آ گئی۔

پتوکی میں رہتے ہوئے مجھے اکثر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی فارم میں رہ رہی ہوں کیونکہ یہاں ہر طرف جانور موجود ہیں۔ مجھے اپنا پالتو طوطا "میاں مٹھو" بہت پسند ہے۔ اس کی میرے ساتھ اتنی دوستی ہوگئی ہے کہ اب وہ میرے ہاتھ پر بیٹھ کر چوری کھا لیتا ہے۔ آپا کے بھائی محمد انور ابھی تک اپنی بھینس کے بچھڑے کی پیدائش کے منتظر

Marfat.com

ہیں۔ انہوں نے دس ماہ انتظار کیا ہے اور اب یہ پیدائش کسی بھی وقت متوقع ہے۔ میں خود شدت سے اس کی منتظر ہوں۔ ہم سب کی دعا ہے کہ بچھڑی پیدا ہو۔ ہر صورت میں یہ طے ہے کہ دودھ چھڑانے کے بعد وہ بچہ میرا ہوگا۔ یہاں ملنے والے جانوروں میں سب سے قیمتی اور مہنگا جانور بھینس ہی ہے۔ محمد انور کے پاس تین بھینسیں ہیں۔ تینوں شاندار بھینسوں کی مجموعی مالیت دو ہزار روپے سے زیادہ ہوگی۔ چوری سے بچانے کے لیے محمد انور نے ایک چوکیدار رکھا ہوا ہے جو ساری رات ان کے باڑے کے باہر پہرہ دیتا ہے۔ چوروں کو دور رکھنے کے لیے پتوکی کی پولیس اور چوکیداروں نے ایک عجیب نظام اپنایا ہوا ہے، وہ ساری رات گلا پھاڑ پھاڑ کر آسمان سر پر اٹھائے رکھتے ہیں۔ وہ رات نو بجے چیخنا شروع کر دیتے ہیں اور صبح پانچ بجے اذانوں کے وقت تک چلاتے رہتے ہیں۔ ان کی چیخ پکار کا مقصد چوروں کے دلوں میں دہشت بٹھانا اور انہیں ڈرا کر دور بھگانا ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ سارا نظام بے اثر ہو جاتا ہے۔ تین رات پہلے چار گدھے اور ساتھ والے گاؤں میں دو بھینسیں چوری ہو گئیں۔ چور بھی تو آخر اپنے پیشے کے ماہر ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس پیشے میں تخصیص حاصل کی ہوتی ہے۔ کچھ لوگ صرف گدھے چراتے ہیں، کچھ بکریاں، کچھ مرغی چور ہوتے ہیں اور سب سے نڈر اور دلیر بھینس چوری کرتے ہیں۔

کل رات بھائی جان نے گھر والوں کے لیے شاندار دعوت کا اعلان کر رکھا تھا۔ وہ ڈرگ سٹور سے واپس آئے تو ان کی بغل میں ایک مرغا تھا جو انہوں نے مجھے دیتے ہوئے کہا: "یہ آپ کے لیے ہے"۔ آپا نے کہا: "کل ہم شاندار کھانا کھائیں گے اور مرغے کو صبح ذبح کریں گے۔"

اپنے بازوؤں میں پھڑ پھڑاتے مرغے کو میں کمرے سے باہر لے گئی اور اسے میں نے ایک ٹوکرے کے نیچے بند کر دیا۔ ساری رات وہ میرے کمرے کے باہر سکون کی نیند سویا رہا، اس بات سے قطعی بے خبر کہ یہ رات زمین پر اس کی آخری رات ہے۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے کے قریب آپا نے ایک چھری تیز کی اور بھائی جان کے ہاتھ میں

Marfat.com

تھما دی۔ بھائی جان نے اسے مجھے پکڑا دیا اور کہا کہ میں تمہیں سکھانا چاہتا ہوں کہ ذبح کیسے کرتے ہیں۔ ننھی فرحت کُکڑ کوں کرتے ہوئے مرغے کو میرے پاس لائی۔ بھائی جان نے اسے فرش پر لٹا کر قابو رکھا اور مجھے کہا کہ میں "اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر، بسم اللہ" پڑھوں۔ میں نے ان کے ساتھ ساتھ یہ کلمات دہرائے۔ پھر ان کی رہنمائی میں، میں نے مرغے کے گلے پر چھری پھیر دی۔ جب وہ ٹھنڈا ہوگیا تو بھائی جان، آپا، فرحت اور میں فرش پر بیٹھ کر اس کے پر اکھیڑنے لگے۔ اب تو بے چارہ مرغا بوٹیوں میں بٹ چکا ہے اور ہانڈی میں چھن چھن کر رہا ہے۔ ہمارا لذیذ کھانا ایک آدھ گھنٹے میں تیار ہو جائے گا۔

آپا نے مرغ کے بارے میں تبصرہ کیا: "مرغا بے وقوف نہیں تھا، اس نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی نہ کوئی آواز نکالی، بہت بہادر مرغا تھا۔"

آج کل آپا مجھے پاکستانی کھانے پکانے کی تربیت دے رہی ہیں۔ شاید آپ کو ہمارے مینو کی تفصیلات دلچسپ لگیں۔ ناشتے کے وقت آپا فرش پر بیٹھ کر مٹی کے تیل کا چولھا جلاتی ہیں۔ ملازم پیاز کاٹنے میں مصروف ہوتا ہے تو آپا ایک فرائی پین میں گھی ڈال کر گرم کرتی ہیں۔ جب گھی کڑکڑانے لگتا ہے تو اس میں پیاز ڈال دیا جاتا ہے۔ جب پیاز لال ہو جائے تو اس میں ایک یا دو انڈے ڈال دیے جاتے ہیں، انہیں الٹ پلٹ کیا جاتا ہے، پھر ان پر کالی اور سرخ مرچوں کا سفوف چھڑک دیا جاتا ہے اور یوں پانچ منٹ میں ناشتہ تیار ہو جاتا ہے۔ یہ انڈے چپاتیوں کے ساتھ کھائے جاتے ہیں۔ مغربی پاکستان کے لوگوں کی عمومی خوراک یہی چپاتیاں ہیں جو ڈبل روٹی کا نعم البدل ہے۔ جب آپا چپاتیاں بنا رہی ہوتی ہیں تو ملازم ایک گھڑونچی میں دہی بلو رہا ہوتا ہے۔ وہ اتنی تیزی سے مدھانی چلاتا ہے کہ مکھن لسی کی سطح پر اکٹھا ہو جاتا ہے۔ آپا مکھن نکال کر الگ رکھ دیتی ہیں۔ گھڑونچی میں بچے ہوئے لوازمے کو لسی کہتے ہیں۔ ہم ہر صبح لسی ہی سے ناشتہ کرتے ہیں اور کافی کی جگہ یہی استعمال ہوتی ہے۔ صبح کی خریداری کے لیے آپا، ملازم یا کبھی کبھار فرحت کو بازار بھیجتی ہیں۔ آدھ گھنٹے میں وہ ایک پاؤ بکرے کا

Marfat.com

گوشت اور ایک کلو سبزیاں لے کر واپس آجاتی ہے۔ پاکستان آنے سے پہلے یہ سبزیاں میں نے کبھی نہیں دیکھیں، آلو اور پیاز کے علاوہ یہاں جتنی بھی سبزیاں ہیں، امریکہ میں نہیں ہوتیں۔ ہم گوشت اور سبزیوں کو صاف کرتے ہیں۔ گوشت کے چھوٹے چھوٹے پارچے اور سبزیوں کو کاٹتے ہیں اور گھی گرم ہونے پر انہیں ہانڈی میں ڈال دیتے ہیں۔ مرچوں اور گرم مصالحوں کا اضافہ کیا جاتا ہے اور دو گھنٹوں کے لیے اسے ابلنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ہم اسے سالن کہتے ہیں۔ اس کا شوربہ بہت مزیدار ہوتا ہے اور اس کا ذائقہ گاڑھے سوپ جیسا ہوتا ہے۔ اب آپ روٹی کا ایک ٹکڑا توڑتے ہیں اور اس سے کچھ شوربہ، بوٹی یا سبزی کا کوئی ٹکڑا اٹھاتے ہیں اور منہ میں رکھ لیتے ہیں۔ یہ سالن اور چپاتی ہمارے دن کا کھانا ہوتی ہے۔ بچا ہوا سالن ڈھک کر احتیاط سے رکھ دیا جاتا ہے اور رات کے کھانے پر کام آتا ہے۔

شام پانچ یا چھ بجے آپا اپنے بھائی محمد انور کے گھر جاتی ہیں جہاں بھینسوں سے دودھ نکالا جا رہا ہوتا ہے۔ وہ یا ملازم تازہ، گرم دودھ کی پوری بالٹی لے کر پلٹتا ہے جسے خوب ابال دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد آپا اور ملازم رات کے کھانے کے لیے چپاتی بنانے یا چاول ابالنے میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ تقریباً آٹھ بجے کے قریب سب کچھ تیار ہوتا ہے اور جیسے ہی بھائی جان کام سے پلٹتے ہیں وہ آلتی پالتی مار کر بستر پر بیٹھ جاتے ہیں، فرحت فرش پر دری پر جگہ بناتی ہے، میں اور آپا نیچے پیڑھیوں پر بیٹھتی ہیں اور دوپہر کے بچے ہوئے سالن کے ساتھ بھوک کے مطابق ایک یا دو چپاتیاں اور چاول کھاتے ہیں اور اوپر سے بھینس کا دودھ پیتے ہیں۔ پاکستانی معیار کو سامنے رکھا جائے تو ہم بہت اچھا کھانا کھاتے ہیں۔ غریب آدمی دودھ، انڈوں، گھی یا گوشت کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے اور ان کا زیادہ تر گزارہ دال روٹی پر ہوتا ہے۔ دال سے پکایا جانے والا سالن لوبیے کے گاڑھے سوپ جیسا ہوتا ہے۔

سورج ڈوبنے کے فوراً بعد پتوکی کے فقیر گھر گھر چکر لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ پتوکی کا محنت کش طبقہ کافی غریب ہے لیکن فقیروں نے عیاشی سے رہنے کا انتظام کر

Marfat.com

رکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جتنے کارکنان اس "کاروبار" میں ہیں وہ کسی اور پیشے میں نہیں۔ عام معمول تو یہ ہے کہ فقیر، دن کو بازاروں میں پیسے مانگتے ہیں اور رات کو گھروں کا چکر لگا کر کھانے کی اشیاء اکٹھی کرتے ہیں۔ لیکن کل میں نے اس سے ہٹ کر ایک نیا منظر دیکھا۔ مجھے گلی میں شور سنائی دیا۔ میں جلدی سے برقع لپیٹ کر کھڑکی میں گئی تو دیکھا کہ کئی عورتیں اور بچے ایک فقیر کو رقص کرتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی نظر آتی تھی جس کے لہراتے ہوئے لمبے سیاہ بال تھے۔ اس نے بڑی بڑی سرخ پھولدار ریشمی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور سر پر گوٹے کناری والا دوپٹہ لے رکھا تھا، ہاتھوں میں چوڑیاں اور پیروں میں چاندی کی جھانجریں تھیں۔ وہ ایک ایسا رقص کر رہی تھی جو ہندوؤں میں زیادہ مقبول ہے۔ اس رقاصہ کے ساتھ تین آدمی تھے جو آلتی پالتی مار کر زمیں پر بیٹھے تھے۔ ایک ڈھول بجا رہا تھا، دوسرا طنبورہ اور تیسرا ہارمونیم لیکن جب "رقاصہ" نے گانا شروع کیا تو میں حیران رہ گئی، آواز کسی مرد کی تھی۔ یہ رقاص مرد تھا جس نے عورتوں جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ہر پانچ منٹ کے بعد وہ رقص کرنا بند کرتا تھا اور بھیک کے لیے ہاتھ پھیلاتا تھا۔ کوئی بچہ اسے ایک کٹورہ آٹا دیتا تھا، کوئی خاتون ایک دو سکے تھما دیتی تھی۔

میرے اردو کے استاد صاحب نے یہ منظر دیکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ "کفر ہے کفر" انہوں نے تلخی سے تبصرہ کیا۔ "آج اوپر اللہ سخت ناراض ہوں گے۔" ان کے چہرے پر سخت کرب کے آثار تھے۔ وہ خاموشی سے اٹھے اور چلے گئے۔ میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی اور واپس بلایا لیکن وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گئے۔ اس رات میں نے بھائی جان کو یہ واقعہ سنایا اور پوچھا کہ استاد جی اتنے پریشان کیوں تھے؟ کیا وہ مجھ سے خفا ہو گئے؟ میں نے پوچھا۔

"نہیں وہ آپ سے خفا نہیں تھے بلکہ اپنے چھوٹے بھائی کے ہاتھوں سخت پریشان ہیں۔" "ان کے بھائی نے کیا کیا؟" میں نے پوچھا۔

بھائی جان نے وضاحت کی: "تمہارے استاد بڑے نیک اور مذہبی انسان ہیں

Marfat.com

اور ان کے لیے چھوٹے بھائی کی حرکتیں نا قابل برداشت ہیں۔"

"لیکن ان کے چھوٹے بھائی نے کیا کیا ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

بھائی جان کچھ دیر خاموشی سے مجھے تکتے رہے، پھر بولے: "تمھیں نہیں معلوم، وہ رقص کرنے والا ان کا چھوٹا بھائی ہے۔"

چند دن پہلے آپا کی ایک سہیلی انہیں ملنے آئی۔ میں اسے دیکھ کر بڑی حیران ہوئی۔ اس نے عجیب حلیہ بنا رکھا تھا۔ اس نے پیشانی پر ایک پٹی باندھی ہوئی تھی جس کے درمیان ایک گانٹھ تھی۔ اس کی قمیص کے ایک کونے میں بھی گانٹھیں بندھی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں دھات کی ایک چھوٹی سی ڈبیا تھی جسے کالی ڈوری کی مدد سے پہنا گیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ اس ڈبیا میں کیا ہے اور اس نے قمیص پر گانٹھیں کیوں باندھ رکھی ہیں۔ تو اس نے جواب دیا کہ ڈبیا میں ایک کاغذ ہے جس پر قرآنی آیات لکھی ہوئی ہیں۔ یہ لڑکی غریب تھی لیکن بہت خوبصورت۔ ایک مہینے پہلے جب وہ کسی نامعلوم وجہ سے بیمار پڑ گئی تو اس کا شوہر اسے ایک حاجی صاحب کے پاس لے گیا۔ جو یہاں سے پانچ میل دور ایک گاؤں میں رہتا ہے۔ جیسے انہیں ہدایت کی گئی تھی، وہ لڑکی کی ایک فالتو قمیص ساتھ لے گئے تھے۔ حاجی صاحب نے قمیص سونگھی اور کہا:

"کوئی ڈاکٹر نہ تمہارا علاج کرسکتا ہے نہ کوئی دوا تمہیں ٹھیک کرسکتی ہے۔"

شوہر نے پوچھا: "میری بیوی کو ہوا کیا ہے، وہ بیٹھے بٹھائے اتنی بیمار کیوں ہوگئی ہے؟"

پگڑی پوش بوڑھے نے جواب دیا: "تمہاری بیوی پر جن آ گئے ہیں، تمہاری بیوی بڑی خوبصورت ہے اور تمہیں پتہ ہے کہ کچھ مکار جن بڑے حاسد ہوتے ہیں، وہ خوبصورت لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں اور انہیں تنگ کرتے ہیں۔ تمہاری بیوی کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے اور اسی وجہ سے وہ بیمار ہے۔ اب جن بھگانے کے لیے تمہیں یہ کرنا ہوگا کہ یہ گرہوں والی پٹی لو اور اسے اپنی بیوی کی پیشانی پر باندھ دو، یہ ڈبیا لو جس میں قرآنی آیات سے لکھا ہوا ایک تعویذ ہے، اسے کالی ڈوری کی مدد سے گلے میں پہناؤ، اور یہ میں ایک خوشبو دے رہا ہوں جو تمہاری بیوی کپڑوں پر لگائے۔ جنوں کو یہ خوشبو

Marfat.com

بالکل پسند نہیں۔ اگر تم نے میری ہدایات پر عمل کیا تو کل تک تمہاری بیوی بالکل ٹھیک ہوجائے گی۔" اس خوبصورت خاتون نے جب اپنی داستان ختم کی تو میں نے پوچھا: "اب تمہارا کیا حال ہے؟"

اس نے افسردگی سے سر ہلایا اور بولی: "کوئی فرق نہیں پڑا، ویسی ہی ہوں"

اگرچہ بھائی جان اور محمد انور جدید اور قدیم دونوں قسم کی دواؤں کا کاروبار کرتے ہیں لیکن وہ بھی روحانی علاج پر یقین رکھتے ہیں۔ کچھ دن پہلے جب فرحت کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو ہر صبح بھائی جان ایک کاغذ کے ٹکڑے پر قرآنی آیات لکھتے اور پھر اسے دھوکر پانی ایک پیالے میں جمع کرتے۔ یہ روشنائی والا پانی فرحت کو پلایا جاتا اور واقعی فرحت چند دنوں میں بالکل ٹھیک ہوگئی۔ بھائی جان اور محمد انور اپنے مریضوں کو کئی طرح کی دوائیں دیتے ہیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ یہ طریق علاج زیادہ مؤثر ہے۔

فرحت کی زندگی کا محور سکول ہے جو صبح ساڑھے سات بجے کھلتا ہے۔ آپا اسے تیار کرنے کے لیے صبح سویرے اٹھتی ہیں۔ فرحت کو ہینڈ پمپ کے نیچے نہلاتی ہیں۔ یہاں گرم پانی یا نلکے کا پانی میسر نہیں اور پمپ کا پانی برف کی طرح یخ ہوتا ہے۔ فرحت کو اس طرح نہانا بالکل پسند نہیں۔ وہ بے چاری روتی ہے، چلاتی ہے لیکن آپا اسے سختی سے پمپ کے نیچے بٹھائے رکھتی ہیں اور صابن مل مل کر اس وقت تک اس پر پانی بہاتی رہتی ہیں جب تک ان کی تسلی نہ ہوجائے۔ وہ جب صاف ستھری شلوار قمیص پہن لیتی ہے تو پھر ایک اور تکلیف دہ مرحلہ آتا ہے۔ اس کے سر میں تیل لگا کر کنگھی کی جاتی ہے۔ وہ چیخ پکار کرتی رہتی ہے لیکن آپا اس کے سر میں کنگھی کرتی رہتی ہیں۔ بالآخر اس کے سنہرے بالوں میں گلابی رنگ کی ایک ربن باندھی جاتی ہے اور وہ سکول جانے کے لیے تیار ہوجاتی ہے۔ جب وہ میرے ہاتھ چوم کر مجھے خدا حافظ کہنے آتی ہے تو بہت پیاری لگتی ہے۔ اتنی صاف ستھری اور قابل محبت۔ آپا اس کے ہاتھ میں تختی، دوات، قلم اور قاعدہ جو گھر کے بنے ہوئے ایک بیگ میں رکھا ہوتا ہے، تھما دیتی ہیں اور فرحت سکول چلی جاتی ہے۔ جیسا میں نے پہلے ذکر کیا، اس کے استاد نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بڑی

Marfat.com

ذہین طالب علم ہے اور اپنی کلاس میں سب سے آگے ہے۔ اسے اپنا سکول اتنا پسند ہے کہ جب سکول میں چھٹی ہو تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ لیکن ہے تو وہ بچی ہی پچھلی جمعرات کو ایسے ہوا کہ اس نے سکول کے باہر بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھا، اس سے رہا نہ گیا اور وہ بھی بستہ اٹھا کر باہر آگئی اور سارا دن کھیل کود میں گزار دیا۔ اس کے استاد نے جب آپا کو یہ بات بتائی تو انہیں سخت غصہ آیا۔ انہوں نے اس کی خوب پٹائی کی، اس کے ہاتھ باندھ دیے اور دونوں گالوں پر طمانچے رسید کیے۔ وہ پتھر کے فرش پر گر گئی۔ وہ اس بے بسی سے رو رہی تھی کہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ آپا بڑی نرم مزاج اور شفیق خاتون ہیں۔ میں نے انہیں اس سے پہلے کبھی فرحت کی پٹائی کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ آدھ گھنٹے کی ڈانٹ ڈپٹ اور پٹائی کے بعد فرحت کی جان خلاصی ہوئی۔ جب اس کے ہاتھ اور پاؤں کھولے گئے تو وہ سسکتی ہوئی اپنی چارپائی کے نیچے گھس گئی اور ننگے فرش پر سو گئی۔ بھائی جان نے اسے چارپائی کے نیچے سے نکال کر اوپر لٹایا جہاں وہ گھنٹوں بے سدھ سوتی رہی۔ وہ اٹھنے کے بعد بھی کافی دیر تک اداس رہی اور اس کی معمول کی چلبلی طبیعت بحال ہونے میں کافی دیر لگی۔ ایک بات طے ہے کہ آئندہ فرحت کبھی سکول سے نہیں بھاگے گی۔

میں افسوس سے یہ اعتراف کرتی ہوں کہ میں ابھی تک روانی سے اردو نہیں بول سکتی۔ اگرچہ میں نے اتنی اردو سیکھ لی ہے کہ دوسروں کی بات سمجھ لیتی ہوں اور اپنی بات دوسروں کو سمجھا لیتی ہوں لیکن اردو کے قواعد کے بارے میں ابھی تک نابلد ہونے کی وجہ سے میری بات چیت ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہے۔ میں ایسے بات کر لیتی ہوں جیسے تین سے چار سال کا بچہ کرتا ہے اور اتنا کچھ لکھ لیتی ہوں جتنا مولانا مودودی کی چھ سالہ عائشہ لکھتی ہے۔ پچھلے ہفتے میں نے قاعدہ ختم کر لیا تھا اور اب میں نے چھ سات سال کے بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیاں پڑھنی شروع کی ہیں۔ میری کہانیوں کی کتاب میں اسلامی تاریخ کے بڑے لوگوں کی مثالیں ہیں جیسے ہارون الرشید جب چھوٹا بچہ تھا تو اپنے استاد کی کتنی عزت کرتا تھا اور یہ کہ چھوٹے بچوں کو کس طرح اپنے والدین، اساتذہ اور بڑوں کا احترام کرنا چاہیے۔ آج کل میں رکانہ کے بارے میں ایک کہانی پڑھ رہی ہوں جو

Marfat.com

عرب کا ایک گراں ڈیل پہلوان تھا اور وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کشتی لڑنا چاہتا تھا۔ ہمارے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بڑے بہادر تھے اور انہوں نے اس کا چیلنج قبول کر لیا۔ جب آپ نے اسے تین بار پچھاڑ دیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسلام قبول کر کے باقی زندگی اسلام کے لیے وقف کر دے گا۔

میری اردو کا علم اس حد تک نہیں پہنچا کہ میں یہ کہہ سکوں کہ میرا ذہنی افق وسیع ہو گیا ہے۔ ابھی تو میں اس سطح پر ہوں کہ "بلی چوہے کے پیچھے بھاگی" جیسے فقرے پڑھوں اور سمجھوں۔ میں جب بلی چوہے کی سطح سے بلند ہو کر علامہ اقبال کی شاعری اور شاہ ولی اللہ کے خطبات پڑھ سکوں گی تو میرے احساسات مختلف ہوں گے اور میں اس زبان میں صحیح دلچسپی لوں گی۔ مولانا مودودی میرے اردو سیکھنے میں بہت دلچسپی لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ روزمرہ کی بول چال کے ساتھ میں اس ادب عالیہ کو پڑھنے کے قابل ہو جاؤں جو تقسیم سے پہلے دہلی کا طرہ امتیاز تھا، ابھی تک تو میں اس منزل سے بہت دور ہوں۔

اردو سیکھنے میں کافی وقت صرف ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود میں انگریزی کے مضامین لکھنے کے لیے وقت نکال لیتی ہوں۔ مجھے پاکستان آئے ہوئے تقریباً تین مہینے ہو گئے ہیں۔ اس دوران میں مَیں نے چار بالکل نئے مضامین اور مقالے لکھے ہیں جن میں دنیائے اسلام پر مغرب کے اثرات اور ان کوششوں کی مذمت کی گئی ہے جو مصلحین، اسلام کو جدید بنانے کے لیے کرتے رہتے ہیں۔ درحقیقت آج کل میں تین کتابوں پر بیک وقت کام کر رہی ہوں، "اسلام اینڈ ماڈرن ازم"، "اسلام ان تھیوری اینڈ پریکٹس" اور "ویسٹرن سویلائزیشن کنڈیمنڈ بائی اٹ سیلف"۔ جب میں پاکستان آئی تھی تو اپنے ناول "احمد خلیل" کا نظر ثانی شدہ متن بھی ساتھ لے آئی تھی۔ یہ ایک فلسطینی مہاجر اور اس کے خاندان کی کہانی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ ناول عنقریب لاہور سے شائع ہو جائے گا۔ بھارت کے شہر کیرالا سے شائع ہونے والا رسالہ "میسیج"، کراچی کا ماہنامہ "وائس آف اسلام" اور لاہور کا ہفت روزہ "شہاب" میرے مضامین چھاپتے رہتے ہیں۔ استنبول سے کمال کیوسکو نے مجھے لکھا ہے کہ "اسلام بمقابلہ مغرب" پر جو مضامین میں نے انہیں بھیجے تھے، انہوں نے ان کا ترکی زبان میں ترجمہ مکمل کر لیا ہے اور کتابی شکل میں

Marfat.com

اس کا مسودہ پریس میں ہے۔ چند ہفتوں کے اندر اندر یہ کتاب برائے فروخت میسر ہوگی۔ روزنامہ کوہستان نے میرا مقالہ "مغربی تہذیب بمقابلہ اسلامی تہذیب: حقائق اور مغالطے" شائع کیا ہے۔ سعودی عرب میں مکہ کے مقدس شہر سے شائع ہونے والے روزنامہ "الندوۃ" نے میرے اس مضمون کا عربی ترجمہ شائع کیا ہے جس میں، میں نے مصر کے صدر ناصر کی الاظہر یونیورسٹی کو قومیانے اسے سیکولر اور جدید بنانے کی سخت مذمت کی ہے۔ اس کے اقدامات سے دنیائے اسلام میں علوم اسلامیہ کا ایک اہم ترین بین الاقوامی مرکز تباہ ہوگیا ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ چھ مہینے کے بعد درجہ حرارت دن کے وقت کبھی 90 ڈگری فارن ہائٹ سے نیچے نہیں آیا۔ بلکہ 100 ڈگری سے اوپر ہی رہتا تھا، گرنا شروع ہوگیا ہے اور موسم ٹھنڈا ہونے لگا ہے، خاص طور پر رات کے وقت۔ اب موسم صاف ہے، دھوپ نکلی رہتی ہے اور درجہ حرارت 85 کے قریب رہتا ہے۔ پورے پاکستان نے اطمینان کا سانس لیا ہے۔

میں امریکہ میں اپنے پاکستانی دوستوں کے ساتھ خط و کتابت کرتی رہتی ہوں۔ محمد احمد سکر نے مجھے یہ اچھی خبر سنائی ہے کہ نیویارک میں مسلمانوں کی حالت گزشتہ چند مہینوں میں بہتر ہوئی ہے۔ امریکی باشندوں کا اسلام قبول کرنا معمول ہوگیا ہے اور امریکہ میں مسلمان بہتر انداز میں منظم ہو رہے ہیں۔

مجھے "یونی ٹیرین چرچ" کے پادری مسٹر ویسے کے دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل ہونے کی خبر سن کر بہت افسوس ہوا۔ کیا وہ ابھی تک نیویارک کے ہسپتال میں ہیں؟ اگر آپ بتانا پسند کریں تو میں تفصیلات جاننا چاہوں گی۔

میں آپ کی آج کل کی مصروفیات کے بارے میں مزید تفصیلات جاننا چاہتی ہوں۔ آپا اور بھائی جان کے دلوں میں آپ کا بہت احترام ہے اور وہ اکثر آپ کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔

آپ کی محبت کرنے والی بیٹی

مریم

Marfat.com

پتوکی سے پانچواں خط

مریم جمیلہ
معرفت حکیم رائے نعمت علی خان
صدر طبیہ ایسوسی ایشن
مین بازار پتوکی، ضلع قصور، پاکستان
12 اکتوبر 1962ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکڑز، اپارٹمنٹ نمبر 223-C
لارچمونٹ، نیو یارک، یو۔ ایس۔ اے

پیاری امی اور ابو!

آپ کا 29 ستمبر کا لکھا ہوا وہ خط مجھے ایک ہفتے پہلے مل گیا تھا جس میں آپ نے مجھ سے جلد خط لکھنے کی تاکید کی تھی کیونکہ کافی عرصے سے آپ کو میرا کوئی خط نہیں ملا۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کو میرے 20 اور 27 ستمبر کو لکھے ہوئے خط نہیں ملے۔ میرا خیال ہے کہ میرا 20 ستمبر کا خط اس لیے روک لیا گیا ہے کہ اس میں، میں نے مولانا مودودی کا تفصیلی ذکر کیا تھا۔ 27 ستمبر والے خط کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی کیونکہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کا دور سے بھی سیاست سے کوئی تعلق ہو۔

کیونکہ بھائی جان اور آپا اپنے مکان کی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں تھے، اس لیے آج کل وہ اس کی مرمت اور تعمیر نو میں مصروف ہیں۔ کام پانچ دن پہلے شروع ہوا تھا اور امکان ہے کہ اسے ختم ہونے میں ایک یا دو مہینے لگ جائیں گے۔ اس دوران میں محمد انور نے مجھے اپنے گھر ٹھہرا لیا ہے اور یہاں مجھے وہ سکون اور خاموشی میسر ہے جو مجھے

Marfat.com

اپنے مطالعے اور لکھنے لکھانے کے لیے درکار تھی۔ بھائی جان اس پر رضامند نہیں تھے لیکن محمد انور نے انہیں منا لیا۔ چنانچہ میں ایک دو مہینوں کے لیے اپنی کتابیں اور سامان اٹھا کر یہاں آ گئی۔ محمد انور کا کنبہ کافی بڑا ہے لیکن ان کا گھر بھی کافی وسیع اور کشادہ ہے۔ رات کو میں دوسروں کے ساتھ نیچے اپنی چارپائی پر سوتی ہوں لیکن دن کو میں اوپر چلی جاتی ہوں جہاں چھت پر ایک کھلا اور ٹھنڈا کمرہ ہے اور مجھے کام کرنے کے لیے تنہائی مل جاتی ہے۔ اپنا ٹائپ رائٹر، اپنی کتابیں اور اپنے لکھے ہوئے کاغذات میں یہیں رکھتی ہوں۔ رات کو اس کمرے کو تالا لگا دیا جاتا ہے۔

میں آپ کو اپنے دن کے پروگرام کی تفصیلات بتاتی ہوں۔ اذان کی آواز بھینسوں سمیت ہر شخص کو ٹھیک صبح ساڑھے چار بجے اٹھا دیتی ہے۔ ہم اٹھ کر وضو کرتے ہیں اور فجر کی نماز ادا کرتے ہیں۔ محمد انور جماعت سے نماز کی ادائیگی کے لیے قریبی مسجد میں چلے جاتے ہیں جو تین چار گھر چھوڑ کر، ہماری گلی ہی میں واقع ہے۔ نماز سے فارغ ہوتے ہیں تو تینوں بھینسیں بری طرح ڈکرانے لگتی ہیں تا کہ کسی کو یہ شک نہ رہے کہ انہیں سخت بھوک لگی ہے۔ ملازم لپک کر بازار جاتا ہے اور پندرہ بیس منٹ میں ان کا ناشتہ لے آتا ہے۔ ایک بالغ بھینس، ایک دن میں اوسطاً ڈیڑھ سو کلو بھوسہ کھا جاتی ہے۔ جب وہ ناشتہ فرما لیتی ہیں تو انور کی بیوی ایک بالٹی دھو کر اس میں اس کا دودھ دوہتی ہے۔ اس وقت تک ان کے اپنے چار بچے بھی اٹھ چکے ہوتے ہیں اور ناشتے کے لیے شور مچا رہے ہوتے ہیں۔ عورتیں چھت پر سے اپلے اتار کر لاتی ہیں جنہیں گزشتہ روز سوکھنے کے لیے چھت پر ڈالا گیا تھا۔ یہ اپلے ایندھن کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور چولھوں میں آگ انہی سے جلائی جاتی ہے۔ محمد انور کی بیوی دودھ ابالتی ہے اور روٹیاں پکاتی ہے۔ جیسے ہی ناشتہ ختم ہوتا ہے، بڑے بڑے سیاہ کووں کے جھنڈ کے جھنڈ بچی کھچی چیزیں چننے کے لیے تشریف لے آتے ہیں۔ یقین کریں، اگر کھانے پینے کی چیزوں کی حفاظت نہ کی جائے تو کووں، چیلوں اور گدھوں کے جھنڈ اور گلی میں پھرنے والی بلیاں اور آوارہ کتے سب کچھ چرا کر لے جائیں۔ ناشتے کے بعد بچوں کو نہلایا

Marfat.com

دھلایا جاتا ہے اور ان کے کپڑے تبدیل کیے جاتے ہیں۔ یہاں پتوکی میں چھ سال تک کے بچے عموماً ننگے رہتے ہیں۔ بہت ہوا تو انہیں ایک قمیص یا کچھا پہنا دیا جاتا ہے۔ ماؤں کو پوتڑے دھونے کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں کیونکہ بچوں کو "نیپی" پہنائی ہی نہیں جاتیں۔ جب بچے ذرا بڑے ہوتے ہیں تو انہیں ایسے پاجامے پہنائے جاتے ہیں جن کے آگے اور پیچھے شگاف ہوتے ہیں، جن سے ماؤں کو بھی آسانی رہتی ہے اور بچوں کو بھی۔

جب بچے فارغ ہو جاتے ہیں تو میں غسل کرتی ہوں۔ یہ بڑا سادہ سا معاملہ ہے۔ آپ ہینڈ پمپ سے ٹھنڈے پانی کی ایک بالٹی بھرتے ہیں۔ صابن، تولیہ اور اپنے صاف کپڑے لے کر غسل خانے میں جاتے ہیں۔ پورے جسم پر صابن مل کر مگے کی مدد سے پورے جسم پر پانی بہاتے ہیں۔ اگر موسم ٹھنڈا ہو اور پمپ کا پانی یخ ہو تو چولھے پر گرم کیا جا سکتا ہے۔

ناشتہ ختم ہونے کے ساتھ ہی دوپہر کے کھانے کی تیاریاں ہونے لگتی ہیں۔ صبح کا بیشتر وقت انھی میں صرف ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ بڑے بدقسمت ہیں جنہیں آٹا، دالیں اور دودھ بازار سے خریدنا پڑتا ہے۔ دکاندار اتنے بے ایمان اور بے اصول ہو گئے ہیں کہ کھانے پینے کی خالص چیزیں خریدنا ناممکن ہو گیا ہے۔ آٹے، دودھ، دالوں اور دیگر اشیاء میں ملاوٹ کی جاتی ہے اور بعض اوقات ان میں ایسی کیمیاوی اشیاء ڈال دی جاتی ہیں جو یقینی طور پر انسانی صحت کے لیے مضر ہیں۔ اگر یہ ملاوٹ والی اشیاء مضر صحت نہ بھی ہوں (جیسے دودھ میں پانی کی ملاوٹ) تو بھی اشیائے خوردنی کی غذائی صلاحیت کو کم کر دیتی ہیں۔ ہمارے پاس اس مسئلے کا حل ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہماری اپنی بھینسیں ہیں۔ محمد انور کی اہلیہ ان کے دودھ سے گھی بنا لیتی ہیں۔ سٹور سے ملنے والے گھی میں ملاوٹ ہوتی ہے۔ خالص آٹے کے لیے محمد انور کا ایک مقامی کسان سے ٹھیکہ ہے جس سے ہم کافی مقدار میں گندم خریدتے ہیں۔ عورتیں چھت پر بیٹھ کر گندم صاف کرتی ہیں اور دانہ دانہ الگ کر کے تنکے اور کنکریاں چنتی ہیں۔ بچوں کو اس کام پر مامور کیا جاتا ہے

Marfat.com

کہ وہ بھوکے کووں کو دور بھگائیں۔ گندم کی صفائی کے بعد اسے گھر ہی میں ہاتھ کی چکیوں پر پیسا جاتا ہے یا کبھی کبھار ایک مقامی چکی پر مشینوں پر پسوایا جاتا ہے۔ پانچ روپے میں ایک پلا پلایا مرغا مل جاتا ہے جس سے بہترین کھانا تیار ہو جاتا ہے، صاف اور اچھے گوشت کے حصول کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ کوئی صحت مند بکرا یا مرغا خریدا جائے اور اسے گھر ہی میں ذبح کیا جائے۔ ہم یہی کرتے ہیں۔ گھر میں پلنے والے پرندوں میں صرف مرغوں کو ذبح کیا جاتا ہے، مرغیاں انڈوں کے لیے رکھی جاتی ہیں۔ صبح دس بجے کے قریب، ملازم بڑے اہتمام سے تینوں بھینسوں کو تازہ ہوا کے لیے باہر لے جاتا ہے۔ انہوں نے جب پہلی بار مجھے دیکھا تھا تو ڈر کر بھاگ نکلی تھیں۔ ملازم بڑی مشکلوں سے انہیں پکڑ کر لایا اور بڑی مشکل سے انہیں رام کیا۔ مجھے یہ بات عجیب اور مزاحیہ لگتی ہے کہ اتنے مضبوط سینگوں والا وسیع الجثہ جانور جس کا وزن ایک ٹن سے کیا کم ہوگا، مجھ جیسی حقیر اور ناچیز مخلوق سے ڈر جائے۔ محمد انور نے وضاحت کی: "وہ تمہیں پہچانتی نہیں ہیں، اس لیے تم سے ڈر گئی تھیں۔"

اس دوران میں ہمارا کشادہ صحن اڑوس پڑوس کی عورتوں سے بھر جاتا ہے جو گپ شپ کے لیے یہاں آجاتی ہیں۔ پورا صحن ان کے اودھم مچاتے بچوں سے بھر جاتا ہے۔ گپ شپ کے دوران میں کئی عورتیں اپنے بچوں کو دودھ بھی پلاتی رہتی ہیں۔ میں جتنی عورتوں کو جانتی ہوں، سب اپنے بچوں کو اپنا دودھ ہی پلاتی ہیں۔ دو تین سال سے پہلے ان کا دودھ نہیں چھڑایا جاتا۔ وہ واحد خاتون جسے میں نے بوتل سے دودھ پلاتے دیکھا، مولانا مودودی کے گھر میں آئی ہوئی، حسن کی والدہ تھیں۔ لیکن یہ ان کا اپنا انتخاب نہیں تھا۔ وہ اتنی کمزور اور لاغر تھیں کہ ان کی چھاتیوں میں دودھ ہی نہیں تھا۔

آپ نے ذکر کیا تھا کہ کزن جم اور شیلیا کی چھوٹی بیٹی ارنسٹ اتنی پیاری ہے کہ اسے دیکھ کر دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی ایسے بچوں کی کمی نہیں۔ گرچہ تینوں بچے ہی خوبصورت ہیں۔ فرحت کے علاوہ دو چھوٹے بچے اور ہیں جو مجھے بڑے محبوب ہیں۔ فرحت کا چھ مہینے کا چھوٹا بھائی عثمان اور اس کا تین سال کا چچازاد بھائی نعیم

Marfat.com

اشرف جو سلیمہ کا چھوٹا بھائی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھیں تو وہ اتنا مچلتا ہے کہ اسے گود میں لیے بغیر رہا نہیں جاتا۔ گول مٹول ہے، پھولے ہوئے گالوں کے ساتھ مسکراتا ہے تو بہت خوبصورت لگتا ہے۔ مجھے اس کی بڑی بڑی چمکدار سیاہ آنکھیں اس وقت بڑی اچھی لگتی ہیں جب وہ بڑے اشتیاق سے مجھے دیکھتا ہے۔ عثمان جیسے بچے بہت کم نظر آتے ہیں۔ نعیم اشرف ننگ دھڑنگ رہتا ہے۔ اس کا ننھا سا معصوم چہرہ ہے اور بڑی بڑی چمکدار آنکھیں۔ اگر میری کبھی شادی ہوئی اور بچے ہوئے تو میں چاہوں گی کہ وہ ہوبہو فرحت، عثمان اور نعیم اشرف جیسے ہوں۔

سہ پہر کو ٹھیک تین بجے میرے اردو کے استاد آ جاتے ہیں اور پانچ بجے تک میں سبق پڑھتی ہوں۔ مجھے پڑھانے کے بعد وہ فرحت کو پڑھاتے ہیں۔ میں اور فرحت اب ایک ہی سبق پر نہیں ہیں۔ پچھلے مہینے میں اس سے دو سال آگے نکل گئی ہوں اور اب آٹھ سالہ بچوں کی سطح کی کتابیں پڑھ سکتی ہوں۔ البتہ قواعد نہ جاننے کی وجہ سے میری گفتگو اتنی انوکھی ہوتی ہے کہ بھائی جان اور آپا کے علاوہ شاید ہی کوئی سمجھ سکے۔ جب آپا کی سہیلیاں ہم سے ملنے آتی ہیں تو آپا میری ٹوٹی پھوٹی اردو کا سلیس اردو میں ترجمہ کرتی ہیں۔ تب انہیں میری بات سمجھ میں آتی ہے۔

اگرچہ ہمارے گھر میں بجلی ہے لیکن اس کا کرنٹ بہت کمزور ہے۔ روشنی اتنی مدھم ہوتی ہے کہ اس میں نہ پڑھا جا سکتا ہے نہ لکھنے کا کوئی انتظام کیا جا سکتا ہے، چنانچہ میں سو جاتی ہوں۔ محمد انور کے گھر میں عشاء کی نماز کے بعد سب سو جاتے ہیں۔ اس وقت آٹھ، پونے آٹھ بجے ہوتے ہیں۔ کسی ناگہانی مہمان کی شب بسری کے لیے ایک آدھ چارپائی ہمیشہ فالتو رکھی جاتی ہے۔

یہاں پتوکی کی عورتیں ناخنوں کی پالش یا لپ اسٹک استعمال نہیں کرتیں بلکہ اس کے لیے کچھ دوسری چیزیں استعمال کرتی ہیں۔ جیسا میں نے پہلے ذکر کیا تھا، یہاں کی عورتیں زیورات کی بڑی شوقین ہیں۔ ناک میں کوکے یا نتھ، کانوں میں بالیاں اور کلائیوں میں چوڑیاں پہنتی ہیں۔ میں لاہور سے جو چھ چوڑیاں لائی تھی، بہت نازک

Marfat.com

تھیں اور اب تک ساری ٹوٹ گئی ہیں۔ البتہ سلیمہ نے مجھے دھات کی چوڑیاں دی ہیں، جو کافی مضبوط ہیں اور اب تک چل رہی ہیں۔ اس نے یہ چھ چوڑیاں ایک روپے (چھ سینٹ) میں خریدی تھیں۔ آرائش کے لیے ہر عورت تیل، مہندی اور سرمہ استعمال کرتی ہے۔ آپا ہر وقت میرے سر میں تیل ڈالتی رہتی ہیں۔ کیونکہ سورج کی تپش سے سر بار بار خشک ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کے لیے وہ سرمہ استعمال کرتی ہیں جن سے آنکھیں سیاہ اور چمکدار نظر آتی ہیں۔ مرد اور بچے بھی سرمہ استعمال کرتے ہیں۔ مہندی اور حنا ایک خاص درخت کے پتوں سے حاصل کی جاتی ہے۔ ان پتوں کو پیس کر ان کا سفوف بنایا جاتا ہے اور جب اسے پانی میں ملاتے ہیں تو یہ کیچڑ کی سی شکل کا ہو جاتا ہے۔ اسے لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی ایک لگدی ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر مٹھی بند کر لی جاتی ہے اور پھر پورے ہاتھ پر ایک کپڑا لپیٹ دیا جاتا ہے اور اسے پوری رات ایسے ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ دن کے وقت آپ کپڑا اتارتے ہیں، مہندی کو جو خشک ہو چکی ہوتی ہے، جھاڑتے ہیں اور ہاتھ دھوتے ہیں تو ہتھیلیاں خوبصورت نارنجی رنگ میں دمک رہی ہوتی ہیں۔ دوسری رات، دوسرے ہاتھ کے ساتھ یہی عمل دہرایا جاتا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو پیروں کے تلووں پر بھی مہندی لگا سکتے ہیں۔ مہندی کا یہ رنگ پکا ہوتا ہے اور ہاتھ دھونے سے اترتا نہیں ہے۔ یہ تبھی اترتا ہے جب نئی جلد نکل آتی ہے۔ اس پر آپ پھر مہندی لگا لیتے ہیں۔ آپا، سلیمہ، فرحت اور دوسری رشتہ دار خواتین کی طرح آج کل میرے ہاتھ بھی مہندی سے رنگے ہوئے ہیں۔ جب عمر گزرنے کے ساتھ بال سفید ہونے لگیں تو مہندی سر کے بالوں اور ڈاڑھی پر بھی لگائی جاتی ہے۔ پاکستانیوں کی طرح عربوں میں بھی مہندی کا رواج ہے بلکہ خوبصورتی کے یہ طریقے سنت ہیں یعنی ہمارے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، ان کی بیویاں حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما اور ان کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی مہندی استعمال کرتی تھیں۔

بھائی جان اور آپا سے تو ریڈیو برداشت نہیں ہوتا لیکن محمد انور کے پاس ایک بڑا قیمتی ریڈیو سیٹ ہے۔ وہ شام کو جب کام سے لوٹتے ہیں تو "بی بی سی" یا "وائس آف

Marfat.com

امریکا" سنتے ہیں۔ کل رات" والئی آف امیریکا" پر سیمی ڈیوس جونیئر کا انٹرویو ہو رہا تھا اور فلمیں اور شبینہ کلبیں زیر بحث تھیں۔ اس کے بعد راک اینڈ رول، ٹوسٹ اور جاز کی دھنیں سنائی گئیں۔ اس دوران میں قریبی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔ میں صحن میں نکل آئی۔ نظریں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ مطلع بالکل صاف تھا اور تارے نکلے ہوئے تھے۔ ریڈیو کے اس بے ہودہ پروگرام کے بعد اذان کی آواز اس سے پہلے کبھی مجھے اتنی خوبصورت نہیں لگی۔

مجھے لگتا ہے کہ میں چاروں طرف سے ڈاکٹروں اور مسیحاؤں میں گھری ہوئی ہوں۔ نہ صرف یہ کہ بھائی جان اور محمد انور حکمت کا کام کرتے ہیں بلکہ بھائی جان کے چھوٹے بھائی بھی یہی کام کرتے ہیں۔ ہمارے قریب ترین ہمسائے ننھے ہارون کے والد بھی ڈاکٹر ہیں۔ ان خاندانوں کا یہ آبائی پیشہ ہے۔ حکیم کا مطلب ہے ڈاکٹر۔ عربی زبان میں اس کے لغوی معنی ہیں" دانا آدمی"۔ "شریفہ میڈیسن کمپنی" ادویات کا سٹور بھی ہے اور ڈسپنسری بھی۔ انہیں یونانی دواؤں میں تخصیص حاصل ہے۔ بھائی جان خود یونانی طریق علاج کے حامی ہیں۔ یہ طریق علاج ازمنہ وسطیٰ کے یونانیوں اور عرب مسلمانوں سے لیا گیا ہے۔ یونانی طریق علاج یہاں اور ہندوستان میں خاصا مقبول ہے۔

حال ہی میں میں نے دو بڑی اچھی سہیلیاں بنائی ہیں۔ ان بہت سی خواتین میں جو مجھے ملنے آتی ہیں دو برازیل کی خواتین بھی تھیں۔ ان میں سے بڑی، سفید بالوں والی پچاس سالہ خاتون ہے جنہوں نے ایک پاکستانی سے شادی کی ہے اور وہ پچھلے پچیس سالوں سے ساہیوال میں رہ رہی ہیں، ان کے شوہر مولانا مودودی کے دوستوں میں سے ہیں۔ ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ چھوٹی والی تیس کے پیٹے میں ہیں اور کنواری۔ وہ بچپن ہی سے دوسری خاتون کی سہیلی ہیں۔ یہ خاتون جن کا نام مارلینا گرنیشیا ہے، کئی مہینوں تک اپنی سہیلی کے ساتھ رہیں۔ اس نے اپنے کیریر کا آغاز ایک شبینہ کلب میں رقاصہ اور گلوکارہ کی حیثیت سے کیا تھا۔ اپنی سہیلی کے ساتھ رہ کر وہ اسلام سے اتنا متاثر ہوئی کہ اس نے اپنا کیریر چھوڑنے اور عیسائیت کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کیا

Marfat.com

اور ارادہ کیا کہ کسی نیک سیرت مسلمان سے شادی کر لے۔ دونوں خواتین بہت ذہین ہیں اور بالکل ٹھیک انگریزی بولتی ہیں۔ ان خواتین کے برعکس جو آ کر بس مجھے گھورتی رہتی ہیں اور جن سے تبادلۂ خیال ایک تکلیف دہ امر ہے، ان خواتین کا آنا مجھے بہت اچھا لگا کیونکہ میں ان سے پر مغز گفتگو کر سکتی تھی۔

یہ دو مرتبہ مجھ سے ملنے آ چکی ہیں۔ بھائی جان نے مارلینا کو پیشکش کی ہے کہ وہ میرے پاس آ کر ٹھہر جائے۔ وہ اور محمد انور اس کے لیے مناسب بر ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔ میں نے مولانا مودودی کو بھی مارلینا کے بارے میں لکھا ہے۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس کی مدد کی پوری کوشش کریں گے۔ میں بڑی شدت سے مارلینا کے پھر سے آنے کی منتظر ہوں۔ وہ بڑی خوبصورت اور خوش مذاق خاتون ہے۔ اس کی سہیلی نے بھی مجھے ساہیوال آ کر ایک دو ہفتے ٹھہرنے کی دعوت دی ہے لیکن میرے لیے سفر کرنا آسان نہیں ہے۔ پردے کی وجہ سے پتوکی جیسے دور دراز قصبے سے بھی باہر نکلنا بڑا مشکل ہے۔

برازیل کی بڑی والی خاتون پاکستان میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ بہت خوش تھی لیکن اس کے ساتھ ایک سانحہ یہ ہوا کہ اس کی اکلوتی بیٹی کا دو سال پہلے نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ اس دوران میں وہ بتدریج کمزور ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ اب وہ دن رات بستر پر پڑی رہتی ہے، نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ بھوک کی وجہ سے اس کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے اور اب اگر اسے فوری طور پر ہسپتال میں داخل نہ کیا گیا تو وہ فوت ہو جائے گی۔ اب فریدہ لاہور کے دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل ہے جہاں اسے ایک نالی کے ذریعے سے خوراک دی جاتی ہے اور بجلی کے جھٹکے لگائے جاتے ہیں۔

اب اکتوبر کا وسط آ گیا ہے لیکن پتوکی کا درجہ حرارت 85 ڈگری سے اوپر ہی رہتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ گرمی کی شدت کا موسم گزر چکا۔

اپنی ساری محبتوں کے ساتھ

مریم

Marfat.com

پتوکی سے چھٹا خط

مریم جمیلہ
معرفت حکیم رائے نعمت علی خان
صدر طبیہ ایسوسی ایشن،
مین بازار پتوکی، ضلع قصور، پاکستان
یکم نومبر 1962ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکڑز، اپارٹمنٹ نمبر C-223
لارچمونٹ، نیویارک، یو۔ ایس۔ اے

بہت ہی پیاری امی اور ابو!

آپ کا 23 اکتوبر کا خط پا کر اور یہ جان کر کہ فیملی کا ہر شخص خوش وخرم ہے، میں بہت خوش ہوئی۔

ہمارے گھر میں مرمت اور تعمیر نو کا کام اگلے مہینے کے وسط تک جاری رہے گا۔ اسے بالکل نئے سرے سے بنایا جا رہا ہے۔ میرا یہاں محمد انور کے ہاں قیام بالکل عارضی ہے۔ گھر کی مرمت مکمل ہونے پر میں یقیناً آپا اور بھائی جان کے ہاں منتقل ہو جاؤں گی۔

آپ کو شاید یقین نہ آئے، یہاں نومبر شروع ہو چکا ہے لیکن ابھی تک دن کے وقت درجہ حرارت 90 ڈگری فارن ہائٹ تک رہتا ہے۔ راتیں اور صبحیں البتہ خوشگوار حد تک ٹھنڈی ہو گئی ہیں اور اس وقت درجہ حرارت 50 سے 60 ڈگری فارن ہائٹ تک ہوتا ہے۔

Marfat.com

بچوں نے ہاتھ کے بنے ہوئے سویٹر، عورتوں نے اونی شالیں اور مردوں نے بھاری سفید کمبل استعمال کرنے شروع کر دیے ہیں۔ چاروں طرف بیماریوں نے ڈیرا ڈال دیا ہے- نزلہ، زکام، انفلوئنزا، گلوں کی خرابی اور ختم نہ ہونے والی کھانسی- دن کے وقت لاکھوں، کروڑوں مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔ اور رات کے وقت مچھر ان کی جگہ لیتے ہیں۔ پتوکی میں زیادہ پھیلنے والی بیماریاں ملیریا، ٹائیفائیڈ، پیچش، تپ دق اور چیچک ہیں۔ ایک دن بھائی جان نے بتایا کہ ایک معصوم بچہ چیچک کی بیماری میں مر گیا۔ انور کے تمام بچے فلو کا شکار ہیں۔ چھوٹی فرحت کو فلو کے ساتھ ساتھ اتنا تیز بخار ہے کہ اس کا جسم پھنک رہا ہوتا ہے۔ بھائی جان اور محمد انور بخار یا سر درد کے لیے کبھی اسپرین تجویز نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسپرین معدے اور دل کے لیے مضر ہے، وہ اسپرین کے اتنے خلاف ہیں کہ ان کے خیال میں اسپرین کھانے سے کہیں بہتر ہے کہ بندہ تیز بخار کو برداشت کر لے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں ہر طرح سے ٹھیک ہوں۔ انور، بھائی جان، آپا اور انور کی اہلیہ بھی ہر بیماری سے محفوظ ہیں۔ یہ بیماریاں زیادہ تر چھوٹے بچوں یا بڑی عمر کے لوگوں کو گھیرتی ہیں۔

مَیں آپ کو ایک واقعہ بتانا بھول گئی جو میرے آنے کے بعد سے اب تک کے عرصے میں ہونے والا اہم ترین واقعہ ہے اور اس کی پبلسٹی ضروری ہے، اور وہ یہ ہے کہ محمد انور کی بھینس ماں بن گئی ہے۔ یہ اس کا دوسرا بچھڑا ہے۔ میں پتوکی آنے کے بعد سے اس واقعے کی منتظر تھی۔ بچھڑے کی ماں کی بھی یہی کیفیت ہوگی۔ حمل ٹھہرنے سے بچھڑے کی پیدائش تک دس مہینے سے زیادہ کا عرصہ لگتا ہے۔ میں جب محمد انور کے گھر آئی تو دیکھا کہ وہ حمل کے ہاتھوں مضطرب اور پریشان تھی۔ وہ اتنی وزنی ہوگئی تھی کہ اس کی ٹانگیں اس کا وزن نہیں سہار سکتی تھیں۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے چلتی تھی اور ایک بار گر کر اس نے اپنے کھر زخمی بھی کر لیے۔ محمد انور نے اسے دوا بھی کھلائی اور اس کی مرہم پٹی بھی کی جس سے وہ ٹھیک ہوگئی۔ چار رات پہلے وہ بہت بے چین تھی۔ محمد انور نے علامات سے پہچان لیا کہ بچھڑے کی پیدائش کا وقت قریب ہے۔ وہ ہمسائے سے

Marfat.com

ایک شخص کو بلا لائے۔ یہ سفید ڈاڑھی والا ایک بوڑھا شخص تھا جس نے پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ دونوں نے قمیصیں اتار دیں اور جانور کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ انور نے اپنی سائیکل بھی تیار کر رکھی تھی کہ اگر ضرورت ہو تو فوری طور پر مویشیوں کے ڈاکٹر کو بلایا جا سکے۔ انور کی اہلیہ نے باڑے میں خوشبودار بھوسہ بھر دیا تھا تا کہ بھینس ممکنہ حد تک خود کو آرام دہ محسوس کرے۔ پگڑی والا بوڑھا شخص بھینس کی کھوکھوں پر مساج کر رہا تھا۔ محمد انور تجسس سے سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ آدھ گھنٹے کے دردوں کے بعد ایک منٹ میں پیدائش کا عمل مکمل ہو گیا اور چھوٹا چمکدار بچھڑا گیلا گیلا اپنی ماں کے پہلو میں پڑا تھا۔ اس کی ماں نے فوراً ہی اسے چاٹ چاٹ کر صاف کرنا شروع کر دیا جب کہ وہ چونک چونک کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ کمزور سی کوشش کرتا، لڑکھڑاتا اور گر جاتا لیکن پیدائش کے دو گھنٹے بعد ہی وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا اور اپنی ماں کے تھنوں سے دودھ پینے لگا۔ اپنی ماں کے مقابلے میں تو وہ بہت چھوٹا ہے لیکن پھر بھی اس کا وزن پچھتّر پاؤنڈ تو ہوگا۔ سائز ایک بڑے کتے کے برابر۔ انور کی بیوی نے اپنی ہتھ چکی نکالی اور اس پر خوب سارا آٹا پیسا۔ اس میں گڑ ملا کر اس کا دلیہ بنایا گیا اور بھینس کو کھلایا گیا تا کہ اسے اضافی توانائی مل سکے۔ محمد انور ایک بجے سے پہلے نہیں سو سکے کیونکہ انہوں نے بچھڑے کی پیدائش کے بعد بھی بھینس کا خیال رکھنا تھا۔ بچھڑا بڑا ہی معصوم اور خوبصورت ہے، نرم و نازک لیکن صحت مند۔ ایک مہینے میں وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ جائے گا کیونکہ وہ دودھ جو فطرت نے اس کے لیے پیدا کیا ہے، وہ ہم پییں گے۔ بھینسوں کے بچے دودھ چھڑانے تک بھوک سے ادھ موئے رہتے ہیں اور ان کی یہ حالت اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک وہ بالغ بھینسوں کی خوراک کھانے اور ہضم کرنے کے لائق نہ ہو جائیں۔ بچھڑے کی پیدائش سے ہم سب کو ایک طرح کی مایوسی ہوئی کیونکہ بچھڑے کا زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔ ایک صحت مند بھینس ایک ہزار روپوں سے زائد میں بکتی ہے جبکہ بھینسے کے تین چار سو روپے سے زیادہ نہیں ملتے۔ بھینسا بھاری

Marfat.com

بوجھ کے چھکڑے کھینچنے یا فارم پر رہٹ چلانے میں کام آتا ہے۔ صحت مند بھینسے مزید نسل کشی کے کام آتے ہیں۔ ہمیں تو دودھ چاہیے ہوتا ہے۔ اب ہمارے پاس چار بھینسیں ہیں، دو بالغ بھینسیں اور دو ان کے بچھڑے۔ اب وہ مجھ سے نہیں ڈرتیں، مجھے اچھی طرح پہچانتی ہیں بلکہ کبھی کبھی تو میرے ہاتھ بھی چاٹتی ہیں۔

حال ہی میں، ہمارے پڑوس میں رہنے والی ایک لڑکی کی شادی ہوئی ہے۔ چونکہ ان کا گھر بہت چھوٹا تھا، اس لیے تقریب ہمارے گھر میں منعقد ہوئی۔ ان کے کچھ رشتہ دار جو لاہور اور کراچی سے آئے ہوئے تھے، تین دن تک ہمارے ہاں ٹھہرے۔ شادی سے ایک دن پہلے تک دور دور سے ان کے مہمان آتے رہے۔ عورتوں نے شوخ رنگوں کے بھڑکیلے لباس اور ان پر سونے چاندی کی چوڑیاں، گلے کے ہار، کانٹے، نتھیں اور جھانجھریں پہن رکھی تھیں۔ بہت چھوٹے بچے ننگے یا کم لباس میں تھے۔ بڑے بچے اپنے باپوں جیسے لباس میں تھے۔ ایک بڑی چٹائی بچھائی گئی اور مہمانوں نے دولھا اور دلھن کے لیے لائے جانے والے تمام تحفے اس پر ڈھیر کر دیے۔ دوسری صبح تین بکرے ذبح کیے گئے۔ ان کے الگ الگ سر کافی دیر تک کھلے پڑے رہے۔ ہمارے گھر کی بغلی گلی میں لوگ بڑے بڑے چولھے تیار کر رہے تھے جن پر بڑی بڑی دیگیں رکھ کر، ان میں کھانا پکایا گیا۔ وہ ان میں چاول ڈال کر گھنٹوں انہیں ہلانے میں مصروف رہے۔ پورے پتوکی کو شادی سے مطلع کرنے کے لیے دلھن کے والدین نے بینڈ والوں کو بلوایا ہوا تھا جو اپنی لکیر دار سفید وردیوں میں ملبوس، بلند آواز میں ڈھول، بگل اور بہت سے ساز بجا رہے تھے۔ پندرہ سالہ دلھن پتھر کی دیوار سے ٹیک لگائے ایک دری پر بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ سات گھنٹوں تک کوئی حرکت کیے بغیر، ایک ہی حالت میں بیٹھی رہی۔ عورتیں اسے دیکھ دیکھ کر اس کی تعریفیں کرتی تھیں۔ وہ سرخ رنگ کے ریشمی لباس میں ملبوس تھی جس پر سنہری گوٹے کناری کا کام کیا گیا تھا۔ اس پر اس نے سونے کے زیورات پہن رکھے تھے۔ ہاتھ اور پاؤں مہندی سے رچے ہوئے تھے اور آنکھوں میں گہرا سرمہ لگایا گیا تھا۔ اس دن سہ پہر کے وقت میں نے دولھا کی ایک

Marfat.com

جھلک دیکھی۔ وہ مغربی لباس پہنے ہوئے تھا اور کلین شیو تھا۔ بے داغ اجلی سفید قمیص، استری شدہ نیلی پتلون اور سفید اور سیاہ آکسفورڈ جوتے۔ اگرچہ میں نے شادی کی تقریب نہیں دیکھی کیونکہ وہ کہیں الگ ہوئی تھی لیکن بعد کی سرگرمیاں میں آسانی سے دیکھ سکتی تھی۔ ہر شخص کے لیے چاول اور گوشت کا سالن وافر مقدار میں موجود تھا۔ سیکڑوں کوے، چڑیاں، کتے اور بلیاں بن بلائے مہمان بن کر آ گئے تھے۔

کل سہ پہر وہی فقیر رقاص جس کا میں نے پہلے ذکر کیا تھا کہ عورتوں کا روپ بھر کر ناچتا تھا، اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے پھر آیا اور حسب معمول بچوں کا ایک جم غفیر اس کے گرد جمع ہو گیا لیکن اس کا رقص زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا کیونکہ بھائی جان کے چچا نے باہر نکل کر اسے خوب ڈانٹ ڈپٹ کی اور اسے کافر تک قرار دے دیا۔ رقاص اور اس کے ساتھیوں نے خاموشی سے کھسک جانے ہی میں عافیت سمجھی۔

میں جب سے پاکستان آئی ہوں، اتنی گہری نیند سوتی ہوں کہ مجھے کوئی خواب یاد نہیں رہتا لیکن کل رات میں نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا۔ خوف کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی بعد میں، میں پھر سو گئی لیکن خواب ساری تفصیلات کے ساتھ میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ میں نے دیکھا کہ مجھے پاکستان چھوڑنے پر مجبور کیا جا رہا ہے اور میں کسی صورت میں امریکہ جانے کو تیار نہیں ہوں۔ خواب کے پہلے حصے میں میں نے دیکھا کہ میں ایک جہاز میں بیٹھی دنیا کے چکر پہ چکر لگا رہی ہوں اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ میں کہاں جاؤں۔ پھر اچانک مجھے ترکی کے کمال کیوسکو (جنہوں نے میرے مضامین کا ترکی میں ترجمہ کیا ہے) کی طرف سے دعوت ملتی ہے کہ میں استنبول آ کر ان کی فیملی کے ساتھ ٹھہروں۔ میں قبول کر لیتی ہوں۔ اگرچہ میں اس انتظام پر مطمئن نہیں ہوں لیکن یہ امریکہ پلٹنے سے بہتر نظر آتا ہے۔ میں اس بات پر بڑی حیران ہوں کہ کمال کیوسکو کا گھر، باہر سے محمد انور کے گھر جیسا ہی ہے لیکن اندر سے بالکل مغربی گھروں جیسا ہے۔ فرش بالکل صاف چمکدار جن پر مشرقی قالین بچھے ہوئے تھے۔ مہاگنی کا فرنیچر، پالش شدہ۔ غرض پورا گھر انتہائی نفیس اور آرام دہ ہے۔ مجھے کمال کی

Marfat.com

بیوی یا اس کی بیٹیاں نظر نہیں آتیں، صرف دو جوان بیٹے نظر آتے ہیں جو انتہائی آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے پڑھ رہے ہیں۔ وہ بھی مغربی طرز کے لباس پہنے ہوئے ہیں اور ان کا رنگ یورپی لوگوں کی طرح گورا ہے۔ جب میں ان سے ان کے والد کے بارے میں پوچھتی ہوں تو وہ ایک سیڑھی سے آہستہ آہستہ اترتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بڑی عمر کے ایک وجیہ، باوقار شخص نظر آتے ہیں جن کے سر کے بالوں میں ایک سفید پٹی ہے۔ ان کی آنکھیں گہری اور اداس ہیں۔ میں ان سے پوچھتی ہوں کہ ان کی اسلامی کتابوں کی لائبریری کہاں ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ پولیس کے ڈر سے انہوں نے ساری کتابیں چھپا دی ہیں۔ پھر وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں: "تم اس حلیہ میں باہر نہیں جا سکتی۔ ترکی میں مغربی لباس پہننا لازمی ہے۔ اگر تم اس لباس میں باہر گئی تو گرفتار کر لی جاؤ گی۔" میں ابھی تک پاکستانی شلوار قمیص اور برقع میں ملبوس ہوں۔ میں کوئی جواب نہیں دیتی اور کھڑکی سے باہر جھانکتی ہوں۔ میں نے دیکھا کہ دور دور تک شاندار مسجدیں اور ان کے مینار موجود ہیں لیکن ان سب کو گرایا جا رہا ہے اور ان کی جگہ دیو پیکر عمارتیں اٹھائی جا رہی ہیں۔ میں اپنے ترک دوست کی طرف دیکھتی ہوں جس کے چہرے پر خوف کے سایے لہرا رہے ہیں۔ میں بھی سخت خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔۔۔۔۔ اسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ چند لمحوں تک تو مجھے ایسا لگا کہ میں استنبول میں ہی ہوں پھر مجھے احساس ہوا کہ یہ محض ایک خواب تھا اور میں بالکل محفوظ ہوں۔ جب مجھے میاں مٹھو کی آواز سنائی دی جس کا پنجرہ رات کو میرے بستر کے نیچے ہوتا ہے تو میرا رہا سہا شبہ بھی جاتا رہا۔ میں پکار اٹھی: "اللہ تیرا شکر ہے کہ میں یہیں ہوں"۔ میں نے دعا کی "اے اللہ! میں بس یہیں رہنا چاہتی ہوں، کہیں اور نہیں جانا چاہتی۔"

ساری محبتوں کے ساتھ

مریم

Marfat.com

پتوکی سے ساتواں خط

مریم جمیلہ
معرفت حکیم رائے نعمت علی خان
صدر طبیہ ایسوسی ایشن،
مین بازار پتوکی، ضلع قصور، پاکستان
14 نومبر 1962ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکرز، اپارٹمنٹ نمبر 223-C
لارچمونٹ، نیویارک، یو۔ ایس۔ اے

پیاری امی اور ابو!

مجھے آپ کے 28 اکتوبر اور 2 نومبر کے خط مل گئے اور مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے میرے سارے سوالوں کے جوابات دیے ہیں۔ فیملی کے سب لوگوں کے پتے مہیا کرنے پر آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں انہیں احتیاط سے رکھوں گی تاکہ جب ضرورت ہو، کام آسکیں۔ مجھے نیویارک ٹائمز کے کتابوں پر تبصرے کی کاپی بھی مل گئی ہے جسے میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ اگر آپ کے لیے آسانی سے ممکن ہو تو کتابوں پر تبصروں کے یہ صفحات مجھے ہر ہفتے بھیجتے رہیں۔

میرے اردو کے سبق عارضی طور پر معطل ہوگئے ہیں۔ میرے اردو کے بوڑھے استاد عبدالغنی بہت اچھے تھے لیکن بدقسمتی سے انہیں انگریزی بالکل نہیں آتی۔ انہوں نے مجھے اردو پڑھنا اور لکھنا تو سکھایا لیکن چونکہ مجھے ان کے معانی کا پتہ نہیں چلتا تھا اس لیے

Marfat.com

میرے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ نہیں ہو سکا۔ محمد انور بہت مصروف رہتے ہیں اور بھائی جان گھر کی مرمت میں بری طرح الجھے ہوئے ہیں۔ جب تک گھر کا کام ختم نہ ہو جائے، مجھے نہیں لگتا کہ میری اردو کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہو۔ میں ابھی تک قواعد کی رو سے صحیح اردو تو نہیں بول سکتی لیکن آپا اور ان سے ملنے کے لیے آنے والی سہیلیوں کو جنہیں انگریزی نہیں آتی اپنی بات سمجھا لیتی ہوں۔ میں اردو میں ہر وہ بات کہہ لیتی ہوں جو چاہتی ہوں لیکن ظاہر ہے کہ پیچیدہ فلسفیانہ گفتگو نہیں کر سکتی۔ اب میرا اردو کا ذخیرۂ الفاظ پانچ سو کے قریب الفاظ پر مشتمل ہے۔

پچھلے ہفتے محمد انور کی چھوٹی بہن مشتاق بیگم ہم سے ملنے آئیں۔ وہ ابھی تک یہیں ہیں اور چار پانچ مہینے ہمارے ساتھ رہیں گی۔ مشتاق بیگم میری ہم عمر ہیں یعنی ٹھیک اٹھائیس برس کی۔ ان کی شادی کو نو سال ہو گئے ہیں لیکن آپا کی طرح وہ بھی بے اولاد ہیں۔ وہ اپنی عمر سے بہت چھوٹی نظر آتی ہیں۔ طویل قامت، دبلی پتلی اور خوبصورت۔ ان کا گورا رنگ اور خدوخال کسی یورپی خاتون جیسے ہیں۔ ان کے گھنے سرخ بال ان کی کمر تک آتے ہیں۔ مشتاق بیگم کسی انگریز لڑکی کی جڑواں بہن نظر آتی ہیں لیکن انہیں انگریزی بالکل نہیں آتی۔ وہ صرف اردو اور پنجابی بولتی ہیں لیکن ہیں بہت اچھی، اور ہم گہری سہیلیاں بن گئی ہیں۔

جیسے میں نے اپنے پہلے خطوں میں ذکر کیا، یہاں پتوکی میں ہم حیران کن حد تک خودکفیل ہیں۔ ہم ساری خوراک خام حالت سے تیار کرتے ہیں۔ اپنے کپڑے خود سیتے ہیں۔ اپنی چھت سے میں ہمسایوں کے صحن میں جھانک سکتی ہوں۔ میں اکثر دیکھتی ہوں کہ عورتیں اپنی پیڑھیوں پر بیٹھی اپنے چرخوں پر دھاگا کات رہی ہوتی ہیں۔ یہ چرخا اسی جیسا ہوتا ہے جیسا مہاتما گاندھی نے استعمال کیا تھا۔ وہ چرخا کاتنے کے ساتھ ساتھ آپس میں باتیں بھی کرتی رہتی ہیں جب کہ بچے کھیل کود میں مصروف رہتے ہیں۔

ہمارے پڑوس میں حال ہی میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ آدھی رات کے وقت خاتون کی چیخ پکار سے میری آنکھ کھل گئی۔ محمد انور بھاگے بھاگے گئے تاکہ کوئی مدد درکار ہو تو مہیا

Marfat.com

کی جا سکے۔ ان کے گھر میں خوشی کا سماں ہے کیونکہ بیٹا پیدا ہوا ہے۔ بچہ بالکل سرخ و سفید ہے اور دن رات روتا رہتا ہے۔ اس کی ماں بڑی خستہ حال اور زرد رو ہے۔ جب بچہ سات دنوں کا ہوگا تو اس کے سر کے بال اتار دیے جائیں گے، اس کا کوئی نام رکھا جائے گا اور اس موقع پر دو بکروں کی قربانی دی جائے گی۔ گھر میں استعمال کے بعد جو گوشت بچ رہے گا، غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے گا اور ایک کھجور کا ملیدہ بنا کر چھوٹے بچے کو چٹایا جائے گا۔ تاہم جب تک وہ چھ سات سال کا نہ ہو جائے، اس کے ختنے نہیں کیے جائیں گے۔ اس ساری تقریب کو عقیقہ کہتے ہیں اور یہ ہر بچے کی پیدائش پر منعقد ہوتی ہے۔

ہماری بھینس کا بچھڑا صرف دو ہفتے زندہ رہا۔ میں نے زندگی میں کبھی اتنی چھوٹی خوبصورت مخلوق نہیں دیکھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی بڑے کھلونے میں کچھ بھر دیا گیا ہو لیکن وہ زندہ تھا اور حرکت کرتا تھا۔ اس کا جسم بڑا خوبصورت تھا۔ اس کی پشت پر نرم ریشمی سیاہ بال تھے اور پیشانی پر سفید نشان۔ اس کی پچھلی ٹانگیں سفید تھیں اور تھوتھنی اپنی ماں کی طرح قدرے گلابی۔ محمد انور کا کہنا بھی یہی تھا کہ اس نے زندگی میں کبھی اتنا خوبصورت بچھڑا نہیں دیکھا۔ یہ بچھڑا پیدائش کے بعد گیارہ دنوں تک بالکل صحت مند رہا۔ جب اچانک اس کے پیٹ میں کوئی خرابی ہوئی، اس نے کھانا پینا اور لید کرنا چھوڑ دیا میں نے کبھی کسی جانور کو اتنی تکلیف میں نہیں دیکھا۔ وہ اتنا کمزور ہو گیا کہ اس سے اٹھا بھی نہیں جاتا تھا۔ وہ کوئی آواز بھی نہیں نکالتا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے اس کے درد کا اظہار ہوتا تھا۔ ہر چند منٹوں کے بعد اسے مروڑ اٹھتے تھے۔ اس کے علاج کے لیے جو کچھ ممکن تھا کیا گیا۔ محمد انور نے اسے پینسلین کا بیس لاکھ یونٹ کا ٹیکہ بھی لگایا۔ پتوکی کے بہترین ویٹرنری ڈاکٹروں سے مشورہ بھی کیا گیا۔ معجزانہ طور پر بچھڑے نے وہ رات گزار لی۔ صبح کے وقت دو پگڑی پوش بوڑھے آدمی آئے اور انہوں نے اس کا علاج کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس کی کوکھ پر مساج کرتے تھے اور زبردستی اس کا منہ کھول کر دوائیں انڈیلتے تھے۔ ہر کوشش کی گئی لیکن ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ ماں پیار

Marfat.com

سے اسے چاٹتی رہی لیکن بالآخر اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

جب سے بچھڑا مرا ہے، اس کی ماں کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ اسے اس سانحہ کا اتنا غم ہے جیسے کسی انسان کو ہو سکتا ہے۔ دو دنوں تک اس نے دودھ دینے سے انکار کر دیا۔ وہ عظیم الجثہ بھینس بے چینی سے ادھر ادھر پھرتی ہے اور بری طرح سے ڈکراتی رہتی ہے۔ وہ روتی رہتی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسے جب تازہ ہوا کے لیے باہر گلی میں دوسری بھینسوں کے ساتھ باندھا جاتا ہے تو گزرنے والے سب بچے بوڑھے اس کا درد سمجھتے ہیں اور رک کر، سینگوں کے درمیان پیشانی پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم سب بھی بہت اداس ہیں کیونکہ بچھڑا زندہ رہتا تو بڑا شاندار جانور نکلتا جس کی بڑی اہمیت ہوتی۔ ہمیں آج تک پتہ نہیں چلا کہ وہ پر اسرار بیماری کیا تھی جو جان لیوا ثابت ہوئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ اس لیے مر گیا کہ وہ اتنا پیارا اور خوبصورت تھا کہ یہ دنیا اس کے قابل تھی ہی نہیں۔

تمام تر محبتوں کے ساتھ

مریم

Marfat.com

پتوکی سے آٹھواں خط

مریم جمیلہ
معرفت حکیم رائے نعمت علی خان
صدر طبیہ ایسوسی ایشن
مین بازار پتوکی، ضلع قصور، پاکستان
27 دسمبر 1962ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکڑز، اپارٹمنٹ نمبر C-223
لارچمونٹ، نیویارک، یو۔ ایس۔ اے

پیاری ترین امی اور ابو!

مجھے آپ کے 18 دسمبر کے خط ملنے سے بڑی خوشی ہوئی۔ اس میں کافی خبریں تھیں اور آپ کے اس اصرار کے باوجود کہ آج کل زندگی بڑی روکھی پھیکی ہے، یہ خط زندہ دلی کا مظہر تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کو مولانا مودودی کی کتاب "ٹووَرڈز انڈرسٹینڈنگ اسلام" (خطبات کا ترجمہ) مل گئی ہے۔ میں نے یہ کتاب اور دوسرا اسلامی لٹریچر اس لیے نہیں بھیجا کہ آپ پر اپنے خیالات مسلط کروں بلکہ اس لیے کہ آپ یہ سمجھ سکیں کہ آپ کی بیٹی نے کس زندگی کا انتخاب کیا ہے اور کیوں؟

اس طویل عرصے میں، دل کو گرما دینے والا جو خط وصول ہوا ہے وہ ڈیبی کا ہے جسے میں نقل کرتی ہوں:

"21 دسمبر 1962ء

Marfat.com

ڈیئر چچی پیگی !

آپ نے جو کتاب "دی پرافٹ محمد" مجھے بھیجی ہے، اس کا بہت بہت شکریہ۔ میں خیریت سے ہوں اور امید ہے کہ آپ بھی ہر طرح خیریت سے ہیں۔ میں نے آپ کی تصویر دیکھی اور میں اس لباس کے بارے میں جاننا چاہوں گی جو آپ نے پہن رکھا ہے۔ میرا خیال ہے اب آپ زندگی کے نئے طور طریقوں کی عادی ہوگئی ہوں گی۔

یہاں نیوجرسی میں برف ہے۔ آپ لوگ پاکستان میں کرسمس کیسے مناتے ہیں؟"

بہت سا پیار

ڈیبی

کرسمس کا ہمیں ایسے پتہ چلا کہ عیسائی بچوں نے پٹاخے چلائے اور وہ عیسائی خواتین جو بہت عرصہ پہلے ہندوؤں کی اچھوت ذات سے تھیں اور ہمارے پاخانے صاف کرتی تھیں، تین دنوں کی چھٹی پر چلی گئیں جس سے ہم بڑی پریشانی میں مبتلا رہے۔ وہ جب کل کام پر واپس آئیں تو گھر کی خواتین ان پر خاصی برہم تھیں اور ان میں کافی تو تو میں میں ہوئی۔ پاکستان کے عیسائی امریکہ یا یورپ کے مقابلے میں بہت مذہبی ہیں۔ یہاں امریکہ کی طرح کرسمس منانے کے مادی اور تجارتی طریقے رائج نہیں بلکہ یہاں کے عیسائی بڑے اہتمام سے کرسمس کی شام اور صبح کو گرجا جاتے ہیں یہاں پتوکی اور پورے پاکستان میں 25 دسمبر کو عام تعطیل ہوتی ہے لیکن کرسمس کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ یہ پاکستان کے بانی قائداعظم کا یوم پیدائش ہے۔

کرسمس کا دن، میرے سابق استاد عبدالغنی کے لیے بڑا اداس تھا چونکہ اس دن ان کے چھوٹے بھائی کا پیچش کی وجہ سے انتقال ہوگیا۔ وہ دو دنوں تک اس بیماری کی وجہ سے سخت درد میں مبتلا رہا۔ بھائی جان اور محمد انور نے اسے ہر طرح کی دوائیں دیں، جدید انٹی بائیوٹک اور یونانی بھی، لیکن کوئی دوا کارگر ثابت نہ ہوئی۔ وہ میرا ہم عمر یعنی قریباً اٹھائیس سال کا تھا لیکن نو سال پہلے سے وہ کسی ذہنی بیماری میں مبتلا تھا۔ اپنے مرض کے باوجود وہ روزانہ پانچ وقت نماز پڑھتا تھا۔ بہت نیک تھا اور سب لوگ اس کی

Marfat.com

بہت عزت کرتے تھے۔ ہر شخص اس کا ذکر اچھے الفاظ میں کرتا تھا۔ اس کے انتقال پر اس گھر کی عورتوں نے ان کے لیے آلو گوشت کا سالن اور روٹیاں پکا کر ان کے گھر بھجوائیں۔ یہاں تجہیز و تکفین کے پیشہ ورانہ ادارے نہیں ہیں کیونکہ مسلمانوں کے ہاں یہ بڑا سادہ سا معاملہ ہے اور اس پر کچھ اخراجات نہیں اٹھتے، نہ ہونے کے برابر۔ کسی کفن باکس کی ضرورت نہیں ہوتی، جسم کو حنوط نہیں کیا جاتا، پھول چاہیے ہوتے ہیں نہ کسی موسیقی کا اہتمام کرنا ہوتا ہے۔ انتقال کے فوراً بعد نعش کو صابن اور پانی سے نہلایا جاتا ہے، اسے سفید چادروں میں لپیٹا جاتا ہے اور گھر والے، رشتہ دار اور دوست احباب میت کو اٹھا کر قریبی قبرستان میں لے جاتے ہیں۔ نعش کو فوراً ہی دفنا دیا جاتا ہے، عام طور پر اسی دن، جس دن انتقال ہوا ہو۔ اگرچہ عورتیں گھر میں جمع ہو کر سوگ مناتی ہیں لیکن وہ جنازے کے ساتھ نہیں جاتیں۔ میں نے لاہور اور پتوکی میں اکثر یہ جنازے پیدل جاتے ہوئے دیکھے ہیں۔ اللہ عبدالغنی صاحب کے چھوٹے بھائی کی مغفرت کرے۔ اس نے اپنی مختصر زندگی میں بہت کم خوشیاں دیکھیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ عبدالغنی صاحب کی زندگی میں اتنے سانحے کیوں پیش آتے ہیں۔ کئی لحاظ سے اس کی زندگی میرے ناول "احمد خلیل" کے کردار سے ملتی ہے۔

گرچہ میری اردو کی باقاعدہ پڑھائی اب اسی وقت شروع ہوگی جب بھائی جان کے گھر کی مرمت کا کام ختم ہوگا لیکن میں اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہوں۔ عبدالغنی صاحب نے مجھے جو سبق پڑھائے تھے میں انہیں دہراتی رہتی ہوں تاکہ جو نئے استاد آئیں وہ مجھے وہیں سے پڑھانا شروع کریں جہاں عبدالغنی صاحب نے چھوڑا تھا۔ محمد انور اور مشتاق بیگم کے شوہر اسلم کے تعاون سے میرا ذخیرۂ الفاظ آٹھ سو الفاظ سے بھی بڑھ گیا ہے اور اب میں خواتین سے روانی سے بات چیت کرنے لگی ہوں۔

جہاں تک موسم کا تعلق ہے، رات کے وقت اوسط درجہ حرارت صفر کے قریب پہنچ جاتا ہے اور دن کو 60، 65 کے درمیان رہتا ہے۔ گھر کو گرم رکھنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ یہاں گھر گرم موسم کی مناسبت سے بنائے جاتے ہیں۔ رات کو سردی سے بچنے

Marfat.com

کے لیے ہم روئی کی رضائیاں استعمال کرتے ہیں اور دن کے وقت بہت سردی ہو تو چولھے کے پاس بیٹھ کر آگ تاپتے ہیں، جہاں کھانا بھی پکتا رہتا ہے اور ہم ہاتھ بھی سینکتے رہتے ہیں۔ مجھے نہیں پتہ کہ میرے پاس میرا بھاری کوٹ نہ ہوتا تو میں کیا کرتی۔ میں دن رات اسے پہنے رہتی ہوں۔ رات کو اسے پہنے پہنے ہی سو جاتی ہوں اور صرف وضو کے لیے اتارتی ہوں۔ باقی لوگ تو ہینڈ پمپ کے یخ پانی ہی سے وضو کر لیتے ہیں لیکن محمد انور کی اہلیہ مجھ پر بڑی مہربان ہیں، وہ مجھے چولھے پر پانی گرم کر دیتی ہیں۔

بھائی جان کا گھر ابھی زیر مرمت ہے۔ سارا دن دس مزدور، دس گھنٹے تک زور شور سے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے شور کی آوازیں ناقابل برداشت ہیں۔ آپا اور ننھی فرحت اس شور شرابے سے بچنے کے لیے ہمارے ہاں آ جاتی ہیں اور زیادہ سے زیادہ وقت یہیں گزارتی ہیں۔ آپا کے لیے تو یہ اور بھی اذیت ناک ہے کیونکہ انہیں پہلے سے درد شقیقہ کی تکلیف ہے۔ دس مزدوروں کی کھٹا کھٹ سے وہ اور بھی پریشان ہوتی ہیں۔ میری دعا ہے کہ مرمت کا یہ کام جلد از جلد ختم ہو جائے۔

اب میں اپنے پسندیدہ موضوع اسلام کی طرف آتی ہوں۔ صرف راسخ العقیدہ شخص ہی اسلام کی تعلیمات پر اس طرح عمل کر سکتا ہے جیسے کہ ان کا حق ہے۔ اسلام سخت دین ہے اور اس کے مطالبے اس حد تک ہیں کہ مغرب کے غیر مذہبی لوگ ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ایک سچا مسلمان اپنی زندگی میں کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو اس کے عقائد کے منافی ہو۔ اس دعوے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والا ایک عام مسلمان اپنی زندگی کا اتنا بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ حصہ عبادت میں گزارتا ہے جتنا کوئی پادری، خانقاہ کا کوئی راہب یا نن۔ لیکن وہ تارک الدنیا نہیں ہوتا۔ مرد اپنا وقت اپنی فیملی کے لیے پوری دیانتداری سے روزی کمانے میں اور عورتیں گھرداری اور بچوں کی پرورش میں وقت گزارتی ہیں۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ ایک سچا باعمل مسلمان محض عیاشی کے لیے کوئی کام نہیں کرتا۔ وہ لہو ولعب میں مشغول نہیں ہوتا اور شور شرابے والی تفریحی مجلسوں میں نہیں جاتا۔ اس کا کوئی دن چھٹی کا نہیں ہوتا۔ روزمرہ کی لازمی

Marfat.com

عبادات کو ہم نماز کہتے ہیں جو عربی میں صلاۃ کہلاتی ہے۔ اس میں سورج نکلنے سے پہلے صبح کی نماز میں چار رکعات ہوتی ہیں۔ ظہر میں بارہ، عصر میں آٹھ، غروب آفتاب کے فوراً بعد سات رکعات اور رات کو سونے سے پہلے سترہ رکعات، اور اس سب کچھ کے لیے جسم کی طہارت لازمی شرط ہے جس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ روز مرہ کا یہ معمول انسان کے آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ایک باعمل مسلمان روزانہ کئی گھنٹے نماز میں گزارتا ہے۔ ایک اچھا مذہبی مسلمان آدھی رات کو اٹھ کر تہجد بھی ادا کرتا ہے جو بہت مشکل ہے لیکن لازمی نہیں۔ ہمارے روحانی رہنما ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک مومن اللہ کی قربت اس وقت تک حاصل نہیں کرسکتا جب تک وہ باقاعدگی سے یہ خود اختیاری نماز ادا نہ کرے۔ پھر رمضان کے پورے مہینے کے روزے ہیں اور اس کے علاوہ بھی کچھ نفلی روزے ہیں جو سال کے مختلف اوقات میں رکھے جاتے ہیں اور پرہیز گار لوگ ان روزوں کو رکھنے کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ اگرچہ اسلام پر صحیح معنوں میں عمل کرنا کبھی نہ ختم ہونے والی مشقت ہے اس کے لیے زندگی سادگی سے گزارنی پڑتی ہے، خود کو فنا کرنا پڑتا ہے، آرام کی قربانی دینی پڑتی ہے، لیکن اس کے باوجود آپ کو ان سے زیادہ ہشاش بشاش، پرسکون اور مطمئن لوگ نہیں ملیں گے۔

ساری محبتوں کے ساتھ

مریم

Marfat.com

پتوکی سے نواں خط

مریم جمیلہ
معرفت حکیم رائے نعمت علی خان
صدر طبیہ ایسوسی ایشن
مین بازار پتوکی، ضلع قصور، پاکستان
21 جنوری 1963ء

مسٹر اینڈ مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکٹرز، اپارٹمنٹ نمبر 223-C
لارچمونٹ، نیویارک، یو۔ایس۔اے

بہت پیاری امی اور ابو!

آپ کے 5 اور 12 جنوری کے خط اور نیویارک ٹائمز میں کتابوں پر تبصروں کی کاپی ملی جسے میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا۔

ساڑھے تین مہینوں کی مرمت کے بعد بالآخر ہمارے مکان کا کام ختم ہو گیا ہے۔ اب یہ گھر بہت بہتر ہو گیا ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ پڑوسیوں کی مٹی کی چھتوں کے برعکس ہمارے گھر کی چھت اینٹوں سے پختہ کر دی گئی ہے جس سے صفائی بھی رہتی ہے اور یہ خوبصورت بھی لگتی ہے۔ میرا کمرہ تو بہت ہی خوبصورت اور آرام دہ ہو گیا ہے۔ فرش سرخ، سفید اور نیلے سیمنٹ سے پختہ کر دیا گیا ہے اور دیواروں کے ساتھ میری کتابیں رکھنے کے لیے شیلف بنا دیے گئے ہیں۔ دیواروں پر قرآنی آیات اور احادیث سے مزین فریم ہیں۔ میاں مٹھو میرے کمرے کا ساتھی ہے۔ میری واپسی پر پڑوس کے

Marfat.com

سات بچوں اور فرحت نے میرا والہانہ استقبال کیا۔ میاں مٹھو سارا دن خوشی سے ٹیں ٹیں کرتا رہتا ہے۔ بھائی جان کی چچا زاد بہن، بائیس سالہ شمیمہ اور انیس سالہ سلیمہ اپنے ایک ہفتے کے بچے کو لے کر ہمارے ہاں آئے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ نومولود بچے بھی اتنے خوبصورت ہو سکتے ہیں۔ یہ بچہ اس بچھڑے ہی کی طرح حسین تھا جو زندہ نہ رہا۔ وہ بچھڑا بالکل کالا سیاہ تھا۔ اس کی پشت پر بالوں کی چمکدار تہ تھی۔ وہ خاموش رہتا تھا اور پیارا لگتا تھا۔ وہ بھوسہ بھرا کھلونا لگتا تھا۔ وہ اتنا نازک تھا کہ ابھی اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں پر بمشکل کھڑا ہوتا تھا۔ میں نے اس چھوٹے بچے کو اپنے بازوؤں میں لے لیا تھا تھوڑی دیر میں سلیمہ نے بتایا کہ اسے بھوک لگی ہے۔ اس کی ماں اسے دودھ پلانے لے گئی۔

عید الاضحیٰ کی قربانی کے لیے خریدے گئے بکرے اور بھیڑیں سارا دن گھر میں گھومتی رہتی ہیں اور بچوں کے ساتھ کھیلتی ہیں۔ جب میں نے کہا کہ انہیں یہ خیال نہیں آتا کہ ان کے کھیل کود سے گھر گندا ہوتا ہے تو مجھے بتایا گیا کہ قربانی کے جانوروں کا خیال رکھنا چاہیے اور انہیں بہترین خوراک دینی چاہیے۔

میں جب محمد انور کے گھر قیام پذیر تھی تو شمیمہ اور سلیمہ کے والد خاصے خوشحال ہو گئے تھے۔ ان کے پاس ایک شاندار مرغا ہے۔ ایک مرغی اور بارہ چوزے۔ یہ ننھے ننھے چوزے بڑے خوبصورت ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی تین انچ سے بڑا نہیں ہوگا۔ مجھے یہ زرد روئی کے نرم گیندوں کی طرح لگتے ہیں۔ منی منی سی آنکھیں ہیں، ننھے منے پنجے اور کمزور سے پر میں نے ایک کو ہاتھ میں اٹھایا تو میں اس کے جسم کی حرارت، اس کے دل کی دھڑکنیں اور اس کی چوں چوں کی آواز سے اس کے جسم میں پیدا ہونے والا ارتعاش صاف محسوس کر سکتی تھی۔ شمیمہ کے پالتو طوطے کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ ایک بلی اسے مار کر کھا گئی ہے۔ اس لیے میں اپنے میاں مٹھو کا بہت خیال رکھتی ہوں اور ایک لمحے کے لیے بھی اسے اکیلا نہیں چھوڑتی۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میرے مذہب کو سمجھنے اور اس کے بارے میں مزید

Marfat.com

کچھ جاننے میں آپ کی دلچسپی بڑھ گئی ہے اور آپ نے میرے کسی دباؤ کے بغیر اپنے طور پر اسلام کے بارے میں چند کتابیں پڑھی ہیں۔ اس سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ بہت پہلے میری ایک سہیلی زینیٹا نے مجھے ایک خط لکھا تھا کہ اگر کسی عرب یا مسلمان رہنما کو امریکی یا یورپی پریس کی طرف سے ہمدردانہ پبلسٹی ملے تو اس کے سچے مسلمان ہونے پر شک کرنے کی یہ کافی بڑی وجہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔

آپ شاید یقین نہ کریں، یہاں پاکستان میں موسم سرما بہت مختصر ہوتا ہے۔ یہ صرف دو مہینے (دسمبر اور جنوری) جاری رہتا ہے۔ کچھ جگہوں پر، خاص طور پر پہاڑوں پر برف پڑتی ہے۔ یہاں پتوکی میں کبھی برف نہیں پڑی۔ لاہور کا بھی یہی حال ہے۔ لیکن جب درجہ حرارت چالیس یا پچاس ڈگری (فارن ہائٹ) تک گر جائے تو کمروں کے اندر اچھی خاصی سردی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں درختوں کے پتے جھڑنے لگے ہیں۔ یہاں پاکستان میں درختوں کے پتے، امریکہ کی طرح، جھڑنے سے پہلے شوخ رنگ نہیں ہوتے۔ خشک ہوتے ہیں، مرجھاتے ہیں اور گر جاتے ہیں۔

امریکی معیار سے دیکھیں تو ہماری غذا کنجوسی کا مظہر دکھائی دیتی ہے۔ سردیوں میں جب دن مختصر ہو جاتے ہیں تو غذا بھی کم ہو جاتی ہے۔ ہم دن میں صرف دو کھانے کھاتے ہیں۔ نو دس بجے کے قریب ناشتہ کرتے ہیں اور غروب آفتاب کے فوراً بعد ڈنر۔ ناشتہ عام طور پر چپاتیوں، مکھن والے دودھ اور سبزیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہاں لاہور کی نسبت سبزیاں سستی بھی ہیں اور وافر مقدار میں دستیاب بھی۔ سردیوں کی زیادہ مقبول سبزی گوبھی کے پھول اور بند گوبھی ہیں۔ کبھی کبھی بند گوبھی کے سبز پتے بکرے کے گوشت کے ساتھ ملا کر پکائے جاتے ہیں جو بڑی لذیذ اور قوت بخش ڈش ہوتی ہے۔ رات کا کھانا بھی تقریباً انہی اشیاء پر مشتمل ہوتا ہے، تاہم سونے سے پہلے چینی ملا کر بھینس کا گرم گرم دودھ بھی پیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ہم مالٹے بھی کھاتے ہیں۔ آج کل ان کا موسم ہے اور یہ سستے نرخوں پر وافر مقدار میں دستیاب ہیں۔ غریب لوگ بھی اس پھل

Marfat.com

سے بآسانی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ میاں مٹھو میرا سدا کا ساتھی ہے۔ وہ سارا دن میرے ساتھ رہتا ہے اور اس کی ساری ذمہ داری مجھ پر ہے۔ میاں مٹھو وہی کچھ کھاتا ہے جو ہم کھاتے ہیں۔ وہ کھانوں کے لحاظ سے محب وطن پاکستانی ہے کیونکہ سیاہ، سرخ مرچیں، چپاتی اور دال اسے پسند ہے۔ اپنے کھانے میں سے میں اس کا حصہ بچا لیتی ہوں۔

بیس ہزار نفوس پر مشتمل پتوکی ایک بڑا قصبہ ہے لیکن اس نے اپنا دیہاتی ماحول ابھی تک محفوظ رکھا ہے۔ ہماری گلی کے پار والے پڑوسیوں کا ایک بڑا پختہ مکان ہے لیکن اس میں بجلی نہیں ہے۔ سورج ڈوبنے کے بعد اس میں اندھیرا ہو جاتا ہے لیکن عشاء کی نماز کے بعد وہ لوگ سو جاتے ہیں۔ آپا کے پاس تو مٹی کے تیل کا چولہا ہے لیکن محمد انور کی بیوی مٹی کے چولھے پر گزارہ کرتی ہے جس میں بھینس کے گوبر کے اپلے جلائے جاتے ہیں۔ عین اس وقت میں اپنے پڑوس کی چھت پر ایک نوجوان لڑکی کو چرخا کاتتے دیکھ رہی ہوں۔ اپنی چھت سے میں مین بازار میں جھانک کر تمام سرگرمیوں سے مطلع سکتی ہوں لیکن پردے کی وجہ سے ایسا نہیں کرتی۔ اگر کبھی پتوکی میں پختہ گلیاں بنی تھیں تو میری نظر سے تو کوئی ایسی گلی نہیں گزری۔ پتوکی میں کسی کے پاس کوئی کار نہیں ہے۔ میرا خیال ہے ٹیلیفون بھی کسی کے پاس نہیں۔ بازاروں میں ساری چلت پھرت مردوں کی ہوتی ہے۔ بہت کم عورتیں بازاروں میں نظر آتی ہیں۔ ہم خواتین جب بھی باہر جاتی ہیں، جس کا موقع شاذ و نادر ہی آتا ہے، تو مکمل برقع میں ہوتی ہیں۔ کبھی کبھار کوئی شخص سائیکل پر جاتا نظر آجاتا ہے۔ کل ہم نے اونٹوں کا ایک ریوڑ دیکھا۔ وہ بیچ بازار میں چارہ کھا رہے تھے اور ان کے پگڑی پوش داڑھی والے مسلح مالکان کاروباری معاملات طے کر رہے تھے۔ یہ لوگ قریبی پہاڑیوں کے قبائل سے متعلق تھے۔ یہاں کچھ تانگے ہیں اور کچھ چھکڑے ہیں جنہیں کھینچنے کے لیے، گھوڑے، بیل یا بھینسے استعمال ہوتے ہیں لیکن بوجھ ڈھونے کے لیے زیادہ تر گدھے استعمال کیے جاتے ہیں۔

میرا خیال ہے میں نے آپ کو پہلے کسی خط میں بتایا تھا کہ بھائی جان اور محمد انور

Marfat.com

یونانی دواؤں سے علاج کرتے ہیں، اس لیے بھائی جان کو حکیم کہا جاتا ہے، جس کے عربی میں معنٰی ہیں" دانا آدمی" ۔اس پیشے کو پروان چڑھانے کی پوری کوشش کی جاتی ہے اور یہ باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتا رہتا ہے۔" شریفہ میڈیسن کمپنی" میں اگرچہ جدید ایلو پیتھی ادویات بھی رکھی جاتی ہیں لیکن ان کی تخصیص یونانی دواؤں ہی میں ہے جو پتوکی اور اردگرد کے علاقوں میں خودرو جڑی بوٹیوں اور خاص پودوں کے پتوں سے بنائی جاتی ہیں۔ بھائی جان کی طرح کے اصلی حکیم دواؤں کا مطالعہ اس علاج کی بنیاد پر کرتے ہیں جو ازمنہ وسطٰی کے عظیم مسلمان حکیموں نے متعارف کروایا تھا جیسے الرازی(865-925ء) اور ابن سینا (980-1037ء)۔ پاکستانی پریس میں یونانی طریق علاج کی سخت مخالفت کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ بیسویں صدی میں ان دواؤں کے استعمال کا کوئی جواز نہیں، یہ طریقہ علاج اپنی افادیت کھو چکا ہے اور اب اس پر پابندی عائد ہونی چاہیے۔ میں اس موضوع پر کچھ کہنے کا دعوٰی تو نہیں کرسکتی لیکن یونانی دواؤں کے حق میں سب سے بڑی دلیل خود میرے گھر میں موجود ہے۔ میں نے آپ سے آپا کی والدہ کا ذکر نہیں کیا جن کی عمر ستر سال ہے اور وہ ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ مجھ سمیت سب لوگ انہیں" اماں" کہتے ہیں میں جب پتوکی آئی تھی تو اماں سخت بیمار تھیں۔ وہ اتنی کمزور تھیں کہ ان سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا اور وہ چارپائی پر پڑی کراہتی رہتی تھیں۔ محمد انور جو جدید دواؤں پر یقین رکھتے ہیں، انہیں لے کر لاہور اور کراچی گئے اور انہیں بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا اور اماں کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئیں۔ ان کے معدے میں کوئی تکلیف تھی۔ طرح طرح کے معائنوں اور ایکس رے کے باوجود تشخیص نہ ہوسکی کہ انہیں کیا تکلیف ہے۔ ان کے گلے میں بھی سخت جلن ہوتی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ جدید دواؤں سے ان کی تکلیف کم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی گئی۔ میرے آنے کے کچھ دنوں بعد ان کی حالت نازک ہوگئی۔ دور دراز کے رشتہ دار اور احباب گھر میں جمع ہوگئے۔ کئی لوگوں نے یہ سوچ کر کہ ان کی موت کا وقت قریب ہے سورۂ یٰسین پڑھنی شروع کردی جو مرتے ہوئے شخص کے

Marfat.com

سرھانے تلاوت کی جاتی ہے۔ محمد انور ان کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ اس وقت بھائی جان نے اسے مشورہ دیا کہ وہ یونانی دوائیں بھی آزما لے۔ وہ مان گئے۔ ان یونانی دواؤں کا جو اثر ہوا وہ کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ اماں ٹھیک ہونے لگیں۔ انہوں نے بستر چھوڑ دیا۔ اب وہ بالکل صحت مند ہیں اور گھرداری میں نوجوان خواتین کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ اماں کبھی کسی سکول نہیں گئیں، نہ انہیں پڑھنا لکھنا آتا ہے لیکن وہ بہت دانا اور ذہین خاتون ہیں۔ ہم سب ان سے بہت پیار کرتے ہیں۔

اگر میں یہ کہوں کہ امریکہ بڑھاپے میں داخل ہونے والوں کے لیے بڑی افسردہ جگہ ہے تو میرا خیال ہے کہ آپ اس سے اختلاف نہیں کریں گے۔ پاکستان میں ایسا نہیں ہے، یہاں رشتوں کے بندھن بہت مضبوط اور ناقابل شکست ہیں۔ پاکستانی خاندان میں کنبے کے سبھی افراد شامل ہوتے ہیں۔ صرف والدین اور اپنے بچے ہی نہیں بلکہ نانا، نانی، دادا، دادی، چچا، ماموں، تایا زاد اور چچا زاد بھائی بلکہ سسرالی رشتہ دار بھی خاندان ہی میں شمار کیے جاتے ہیں۔ بوڑھے والدین اپنے شادی شدہ بچوں کے ساتھ رہنے میں کوئی ذلت محسوس نہیں کرتے بلکہ اس کا عام رواج ہے۔ بوڑھے لوگوں کا احترام کیا جاتا ہے اور انہیں بوجھ سمجھ کر بوڑھے لوگوں کے اداروں یا دماغی امراض کے بے کیف سرکاری اداروں میں نہیں بھیجا جاتا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس معاشرے میں ایسے اداروں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اللہ نہ کرے میں اپنی زندگی میں ایسے ادارے یہاں قائم ہوتے دیکھوں۔ لارچمونٹ ایکڑز میں ہماری پرانی ہمسائی مسز سٹارک کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کی خبر سے مجھے بہت صدمہ ہوا۔ میرے ذہن میں ان کی خوشگوار یادیں تازہ ہیں۔ جب میں بیمار تھی اور آپ تعطیلات گزارنے کے لیے بیرون ملک گئے ہوئے تھے تو انہوں نے ہی میری تیمارداری کی تھی۔ لارچمونٹ ایکڑز میں برسوں ان کی ہمسائیگی ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ اگر وہ پاکستان ہوتیں تو ان کے بڑے اور شادی شدہ بچے، آخر وقت تک پوری محبت سے ان کا خیال رکھتے۔ انہیں کبھی بوڑھے لوگوں کے ادارے میں نہ بھیجا جاتا۔ آپ نے مجھے مسز سٹارک کے بارے میں جو کچھ بتایا، اسے

Marfat.com

یاد کر کر کے مجھے ہول اٹھتا ہے۔ اسی طرح لارچمونٹ میں ہماری ایک اور ہمسائی مسز گیسٹ کے بارے میں جان کر بھی مجھے بڑا دکھ ہوا کہ انہیں دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ ہسپتال میں داخل ہیں۔ میری دعا ہے کہ وہ جلد صحت یاب ہوں۔ میرے احساسات ان تک پہنچا دیجیے گا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ یونی ٹیرین چرچ کے پادری ویسے صحت یاب ہو کر ہسپتال سے فارغ ہو گئے ہیں اور اپنے کام پر واپس آ گئے ہیں۔

میری تمام تر محبتیں

مریم

Marfat.com

پتوکی سے دسواں خط

مریم جمیلہ
معرفت حکیم رائے نعمت علی خان
صدر طبیہ ایسوسی ایشن،
مین بازار پتوکی، ضلع قصور، پاکستان
8 فروری 1963ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکرز، اپارٹمنٹ نمبر C-223
لارچمونٹ، نیویارک، یو۔ایس۔اے

بہت پیاری امی اور ابو!

آپ کا 26 جنوری کا تفصیلی اور دلچسپ خط مجھے مل گیا ہے اور امید ہے کہ اب تک آپ کو میرا 21 جنوری کا طویل خط مل گیا ہوگا جو میں نے فضائی ڈاک سے رجسٹر کر کے بھجوایا تھا۔ لگتا ہے کہ فضائی ڈاک سے بھجوائے گئے خط آپ کو دو ہفتوں یا اس سے بھی زائد عرصے میں ملتے ہیں۔

یہ خط مختصر ہوگا کیونکہ یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ نیا چاند نظر آنے پر یہاں رمضان 26 جنوری کو شروع ہوا۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ 27 جنوری کو شروع ہوگا کیونکہ تمام کیلنڈروں پر یہی تاریخ دی گئی تھی۔ لیکن صبح ایک بجے محمد انور کے ملازم نے ہمیں جگایا اور بتایا کہ ریڈیو پر اعلان ہوا ہے کہ رمضان کا چاند نظر آ گیا ہے۔ آج بارھواں روزہ ہے۔ صبح تین بجے چار پگڑی پوش آدمی بڑے بڑے ڈھول اور مٹی کے تیل کے لیمپ لیے پورے پتوکی کا چکر لگاتے ہیں۔ وہ ہر گھر کے سامنے کھڑے ہو کر زور زور سے

Marfat.com

ڈھول پیٹتے ہیں اور گھر والوں کو جگاتے ہوئے اللہ کی رحمت کی دعا کرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ وہ سحری اور صبح کی نماز کے لیے اٹھ جائیں۔ اس کے بعد ہمارا ملازم آتا ہے۔ ڈھیر ساری چپاتیاں بناتا ہے اور گزشتہ رات کا بچا ہوا سالن گرم کرتا ہے۔ آپا، بھائی جان اور میں، بکرے کے گردے کلیجی سے بنے ہوئے سالن، چپاتیوں اور دودھ سے بھرپور ناشتہ کرتے ہیں۔ اس دوران میں ننھی فرحت گہری نیند سوئی رہتی ہے۔ وہ آٹھ دس سال کی عمر سے پہلے روزے نہیں رکھے گی۔ بس اس کے بعد ہم سورج غروب ہونے تک کچھ نہیں کھائیں پییں گے۔ آج کل غروب آفتاب کا وقت چھ بجے ہے، جس کے فوراً بعد ہم کھانا کھاتے ہیں۔ آپا نے مجھے کہا ہے کہ رمضان کے دنوں میں مجھے نماز پر خصوصی توجہ دینی چاہیے اور زیادہ تر وقت تلاوت قرآن اور ذکر میں گزارنا چاہیے۔ ذکر ہم تسبیح کی مدد سے کرتے ہیں جو عیسائیوں کی "روزری" کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں ننانوے دانے ہوتے ہیں جو تین حصوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ ایک امام کہلاتا ہے۔ ہم تینتیس مرتبہ عربی میں سبحان اللہ، تینتیس مرتبہ الحمد للہ اور چونتیس مرتبہ اللہ اکبر پڑھتے ہیں۔ اس تسبیح پر اللہ کے ننانوے نام بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ ہم خواتین تو گھروں میں نماز پڑھتی ہیں لیکن مسجدیں چوبیس گھنٹے کھلی رہتی ہیں اور مرد رمضان کا زیادہ تر وقت مسجدوں ہی میں گزارتے ہیں۔ وہ تقریباً وہیں رہتے ہیں۔

رمضان کے دنوں میں پتوکی کے مضافات سے بہت سے داستان گو اور تماشا دکھانے والے اپنے سیاہ، بھورے ریچھ، بندر اور طوطے لے کر آتے ہیں۔ بچے ان کی کہانیاں دلچسپی سے سنتے ہیں اور بڑے شوق سے تماشے دیکھتے ہیں۔ میں بھی ان کی کہانیاں دلچسپی سے سنتی ہوں۔ انہوں نے لمبی لمبی قمیصیں پہنی ہوتی ہیں، سر پر سندھی ٹوپی، گلے میں منکوں کی مالائیں، ہاتھوں میں کڑے اور ہاتھوں کی انگلیوں میں رنگ برنگے پتھروں کے نگینوں والی انگوٹھیاں۔ وہ انتہائی غریب ہوتے ہیں۔ ان کے پاس جوتے بھی نہیں ہوتے اور وہ ننگے پاؤں ہی پھرتے ہیں۔ اگرچہ وہ بھی خیرات مانگتے ہیں لیکن پیشہ ور بھکاریوں کی طرح لالچی نہیں ہوتے۔ چند چپاتیوں یا مٹھی بھر آٹے کے

Marfat.com

عوض وہ صوفی بزرگوں کے شاعرانہ کلام سے کہانیاں سناتے ہیں۔ ان میں سے ایک "سائیں مرنا" بہت مشہور ہیں۔ پاکستان آنے کے بعد میں نے روزنامہ پاکستان ٹائمز میں ان کے حالات پڑھے تھے۔ وہ 1910ء میں بھارت کے مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ جوان ہوئے تو ایک عورت کی محبت میں گرفتار ہو گئے جس نے انہیں مسترد کر دیا۔ اس سانحہ کے بعد انہوں نے اپنا سارا ساز و سامان بیچ دیا اور اپنی شاعری کا صوفیانہ کلام گاتے ہوئے انہوں نے قریہ بہ قریہ، کوبہ کو پھرنا شروع کر دیا۔ وہ صوفی بزرگوں کے مزاروں پر بھی سامعین کو اپنے کلام سے مسحور کر دیتے تھے۔

مجھے بڑا دکھ ہے کہ آپ کو اس مرتبہ بڑی سخت سردی برداشت کرنا پڑی۔ میری خواہش ہے کہ کاش آپ سب یہاں پتوکی میں ہوتے کیونکہ آج کل ہم جنت کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ مطلع صاف رہتا ہے، سورج چمکتا رہتا ہے اور درجہ حرارت ساٹھ ستر کے درمیان رہتا ہے۔ سردیاں ختم ہو چکی ہیں۔ میں نے اپنا بھاری کوٹ لپیٹ کر رکھ دیا ہے۔ موسم بہار شروع ہو چکا ہے اور کیا زبردست موسم ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ سدا ایسا ہی رہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ دو مہینوں میں طویل موسم گرما شروع ہو جائے گا، درجہ حرارت سو سے اوپر رہے گا اور چھ مہینوں تک سکھ کا سانس نصیب نہیں ہوگا۔ سو جب تک جنت کا یہ موسم ہے، ہم اس سے لطف اٹھا رہے ہیں۔

میری اردو بتدریج بہتر ہو رہی ہے۔ ذخیرۂ الفاظ ایک ہزار سے اوپر ہو چکا ہے اور اب میں اس قابل ہو گئی ہوں کہ جو کہنا چاہوں، کہہ سکتی ہوں۔ لیکن قواعد نہ جاننے کی وجہ سے میری گفتگو لوگوں کو مزاحیہ لگتی ہے۔ گھر والے لوگ جیسے آپا، میری بات فوراً سمجھ لیتی ہیں۔ یہاں کے ناخواندہ لوگ صرف پنجابی بولتے ہیں جو بالکل بھی میرے پلے نہیں پڑتی۔ پنجابی ایک لہجہ ہے جو تحریری زبان نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی لٹریچر ہے۔ البتہ دیہاتوں میں اس زبان کے بہت سے گلوکار ملتے ہیں اور زبانی داستانیں بھی سنائی جاتی ہیں۔ البتہ شہروں میں ایسے لوگ نہیں ملتے۔

ایک اچھا پاکستانی مسلمان اس وقت تک پڑھا لکھا نہیں سمجھا جاتا جب تک اسے

Marfat.com

فارسی زبان پر عبور حاصل نہ ہو۔ فارسی میں ماہر پاکستانی مولانا جلال الدین رومی (1273-1207ء) کی مثنوی پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں جو دراصل قرآن کی شاعرانہ تفسیر ہے اور اسے عالمی ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔ جنہیں فارسی نہیں آتی اور وہ مثنوی کو فارسی میں نہیں پڑھ سکتے وہ اس کے اردو ترجموں میں سے کوئی ترجمہ یا اس کی شرح پڑھتے ہیں۔ مولانا مودودی کو اردو اور عربی کے علاوہ فارسی پر عبور حاصل ہے۔

کزن لوئیس کے بارے میں آپ نے جو خبر لکھی ہے، بڑی زبردست ہے۔ اس سے زیادہ بہتر بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ چچی ہیلن بھی اس کی طرح اس کی شادی پر خوش ہوں گی۔ اور آپ کا وہ خط بھی دلچسپ تھا جس میں آپ نے لکھا تھا کہ اس کا شوہر اسے "کھلا ہوا کنول" کہتا ہے۔ جی! یہ محبت کا کمال ہے۔

میری ساری محبتیں

مریم

Marfat.com

پتوکی سے گیارھواں خط

مریم جمیلہ
معرفت حکیم رائے نعمت علی خان
صدر طبیہ ایسوسی ایشن
مین بازار پتوکی، ضلع قصور، پاکستان
28 فروری 1963ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکرز، اپارٹمنٹ نمبر 223-C
لارچمونٹ، نیویارک، یو۔ایس۔اے

پیاری ترین امی اور ابو!

عید کے موقع پر بھائی جان اور آپا کے لیے تحفے بھیجنے اور ہر خط میں ان کے لیے تہنیت کے پیغامات پر میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔ رمضان کا مقدس مہینہ گزار کر ہم عید کے موقع پر بہت خوش تھے، لیکن آپا کا دردِ شقیقہ بہت بڑھ گیا ہے۔ محمد انور کی بیوی فاطمہ گزشتہ سولہ دنوں سے ملیریا کے بخار میں مبتلا ہے۔ ہم یہ جان کر بھی بڑے اداس ہیں کہ پچھلے مہینوں میں مولانا مودودی کی صحت کافی گر گئی ہے۔ ان کے گردوں میں تکلیف ہے، مثانے میں پتھریاں ہیں، جوڑوں میں خاص طور پر گھٹنوں میں درد ہے۔ وہ جدید ترین دواؤں سمیت بہت سی دوائیں لیتے ہیں لیکن کسی سے آرام نہیں ملتا۔

تین دن ہوئے، ہمارا رمضان کا مقدس مہینہ ختم ہوا ہے۔ اللہ کی مدد سے ہم سب

Marfat.com

نے پورے مہینے کے روزے رکھے۔ میں پاکستان ٹائمز سے تراشا گیا ایک مضمون آپ کو بھیج رہی ہوں جو نیوز ویک سے لیا گیا ہے۔ اس طرح کے مضامین اور مخالفانہ پروپیگنڈے کی وجہ سے ہم مسلمان مغربی لوگوں اوران کے لٹریچر پر اعتبار نہیں کرتے۔ کمیونسٹ بھی ان سے کم نہیں۔اس آرٹیکل کے کچھ اقتباسات:

"روزوں میں کام اور صلاحیت کار کم ہوجاتی ہے۔" (امریکی میگزین)

روزوں سے اوقاتِ کار کم ہو جاتے ہیں اور کام کرنے کی صلاحیت بھی متاثر ہوتی ہے۔ نیوز ویک کے تازہ شمارے کے مذہبی کالم میں" فاسٹنگ اور فیسٹنگ" (روزے رکھنا اور پیٹ بھر کھانا کھانا) کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ محمدی کیلنڈر میں مسلمانوں کے مقدس مہینے رمضان کے قواعد وضوابط چودہ سو سال پہلے بیان کیے گئے تھے اور آج کی ان مسلمان حکومتوں کو ان سے کوئی فائدہ نہیں جو اپنے عوام کو بیسویں صدی کی روشنی میں لانا چاہتے ہیں۔ سارا دن روزے سے رہنا، غروب آفتاب کے بعد پیٹ بھر کے کھانا کھانا اور پھر کئی گھنٹوں کی عبادت سے انسان دوسرے دن اپنے کام پر چڑچڑا بنا رہتا ہے۔ محمڈن لوگوں کا پورے رمضان میں اپنے پروگرام پر کاربند رہنے سے اوقاتِ کار اور کام کرنے کی صلاحیت کم ہوجاتی ہے۔

میگزین میں قاہرہ کی ٹیکسٹائل ملوں کے مالکان کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ پاکستان میں پٹ سن کے برآمد کنندگان اور شام میں سیمنٹ پیدا کرنے والے کارخانے بھی اس سے متاثر ہوئے ہیں۔

سحری کے وقت جگانے والوں کا ذکر کرتے ہوئے، میگزین لکھتا ہے،" کیسا بلانکا سے کراچی تک یہ لوگ سحری کے وقت اٹھتے ہیں اور شہروں کی سڑکوں اور دیہاتوں کی گردآلود گلیوں میں ڈھول پیٹ پیٹ کر لوگوں کو جگاتے ہیں اور انہیں اپنے مذہبی فرائض کی طرف متوجہ کرتے ہیں...... جدید دنیا کے تقاضوں سے یہ کتنی متضاد سرگرمیاں ہیں۔"

ہر صبح سورج نکلنے سے پہلے محمد انور اذان کی آواز سن کر اٹھتے ہیں اور با جماعت نماز کی ادائیگی کے لیے قریبی مسجد میں جاتے ہیں۔ نو بجے سے پہلے وہ اور بھائی جان

Marfat.com

اپنی ڈسپنسری میں موجود ہوتے ہیں اور ان بیماروں کو دیکھ رہے ہوتے ہیں جو علاج کے لیے ان کے پاس آتے ہیں۔ ظہر اور عصر کی نمازوں میں وقفہ کرتے ہیں اور سورج غروب ہونے تک اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ ہم عورتیں رمضان میں بھی معمول کی طرح گھر داری کے کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔ دن بھر کے روزے کے بعد ہم کوئی پر تکلف ٹھاٹ دار کھانا نہیں کھاتے بلکہ معمول کا وہ کھانا ہی کھاتے ہیں جو چپاتیوں، چٹپٹی سبزیوں اور بکرے کے گوشت کی بوٹیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس پر دودھ یا سادہ پانی پیا جاتا ہے۔ نیوز ویک میں جس گھنٹوں کی عبادت کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے، جب ہم شام کا کھانا کھا لیتے ہیں جو دس منٹ میں ختم ہو جاتا ہے تو آپا بستر پر لیٹ کر آرام کرتی ہیں جب کہ بھائی جان تسبیح پر ذکر کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ساڑھے سات بجے عشاء کی اذان ہو جاتی ہے۔ وہ مسجد چلے جاتے ہیں اور دو گھنٹوں تک تراویح پڑھتے ہیں۔ واپس آ کر سو جاتے ہیں۔ ٹھیک تین بجے، چار دبلے پتلے پگڑی پوش آدمی مٹی کے تیل کے لیمپ اٹھائے ڈھول بجاتے ہوئے آتے ہیں اور لوگوں کو سحری اور صبح کی نماز کے لیے اٹھاتے ہیں۔ سحری کا کھانا رات کے بچے ہوئے سالن، چپاتیوں اور دودھ پر مشتمل ہوتا ہے۔ تقریباً سوا پانچ بجے فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد ہم سب پھر چند گھنٹوں کے لیے سو جاتے ہیں۔

یہ ہے وہ روزمرہ کا معمول جو نہ صرف اس گھرانے میں رائج ہے بلکہ پوری دنیا میں تمام مسلمانوں کے ہاں قریب قریب اسی معمول پر عمل کیا جاتا ہے، نہ کہ وہ جو نیوز ویک نے لکھا ہے۔ اپنی طبیعت کی سخت خرابی کے باوجود، مولانا مودودی نے بھی پورے رمضان کے روزے رکھے اور صبح سے لے کر رات گئے تک وہ اپنے تمام فرائض معمول کے مطابق انجام دیتے رہے۔

تو اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم جب اخبار میں چھپنے والے اس جیسے شر انگیز مضامین پڑھتے ہیں تو ہمارے احساسات کیا ہوتے ہیں۔

تین دن پہلے جب صاف آسمان پر نئے مہینے کا چاند نظر آیا تو یہ گویا رمضان کے

Marfat.com

اختتام کا اعلان تھا۔ پتوکی میں ہر طرف جشن کا سماں تھا۔ فرحت کی طرح کے چھوٹے بچے بھی خوشی سے اچھل کود رہے تھے۔

ہماری عید بڑی خوشگوار گزری۔ یہ ایک روشن چمکدار دن تھا۔ بھائی جان صبح سویرے اٹھے اور عید کی نماز پڑھنے گئے جو لوگوں کی کثیر تعداد کے پیش نظر، کھلے میدان میں ادا کی جاتی ہے۔ آپا نے مجھے بتایا کہ میں عورتوں کے ساتھ نماز میں شامل ہو سکتی ہوں لیکن قدرت کو اس دن کچھ اور منظور تھا، جس کی وجہ سے میں ان کے ساتھ نہ جا سکی۔ تاہم میں نے اور آپا نے غسل کیا اور بہترین کپڑے پہنے۔ عید کے لیے آپا، ان کی بہن مشتاق بیگم اور اماں نے میرے لیے گوٹے کناری سے مزین نیلے رنگ کی ریشمی شلوار قمیص تیار کی تھی۔ اپنے بہترین کپڑوں میں ملبوس ہو کر آپا، فرحت اور میں محمد انور کے گھر گئے اور ہم نے ان کے ساتھ بڑا خوشگوار وقت گزارا۔ پتوکی میں عید ایک طرح کا خاندانی تہوار ہوتا ہے اور اس سے مجھے "تھینک گونگ" یعنی شکریے کی تعطیلات یاد آگئیں جو میں نے آپ کے ساتھ، ہیٹی، والٹر، ڈیبی، سسو اور آنٹی ہیلن کے ساتھ گزاری تھیں اور اگر آپ غور کریں تو ہماری عید صحیح معنوں میں شکریے کی تعطیلات ہیں۔

ایک ہفتے پہلے کی بات ہے کہ ایک عجیب وغریب واقعہ ہوا۔ اتنا عجیب کہ میں حیران ہوں کہ واقعہ رونما ہوا تھا یا محض ایک خواب تھا۔ محمد انور کی بوڑھی والدہ، ان کی اہلیہ، ان کی دو بہنیں اور میں، سب اماں کے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور عشاء کی نماز کے بعد سونے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ ہمارے ملازم نے دروازہ کھٹکھٹایا اور بتایا کہ دو انگریز لڑکیاں باہر ایک کار میں بیٹھی ہیں اور وہ اندر آ کر مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ حیرت سے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ انگریز لڑکیاں پتوکی میں؟ وہ یہاں کیا کر رہی ہیں؟ غنودگی کے عالم میں، میں نے ملازم سے اردو میں کہا کہ جاؤ انہیں اندر بلا لاؤ۔ ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ دونوں لڑکیاں تمتماتے ہوئے چہروں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے ہلکے رنگ کے بھورے بال کٹے ہوئے تھے اور انہوں نے سرخ رنگ کے چست سویٹر اور جسم سے چپکی ہوئی جین کی پتلونیں، پیدل

Marfat.com

چلنے کے لیے مخصوص جوتے اور موٹی سفید اونی جرابیں پہن رکھی تھیں۔ اگرچہ دونوں لڑکیاں بالکل دبلی پتلی تھیں لیکن ان کے کپڑے اتنے چست تھے کہ ان کا جسم آگے پیچھے دونوں طرف سے باہر نکلا ہوا تھا۔ کچھ دیر تو بالکل خاموشی رہی۔ وہ حیرت سے مجھے تکتی رہیں، میں انہیں۔ پھر میں نے خاموشی توڑی اور ان سے پوچھا کہ وہ پنڈی کیسے آئی ہیں؟ دوستوں سے ملنے، مطالعے کا کوئی سلسلہ یا کوئی کاروباری مصروفیت؟ انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا اور بتایا کہ چار مہینے پہلے وہ لندن میں اپنے گھروں سے دنیا کی سیاحت پر روانہ ہوئی تھیں۔ انہوں نے لوگوں سے لفٹ لیتے ہوئے وسطی یورپ کا سفر کیا۔ ترکی پہنچیں اور مشرق وسطی کا سفر کرتے ہوئے پاکستان پہنچی ہیں۔ صرف ترکی میں آبنائے باسفورس کو عبور کرنے کے لیے انہیں بحری سفر کرنا پڑا۔ وہ بھارت میں بنارس تک گئی تھیں اور اب واپس وطن پلٹ رہی تھیں اور چاہتی تھیں کہ آئندہ کرسمس وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ منائیں۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ وہ بہت جوان نظر آتی تھیں۔ دو جوان لڑکیاں جو اکیس بائیس برس سے زیادہ کی نہیں تھیں اور انہوں نے اتنا طویل سفر "صرف دنیا دیکھنے" کے لیے طے کیا تھا۔ دو جوان لڑکیاں! کسی بھی آدمی سے لفٹ لینے کے لیے تیار! کوئی بھی آدمی انہیں ساتھ لے جا سکتا تھا! دو جوان لڑکیاں، تن تنہا!

"تم واقعی بڑی نڈر ہو، مہم جو طبیعت کی مالک۔ تمہیں پاکستان کیسا لگا؟" انہوں نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا اور کہا: "یہاں لوگ ہر وقت ہمیں گھورتے رہتے ہیں جیسے ہم بندروں کا جوڑا ہوں۔"

میں نے ایک نظر ان کے لباس پر ڈالی اور پھر یہ پوچھنے کی جرأت کی "تم نے جو لباس پہن رکھا ہے وہ مغرب میں تو سیر و تفریح کے لیے مناسب سمجھا جاتا ہے لیکن مجھے بلا تکلف بتاؤ کہ لاہور اور کراچی میں لڑکیاں ایسے ہی لباسوں میں بازاروں میں نظر آتی ہیں؟"

انہوں نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے میں نے ان کی بے عزتی کر دی ہو۔

Marfat.com

بولیں، "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ انہوں نے ہر حال میں ہمیں گھورنا تو ہے"۔ پھر انہوں نے مجھے غور سے دیکھا، میں سر سے پاؤں تک لمبے کپڑوں میں ملبوس تھی اور میرے سر پر دوپٹہ تھا۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا، "تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ ہم نے سنا ہے کہ تم امریکی ہو اور تم نے مسلمان ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ تم کب واپس جا رہی ہو؟"

میں نے بے چینی سے ان کی طرف دیکھا اور کہا" میں واپس نہیں جا رہی۔ میں کبھی امریکہ یا کسی یورپی ملک نہیں جاؤں گی۔ یہ میرا گھر ہے اور ان لوگوں کو میں اپنی فیملی سمجھتی ہوں۔ میں ہمیشہ یہیں رہنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔"

انہوں نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا اور کہا" تم یہ حرکت کیسے کر سکتی ہو؟ تمہاری فیملی کے لوگ اس بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں؟"

میں نے وضاحت کی" امریکہ کی زندگی مجھے راس نہیں آئی۔ میرے اور میرے خاندان والوں کے درمیان کوئی تلخی نہیں۔ وہ اس بات پر خوش ہیں کہ مجھے یہاں خوشی مل گئی ہے۔"

انہوں نے پوچھا۔" کیا تم بھی پردہ کرتی ہو؟ کیا باہر جاتے ہوئے تم بھی سیاہ برقع پہنتی ہو؟ اور کیا تمہیں بھی خاندان سے باہر کے مردوں سے ملنے کی اجازت نہیں؟"

"ہاں! میں سختی سے پردہ کرتی ہوں۔ میں شاذ ہی باہر جاتی ہوں۔ درحقیقت پچھلے دو مہینوں سے میں اس گھر سے باہر نہیں نکلی۔"

"کیا خوفناک زندگی ہے! تم اپنا وقت کیسے گزارتی ہو؟"

میں نے جواب دیا" میں بہت کچھ لکھتی پڑھتی رہتی ہوں۔"

"کیا لکھتی رہتی ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"میں رسالوں، اخباروں اور کتابوں میں اسلام کے بارے میں لکھتی ہوں۔"

"لیکن تم یہ زندگی کیسے برداشت کر سکتی ہو؟ مسلمان خواتین کو غلام سمجھا جاتا ہے! تم یہ پردہ کرنا کیسے گوارا کر سکتی ہو؟"

Marfat.com

"باہر سے اسلامی زندگی کو دیکھنا ایک مختلف چیز ہے اور اس کا حصہ بن کر اسے اندر سے محسوس کرنا بالکل مختلف۔۔۔۔"

دونوں لڑکیوں نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا پھر بولیں، "ہمیں جانا ہے، جی، ہمیں جانا ہے۔ ہمیں بھوک لگ رہی ہے اور باہر کار ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

"رات گہری نیند سونا اور مزے اڑانا۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

جیسے ہی انگریز لڑکیاں آنکھ سے اوجھل ہوئیں، محمد انور کی والدہ، اہلیہ اور بہنیں جو مہمان لڑکیوں کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی ہنسی دبائے ہوئے تھیں، یکدم قہقہے لگا کر ہنسنے لگیں۔ پھر یہ سوچ کر کہ یہ انگریز لڑکیاں اگر اس چست لباس میں پتو کی کے بازاروں میں پھریں تو کیسا لگے گا، ہم پر پھر ہنسی کا دورہ پڑا اور ہم ہنستے ہنستے بے حال ہو گئیں۔

بالآخر میں نے اپنی ساتھیوں سے کہا، " ان پر ہنسو مت، وہ لڑکیاں بری نہیں ہیں، انہیں اپنے کلچر سے بہتر بات پتہ نہیں ہے۔"

دوسرے دن ملازم میرے پاس آیا اور بڑی رازداری سے چپکے چپکے بولا، "ان لڑکیوں کو اسلام بالکل پسند نہیں۔ انہیں آپ سے ملنا اچھا نہیں لگا۔ انہیں کوئی بات پسند نہیں آئی۔"

مجھے عرصے سے برازیل کی سابق شوگرل مارلینا کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ ایک مہینہ پہلے اچانک اس کا خط آیا جس میں اس نے بتایا کہ کسی غنڈے بدمعاش نے سائیکل مار کر اسے زمین پر گرا دیا تھا اور اس کے پاؤں کی ہڈی تین جگہ سے ٹوٹ گئی ہے۔ کسی راہگیر مسلمان نے ترس کھاتے ہوئے اسے کرسچین مشنری ہسپتال پہنچا دیا جہاں وہ دس دن داخل رہی۔ ہسپتال کی طرف سے بس ایک کھری چارپائی مہیا کی جاتی ہے۔ کوئی چادر، تکیہ، کمبل، صابن، تولیہ، یہاں تک کہ کھانا بھی فراہم نہیں کیا جاتا۔ ان چیزوں کے لیے اسے اپنے مسلمان دوستوں پر تکیہ کرنا پڑا لیکن خالی رہائش کے بھی ہسپتال والے پانچ روپے (ایک ڈالر) روزانہ وصول کرتے تھے جس کی مسلسل

Marfat.com

ادائیگی اس کے بس میں نہیں تھی چنانچہ وہ پھر مسز اقبال شیخ کے ہاں چلی گئی۔ پچھلے چار مہینوں سے وہ وہیں ہے۔ اس خط سے مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں نے فوراً اس کا جواب لکھا اور اسے تسلیاں دیں۔ ایک ہفتے کے بعد اس کا ایک اور خط آیا جو اس قدر افسردہ کن تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے لکھا تھا کہ اس کے ساتھ اتنے دھوکے کئے گئے ہیں کہ وہ یہ سوچتی ہے کہ اگر اسلام کی تعلیمات سے ایسی شخصیات ہی تیار ہوتی ہیں تو وہ اسلام کے بغیر ہی بھلی۔ اس کا اسلام قبول کرنے کا ارادہ بری طرح ڈول رہا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ اپنے ٹوٹے ہوئے پاؤں پر پلاسٹر کے باوجود ساہیوال سے پتوکی آنا چاہتی ہے۔ ساہیوال کے حالات اس کے بقول ایسے تھے کہ میرا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ ہم نے یکم دسمبر کی تاریخ طے کی۔ اس دن وہ دوپہر کے وقت لنگڑاتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔ ہمارے ملازم نے اس کا سامان اٹھا رکھا تھا اور اسے سہارا دے کر اندر لا رہا تھا۔ چونکہ گھر کی خواتین کو اس کی آمد کی خبر تھی اور میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ ہمیں خلوت میں باتیں کرنی ہیں، انہوں نے ہمیں اکیلا چھوڑ دیا۔ چنانچہ پوری دوپہر ہم محمد انور کے کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ مارلینا بہت سٹپٹائی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی دلجوئی کی اور مشورہ دیا کہ وہ پرانی باتیں بھول کر از سر نو اپنی زندگی کا آغاز کرے۔ اس نے اپنی پوری کی پوری کتھا مجھے سنائی۔

اس کی عمر چھتیس برس ہے۔ وہ برازیل کے شہر ریوڈیوجنیرو میں پیدا ہوئی۔ وہ تین سال کی تھی جب اس کے گھر والوں نے وہ ملک چھوڑ دیا جسے اس نے جی بھر کے دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی مادری زبان پرتگالی بھول گئی اور اب انگریزی ہی اپنی مادری زبان کی طرح بولتی ہے۔ اس نے اپنی اٹھان کے بہت سے سال برما میں گزارے جہاں اس کے والد بڑے کامیاب ڈاکٹر تھے۔ برازیل کے باقی باشندوں کی طرح اس کے والدین بھی کیتھولک عیسائی تھے۔ اس کا کوئی بھائی نہیں تھا اور اس کے والد، جن کا وہ عبادت کی حد تک احترام کرتی تھی، چاہتے تھے کہ مارلینا بھی ان کی طرح ڈاکٹر بنے۔ البتہ اس کی والدہ اچھی خاتون نہیں تھی اور بری طرح شراب نوشی کرتی تھی۔ اس کے

Marfat.com

والد نے اس کے حسن پر فریفتہ ہوکر اس سے شادی کر لی تھی۔ وہ تیرہ برس کی تھی جب اس کے والد ہیضے میں مبتلا ہوکر انتقال کر گئے اور ان کے مارلینا کو ڈاکٹر بنانے کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اس کے بعد چونکہ اس کے خاندان والے بار بار شہر بدلتے تھے اس لیے اس کی تعلیم بھی ادھوری رہ گئی۔ لیکن بچپن ہی سے اس میں دوسری صلاحیتیں موجود تھیں۔ اسے اداکاری کا شوق تھا اور وہ اپنی صلاحیتوں کا اظہار چاہتی تھی۔ جب وہ سولہ سال کی تھی تو اس کی ملاقات ایک فلم بنانے والی کمپنی کے لوگوں سے ہوئی جو برما میں کسی شوٹنگ کے لیے آئے ہوئے تھے۔ انہیں مارلینا جیسی لڑکی کی تلاش تھی۔

اس نے فلم کمپنی میں شمولیت اختیار کرلی۔ وہ کمپنی یورپ واپس آئی۔ اس نے ان کے ساتھ دو اور فلموں میں بھی کام کیا۔ جب سے اس نے شو بزنس کو اپنا پیشہ بنالیا۔ وہ پورے یورپ اور آسٹریلیا کی شبینہ کلبوں اور رقص گاہوں میں گلوکاری کرتی تھی۔ جب وہ انیس سال کی تھی تو جرمنی میں ایک ذہین اور مہربان شخص کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ دونوں کی منگنی ہوگئی لیکن شادی سے پہلے ہی وہ ٹریفک کے ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں وہ ان امریکی اور برطانوی فوجیوں کے دل بہلانے کے لیے گاتی اور رقص کرتی رہی جو یورپ میں لڑ رہے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اگرچہ وہ اپنے پیشے میں کامیاب تھی، لیکن اسے اپنی زندگی اور پیشے سے متعلق اخلاق باختہ مردوں اور عورتوں سے نفرت ہونے لگی۔ وہ تیئس سال کی تھی جب اس کی والدہ کا بھی انتقال ہوگیا اور اپنی بڑی بہن بلانچے کے سوا دنیا میں اس کا کوئی نہ رہا۔ اس کی بہن اس سے پندرہ سال بڑی تھی۔ مارلینا کبھی اس محبت کو نہ بھلا پائی جو اس کی بہن نے بچپن سے اس پر نچھاور کی تھی۔ بلانچے بالغ ہوئی تو اسے بھارت کے ایک مسلمان سے محبت ہوگئی جو برما میں رہتا تھا۔ اس نے بلانچے سے شادی کرلی۔ وہ بھارت آئے اور ان کے پانچ بچے پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے افسوسناک دنوں میں انہوں نے بڑی سختیاں جھیلیں۔ ان دنوں ان کے دو بچے ہیضے اور ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہوکر

Marfat.com

چل بسے۔ ان میں ایک تین سالہ بچی پیچیز بہت لاڈلی تھی۔ وہ اکثر اپنی بہن کو اس کے بارے میں لکھا کرتی تھی کہ چھوٹی ہونے کے باوجود وہ اپنی ماں کے ساتھ پانچ وقت کی نماز ادا کرتی تھی۔ وہ مارلینا سے بڑی مشابہت رکھتی تھی۔ بلانچے اس بچی سے اس قدر پیار کرتی تھی کہ اس کی موت کے بعد وہ سنبھل نہ سکی۔ دونوں بہنوں میں خط وکتابت تھی اور دونوں ایک دوسرے کو پیار بھرے خط لکھا کرتی تھیں۔ بلانچے نے مارلینا پر زور دیا کہ وہ پاکستان آکر مسلمان ہوجائے اور کسی اچھے نوجوان سے شادی کرلے۔ مارلینا نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ کیتھولک عیسائی ہے اور خاندان میں کوئی ایک تو ایسا ہونا چاہیے جو اپنے آباء واجداد کے دین پر قائم رہے۔ لیکن جب اپنی زندگی سے اکتا گئی اور اسے شو بزنس اور اس سے متعلق بدچلن لوگوں سے نفرت ہونے لگی تو اسے بہن کی محبت ہی ایسی نظر آئی جس کے سہارے وہ زندہ رہ سکتی تھی۔ گزشتہ جولائی میں اس نے اپنی بہن کی پیشکش قبول کرتے ہوئے لکھا کہ وہ اپنے کسی نئے کام کے سلسلے میں آسٹریلیا جاتے ہوئے اس سے ملے گی۔ جولائی میں وہ آئی اور سولہ سال کے بعد دونوں بہنیں ملیں تو خوشی سے پھولے نہ سمائیں۔ پہلے مہینے اتنے خوشگوار گزرے کہ مارلینا کا اپنی بہن کو چھوڑنے کو دل نہ چاہا۔ آسٹریلیا میں کیا گیا معاہدہ پس پشت ڈال دیا گیا۔ اس کی بہن اب اکیاون برس کی خوبصورت، باوقار خاتون تھی جس کے بال سفید ہوچکے تھے۔ اس کا چھبیس سال کا بڑا بیٹا تھا، اقبال۔ دونوں اس کے لیے رشتہ ڈھونڈنے لگے۔ ان کی ایک پاکستانی شخص سے ملاقات ہوئی جس کی عمر باون برس تھی۔ اس کے بال سفید ہو چلے تھے اور وہ بڑا ذہین، دانشور اور باوقار آدمی تھا۔ وہ بھی کسی ذہین اور دانشور لڑکی کی تلاش میں تھا۔ دونوں نے سمجھا کہ مارلینا کے لیے وہ بالکل موزوں آدمی ہے۔ اس کی بیوی تقسیم کے فسادات میں ہلاک ہوگئی تھی اور اس کے بعد سے اس نے کئی رشتے اس لیے مسترد کردیے تھے کہ مجوزہ لڑکیاں اس کے ذہانت کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں۔ اس نے جب مارلینا کے بارے میں سنا تو اس نے فوری طور پر اقبال کو لکھا کہ اسے یقین ہے کہ مارلینا اس کے لیے مناسب لڑکی ہے۔ وہ فوراً کراچی سے لاہور آکر اس

Marfat.com

سے شادی کرنے کے لیے تیار تھا۔ پھر ایک عجیب وغریب بات ہوئی۔ جب مارلینا، اس کی بہن اور بھانجا اسے لینے کے لیے ائیر پورٹ آئے ہوئے تھے تو انہیں پتہ چلا کہ اس شخص کی ایک چچا زاد جو پینتالیس برس کی تھی اور جس کے بارے میں یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ وہ پندرہ سال پہلے ہندوؤں کے ہاتھوں ماری گئی تھی، اچانک مل گئی۔ وہ اور اس کے گھر والے بھی اس وقت ائیر پورٹ پر موجود تھے۔ اس شخص نے جب اپنی کزن کو دیکھا تو مارلینا کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ دونوں نے کوئی وقت ضائع کیے بغیر چند دنوں بعد شادی کر لی۔

نومبر کے شروع میں مارلینا کے ساتھ وہ حادثہ پیش آیا جس کا پہلے ذکر آیا ہے۔ اس کے مسلمان دوستوں نے ہر طرح سے اس کی مدد کی لیکن اس کی بہن صرف ایک دفعہ اس سے ملنے آئی۔ مارلینا کو اپنی بہن کی سرد مہری اور کٹھور پن سے بڑا صدمہ ہوا اور اس کا دل ٹوٹ گیا۔ جب وہ دس دن ہسپتال رہ کر گھر آئی اور اپنے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ اس کے ٹریولر چیک اور دو سو روپے کی رقم سمیت اس کا سارا سامان چوری ہو چکا ہے۔ اسے پتہ چلا کہ اس کا تئیس سالہ بھانجا فاروق پکا چور ہے اور اپنی خالہ کی چیزیں بھی اسی نے چرائی ہیں۔ جب مارلینا نے مطالبہ کیا کہ فاروق اس کی چیزیں واپس کرے تو اس کی بہن نے بے نیازی اختیار کی اور اس کے بہنوئی نے بھی بیٹے پر کوئی سختی نہ کی۔

اس کے بعد مارلینا اور اس کی بہن میں جھگڑے ہونے لگے اور گھر جہنم بن گیا۔ جب مارلینا نے پولیس کو رپورٹ کرنے کی دھمکی دی تو فاروق نے اس کے ٹریولر چیک تو واپس کر دیے لیکن باقی چیزیں لوٹانے سے انکار کر دیا۔ عین اس وقت جب گھر میں فساد برپا تھا، بڑے بیٹے اقبال نے جو اس وقت تک بے کار تھا، ماں سے پیسے لیے اور جہاز پکڑ کر اپنی شادی کے لیے قاہرہ روانہ ہو گیا۔ فاروق بڑھئی کا کام سیکھنے کے لیے کسی ٹیکنکل سکول جاتا ہے لیکن اس کے استاد نے اسے باہر نکالنے کی دھمکی دی ہے کیونکہ اس کے نزدیک فاروق ایک بے کار شخص ہے اور اس کے ہاتھ جو چیز آئے اڑا لیتا ہے۔

Marfat.com

اکیس سالہ فریدہ اکتوبر سے لاہور میں دماغی امراض کے ہسپتال میں ہے۔ دو مہینے پہلے وہ بھوک کی وجہ سے قریب المرگ تھی لیکن نالیوں کے ذریعے سے زبردستی خوراک دینے کی وجہ سے اب وہ بے تحاشا موٹی ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے اب کچھ بولنا شروع کر دیا ہے لیکن زیادہ تر وہ ایک کرسی پر بیٹھی خلا میں گھورتی رہتی ہے۔ اس کی حالت ایک زندہ لاش کی سی ہے۔ سب سے چھوٹا بیٹا چودہ سالہ احمد ہے جو مارلینا کے بقول سب سے نارمل ہے۔ خاندان والے اسے ایک بہترین سکول میں داخل کروانا چاہتے ہیں لیکن وہ ذہین طالب علم نہیں ہے۔ اب اسے سکول کے قابل دکھانے کے لیے اس کے جعلی کاغذات تیار کیے جا رہے ہیں۔ مارلینا کو اس کی کوئی تک نظر نہیں آتی۔

"فرض کریں کہ وہ داخل ہو بھی گیا تو وہ اپنے مضامین میں فیل ہوتا رہے گا اور سکول میں ٹھہر نہیں سکے گا۔"

"تیئس سالہ فاروق سب کے لیے ایک مسئلہ ہے۔ ہر شخص اس سے نالاں ہے۔ کوئی شخص ایک منٹ کے لیے اپنا کمرہ چھوڑے تو دروازے پر دو دو قفل لگاتا ہے۔ شوہر تعمیرات کا ٹھیکیدار ہے لیکن ذیابیطس کے مرض کی وجہ سے اتنا بیمار ہے کہ بالکل معذور ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا مارلینا سے مطالبہ ہے کہ وہ پچھلے چار مہینوں کی رہائش کے لیے اسے ایک ہزار روپے ادا کرے حالانکہ یہ اس کی بہن کا گھر تھا اور اسی کی دعوت پر وہ آئی تھی۔ فاروق بھی اس کے چھوٹے موٹے کام کرنے کے ڈیڑھ سو روپے طلب کر رہا تھا۔"

"تو مریم! اب میں دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔ میری اب کوئی بہن نہیں۔ اب میں اپنا سامان لینے بمبئی جا رہی ہوں جو ٹامس کک ٹریول ایجنسی کے پاس رکھا ہوا ہے۔ وہاں سے آسٹریلیا جاؤں گی اور وہاں جو معاہدہ ہوا ہے اس کے مطابق کام ختم کرنے کی کوشش کروں گی۔ لیکن میں جن حالات سے گزری ہوں، ان کے بعد میرے لیے ممکن نہیں کہ میں اپنی سابقہ زندگی کی طرف لوٹ جاؤں۔ میں نے یہ راز پا لیا ہے کہ کسی تھیٹر میں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے علاوہ بھی دنیا میں کرنے کے لیے بہت کچھ ہے۔

Marfat.com

مریم! میں بھی مغربی تہذیب سے اتنی ہی نفرت کرتی ہوں جتنی تم۔ میری سابقہ زندگی کا باب بند ہو چکا ہے۔ مسلمان ہوئے بغیر میرے لیے کوئی اور چارۂ کار نہیں۔ ہاں، میں اسلام سے محبت کرتی ہوں۔ میں جب بھی نماز کے لیے بلاوے کی پکار یعنی اذان سنتی ہوں تو میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ جب میں اپنی سابقہ زندگی پر غور کرتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میں ہمیشہ سے دل سے مسلمان ہی تھی، لیکن اس سے پہلے مجھے اس کا پتہ نہیں تھا۔ اپنی بہن کے ہاتھوں اس افسوسناک صدمے کے باوجود میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اس کی زندگی پرسکون اس لیے نہیں ہے کہ اس کا ایمان سچا نہیں تھا۔ میں نے اپنی بہن کی محبت اور اس کی ہمدردی پر بھروسہ کیا تھا لیکن خدا نے مجھے سکھایا ہے کہ انسان کو کسی انسان پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے احساس ہے کہ خدا مجھے پاکستان اس لیے لایا ہے کہ میں اپنی بہن سے منہ موڑ کر صرف اسی کی ہو جاؤں۔"

مارلینا آسٹریلیا جا چکی ہے۔ شاید میں اس سے دوبارہ نہ مل پاؤں اللہ اس پر رحم کرے اور اس کی مدد کرے۔

میرے اردو کے سابق استاد اب بھی آتے ہیں لیکن مجھے نہیں، فرحت کو پڑھانے کے لیے۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ مجھے نہیں پڑھا سکتے۔ وہ بہت مہربان، دیانتدار، مخلص اور باصبر انسان ہیں۔ ان میں وہ سب صفات ہیں جو ایک اچھے استاد میں ہونی چاہئیں۔ کبھی کبھی میں انہیں گھر کے صحن میں پتھر کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھے، تیل نکالنے کے لیے، کھرل میں پتھر کے دستے سے بیج کوٹتے دیکھتی ہوں جبکہ درجہ حرارت صفر کے قریب ہوتا ہے وہ ننگے پاؤں ہوتے ہیں اور انتہائی بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس۔ صبح سویرے چھ بجے ان کی دو چھوٹی بیٹیاں ہمارے گھر آتی ہیں اور ہم انہیں لسی کی ایک بالٹی دیتے ہیں۔ چھوٹی والی کی آنکھ میں ککرے ہیں۔ ان کا لباس بڑا بوسیدہ ہوتا ہے۔ عبدالغنی اپنے بھائی کی طرح نہیں ہیں جو عورتوں کا روپ بھر کر روزی کمانے کے لیے ہندوؤں کے رقص کرتا پھرتا ہے۔ عبدالغنی کو خود پر فخر ہے اور وہ دیانتدارانہ طریقے سے اپنے بڑے خاندان کے لیے روزی کماتے ہیں۔ چاہے وہ کتنی ہی تھوڑی

Marfat.com

ہو۔ ان کے گھر والے بھی کبھی شکوہ شکایت کرتے نہیں دیکھے گئے۔ وہ کبھی کوئی چیز نہیں مانگتے۔

ہمارا گھرانہ ایک صحیح مسلمان گھرانہ ہے۔ ہم کئی غریب لوگوں کو کھانا دیتے ہیں اور ان کا خیال رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک بڑی شفیق بوڑھی خاتون ہے جس کے چہرے پر جھریاں ہیں، اس کے دانت بھی نہیں ہیں۔ وہ محمد انور کی بوڑھی والدہ کی سہیلی ہے۔ وہ اکثر یہاں کھانا کھاتی ہے اور اماں کے ساتھ ہی سو جاتی ہے۔ اس کے شوہر کا برسوں پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ اس کے دس بچے تھے لیکن صرف ایک ہی زندہ بچا۔ وہ شریف آدمی ہے اور بساط بھر اپنی والدہ کی خدمت کرتا ہے۔ اس کے اپنے چار بچے ہیں۔ پھر ایک گونگی لڑکی ہے جو آپا کی سہیلی ہے۔ جب آپا کی طبیعت خراب ہو تو کھانے پکانے اور گھر کی صفائی کے لیے وہی آتی ہے۔ اس کی عمر پندرہ سال ہے۔ بالکل بول نہیں سکتی۔ وہ آپا کے بستر پر بیٹھ کر گھنٹوں ان کے پیر دباتی رہتی ہے۔ اس کے چھ بھائی بہن ہیں لیکن صرف ایک بھائی اس کی طرح گونگا ہے۔ اس کے والدین بالکل نارمل ہیں۔ ایک اور بدقسمت انسان ہے جس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہے لیکن اس کی ذہنی سطح آٹھ سال کے بچے کی سی ہے۔ اس کا دماغ اتنا کمزور ہے کہ وہ معمولی چھوٹے موٹے کام بھی نہیں کر سکتا لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ پانچوں نمازیں بڑی باقاعدگی سے ادا کرتا ہے۔ اگرچہ اس کے پاؤں مڑے ہوئے ہیں اور وہ بآسانی چل بھی نہیں سکتا لیکن وہ روزانہ گرتا پڑتا یہاں پہنچ جاتا ہے۔ کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ اسے گرم گرم چپاتیاں اور سالن کھانے کو ملے گا۔

ماشکی کی بیویاں بھی اکثر ہم سے ملنے آجاتی ہیں۔ روزانہ صبح گیارہ بجے ماشکی بکرے کے کھال سے بنی ہوئی ایک بڑی مشک اپنی پیٹھ پر اٹھائے آتا ہے اور ہمارے مٹکے اور گھڑے تازہ میٹھے پانی سے بھر جاتا ہے۔ اس کے آنے پر گھر کی سب عورتیں گھر کے پیچھے چلی جاتی ہیں اور پردے کے تقاضوں کے مطابق اپنے چہرے چھپا لیتی ہیں لیکن پھر بھی میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ وہ منحنی سا انسان ہے اور چیتھڑوں

Marfat.com

میں ملبوس ہوتا ہے۔ اس کی آمدنی اتنی کم ہے کہ حیرت ہوتی ہے، اس کے گھر والوں کا گزارہ کیسے ہوتا ہے۔ کیا وہ ہوا پھانک کر زندہ ہیں؟ وہ آتی ہیں تو گھر والوں کے ساتھ ہنسی خوشی باتیں کرتی ہیں۔ ان کے بچے ان کی گود میں ہوتے ہیں۔ بڑے بچے ملیریا کے بخار میں مبتلا ہیں اور روتے رہتے ہیں۔ اپنے سابقہ استاد کی طرح انہیں بھی کبھی غربت کی شکایت کرتے نہیں دیکھا گیا۔ وہ صبر سے اسے جھیلتی ہیں اور کبھی کسی سے بھیک مانگنے کا تصور بھی نہیں کرتیں۔

محمد انور کا قریبی دوست بڑا ہنس مکھ آدمی ہے۔ اس کی دو خوش مزاج بیویاں ہیں۔ ان کا گھر کافی بڑا اور خوبصورت ہے۔ ان کے ہاں ایک خوبصورت ڈبل بیڈ ہے۔ یہ آدمی بستر کے درمیان سوتا ہے اور اس کی بیویاں دائیں بائیں سوتی ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا اس کی بیویاں ایک دوسری سے حسد کرتی ہیں؟" تو اس نے جواب دیا، "ہرگز نہیں۔" یہ بڑا پرسکون گھرانہ ہے، ہر شخص خوش ہے۔ ان سرد راتوں میں ایک دوسرے سے لپٹ کر سوتے ہیں اور گرم رہتے ہیں۔

محمد انور کا برادر نسبتی اسلم جو مشتاق بیگم کا شوہر ہے، آج کل گھر آیا ہوا ہے۔ وہ پاکستان کی بحری فوج میں ملازم ہے اور بحری جہازوں پر اس نے پوری دنیا دیکھی ہوئی ہے۔ وہ دو مرتبہ انگلینڈ جا چکا ہے لیکن اسے امریکہ جانے کا موقع نہیں ملا۔ وہ تین مہینوں کی چھٹی پر آیا ہوا ہے اور اب وہ مشتاق بیگم کے ساتھ یہیں رہے گا۔ چونکہ اس نے دنیا دیکھی ہوئی ہے اور انگریزی بھی صاف بولتا ہے اس لیے وہ خاندان کے باقی لوگوں کے مقابلے میں شہری لگتا ہے۔ وہ دانشورانہ انداز میں فلسفیانہ موضوعات پر مجھ سے انگریزی میں بات کرتا ہے۔ کل وہ محمد انور اور گھر کی خواتین کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور ہم اس موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ مغربی دنیا کے لوگ ایک سے زیادہ شادی کو کیوں معاشرتی برائی سمجھتے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ مغربی لوگ ایک سے زیادہ شادیوں سے خوفزدہ کیوں ہیں؟

جب ہم اس موضوع پر بحث کر رہے تھے تو جواب اچانک خود بخود سامنے آ گیا۔

Marfat.com

جواب یہ ہے کہ مغرب میں انفرادی آزادی کی بات کی جاتی ہے اور یہ انفرادیت اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ انا پسندی تک پہنچ گئی ہے جو اسلام تو کیا، کسی بھی روایتی، صحیح العقیدہ تہذیب میں قابل قبول نہیں ہے۔ مغرب میں شادی کا جدید تصور یہ ہے کہ بیوی کو شوہر کے مساوی درجہ حاصل ہے۔ وہ اپنا یہ حق جتاتی ہے کہ اسے اپنی مرضی کرنے کا اختیار حاصل ہے اور اپنی انفرادی آزادی کے ایک شمہ سے بھی دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔ اس کی زندگی کا مقصد ذاتی خوشی اور عیاشی ہے، چاہے اس سے معاشرے کا نظام درہم برہم ہوتا ہو۔ مغرب کی ساری تہذیب، قدیم یونانی تہذیب سے اب تک، اسی تصور پر قائم ہے کہ ایک فرد اپنی ذات میں ایک مکمل اکائی ہے اور اسے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو نمایاں کرنے کا ہر حق اور اظہار رائے کی ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ کچھ ذہین ترین لوگوں کی آرٹ اور سائنس میں کامیابیوں کی بنا پر ایک مغربی شخص اپنی تہذیب کو دوسری تمام تہذیبوں سے برتر سمجھتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے۔ "تمہارے پاس کوئی لیونارڈو دا ونسی ہے؟ کوئی میکیا لینگلوس، کوئی شیکسپیئر، بیتھوونز، ریمبرانت یا وردیس؟"۔

آرٹ اور سائنس کے میدانوں میں ہمارے بھی جواہر قابل گزرے ہیں جیسے امیر خسرو (1253-1324ء) اور میاں تان سین (1506-1585ء) جو موسیقی کے نابغہ عصر تھے اور ان جیسی نظیر آج تک کہیں نہیں ملی۔ ترکی کا سنان (1489-1578ء) زبردست ماہر تھا۔ اس جیسا ماہر آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اسلامی آرٹ کے زبردست اور حسین ترین نمونے گمنام لوگوں کی تخلیق تھے۔ وہ کسی فرد کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار نہیں تھے بلکہ اسلامی تہذیب کے روحانی ورثے کا اظہار تھے جن میں بہت سے لوگوں نے رضامندی سے گمنام رہ کر اپنے فرائض انجام دیے۔

ایک مسلم معاشرے میں کوئی فرد محض اپنی ذات کے لیے زندہ نہیں رہتا بلکہ اس کی خدمات، اطاعت اور ذاتی ایثار اس آفاقی قانون کے ماتحت ہوتی ہے جو قرآن اور سنت سے ماخوذ ہے اور یہی اس کی زندگی کا اعلیٰ وارفع مقصد ہوتا ہے۔

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں، میں اسی لیے نمازی

Marfat.com

اسلام میں ہر فرد کا انتہائی احترام کیا جاتا ہے، اسے بے حد وقعت دی جاتی ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں اور قابلیتیں اس کے احترام میں اضافہ کرتی ہیں لیکن وہ مقصد جس کے لیے وہ زندہ رہتا ہے اور مرتا ہے، اس کی ذات سے کہیں بلند و بالا ہے۔ یقیناً ہر شخص قابل قدر ہے اور اسلام میں ہر جان قیمتی ہے لیکن کسی فرد کو محض اپنی ذات کے خول میں بند رہنے کی اجازت نہیں۔ شادی کے بارے میں اسلام کا تصور یہ ہے کہ شوہر مالیات فراہم کرنے کا ذمہ دار ہے اور بلا متنازعہ گھر کا حاکم ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جابر بن جائے۔ بیوی کو اپنی بات کہنے کا حق حاصل ہے۔ اس کی اپنی اہمیت اور وقعت ہے۔ اس تصور کا مطلب یہ ہے کہ گھریلو معاملات میں مرد کی رائے حتمی ہے۔ اسلام میں بیوی مرد کی تکمیل ہے، وہ اپنی ذات میں الگ تھلگ وجود نہیں ہے۔ وہ اپنے شوہر اور بچوں کے فلاح و بہبود کے لیے جیتی ہے اور اس سے اپنے جذبات کی تسکین کرتی ہے۔ اس لیے مسلمان کو اس میں کوئی حرج نظر نہیں آتا کہ ایک عورت باقی تین کے ساتھ مل کر ایک پرسکون گھر کی خوشیوں میں اپنا حصہ وصول کرے۔ ایک عورت کا دوسری عورتوں کے ساتھ، مرد کی محبت میں اشتراک کا تصور ہی مغربی ذہن کے لیے انتہائی ہولناک ہے اور اس کی وجہ مغربی ثقافت میں فرد کی فضیلت ہے۔

کل صبح میں گہری نیند سے اس وقت بڑبڑا کر اٹھی جب میاں مٹھو نے خوفزدہ آواز میں چلانا شروع کر دیا۔ میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ایک موٹا تازہ چوہا میری لائبریری میں بھاگا پھر رہا ہے۔ وہ میری حدیث کی چار جلدوں کے اوپر چڑھ گیا۔ میری چیخ پکار پر بھائی جان ایک بڑا ڈنڈا ہاتھ میں اٹھائے بھاگے بھاگے آئے اور چوہے کو مار بھگایا۔ مجھے امید ہے کہ وہ دوبارہ میری ملاقات کے لیے تشریف نہیں لائے گا۔

جب بستروں میں کھٹمل راہ پالیں تو چارپائیوں کو چھت پر لے جا کر لاٹھیوں سے خوب جھاڑا جاتا ہے اور بستروں کو کئی دنوں تک جھلستی دھوپ میں کھلا چھوڑا جاتا ہے یہاں تک کہ بن بلائے مہمان رخصت ہو جاتے ہیں۔

اس حقیقت کے باوجود کہ ہم روزانہ نہاتے ہیں اور بار بار کپڑے تبدیل کرتے

Marfat.com

ہیں، ہم عورتوں کو جوؤں کے خلاف مسلسل جنگ کرنا پڑتی ہے، جو غریب ہو یا امیر، ہر شخص کے سر میں گھر بنا لیتی ہیں۔ محض سر دھونے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ وہ بچے جو سکول کی پرہجوم کلاسوں میں ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھتے ہیں، سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ عورتیں دھوپ میں بیٹھ کر ایک دوسرے کے بالوں میں باریک کنگھیاں پھیرتی ہیں جو لکڑی کی بنی ہوتی ہیں۔ زیادہ جدید خواتین پلاسٹک کی باریک کنگھیاں استعمال کرتی ہیں جن کا نقصان زیادہ ہے، کیوں کہ ان کے دندانے جلد ٹوٹ جاتے ہیں۔ آپا کپڑے دھونے کے عام صابن سے فرحت کا سر دھوتی ہیں۔ پھر ڈھیر سارا مٹی کا تیل سر میں ڈال کر اس کے بالوں میں کنگھی کرتی ہیں۔ پھر اسے ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ سٹور یا چولھے کے قریب نہ جائے۔ ہمارے ملازم بتاتے ہیں کہ مہندی یا حنا جوؤں کا بہت موثر علاج ہے۔

لارچمونٹ میں ہماری قریبی ہمسائی بیٹی ایلن کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اسے پڑھ کر بہت تعجب ہوا۔ مجھے یاد ہے کئی سال پہلے ہم اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ جب وہ دو سال کی تھی تو میں پانچ سال کی تھی۔ ہم آپ کا طبی امداد کا بکس چرا کر ایک دوسرے کی پٹیاں کیا کرتے تھے۔ مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب بیٹی پانچ سال کی ہوئی تو اس کی والدہ مسز ایلن اسے اکیلے سکول بھیجنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ سو ہر صبح میں ان کے گھر جا کر گھنٹی بجاتی تھی۔ مجھے یاد ہے بیٹی کی والدہ اسے سخت ڈانٹ ڈپٹ کرتی تھیں کیونکہ وہ ناشتہ کرنے میں اتنی دیر لگا دیتی تھی کہ میں سکول کے لیے لیٹ ہو جاتی تھی اور مجھے استانیوں سے ڈانٹ کھانی پڑتی تھی۔ میں نے کبھی بیٹی کو الزام نہیں دیا بلکہ صبر سے اس کا انتظار کرتی تھی اور وہ دلیے اور ابلے ہوئے انڈے کا ہلکا سا ناشتہ کرنے میں بھی آدھ گھنٹہ لگا دیتی تھی۔ پھر میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سکول لے جاتی تھی جو آدھ میل دور تھا۔ پورے سال تک ہر صبح یہی معمول رہا۔ اف! اس کے بڑے ہونے پر حالات کیسے بدل گئے! کیا بیٹی ایلن آج مجھے پہچان لے گی؟

تمام تر محبتیں

مریم

Marfat.com

پتوکی سے بارھواں خط

مریم جمیلہ
معرفت حکیم رائے نعمت علی خان
صدر طبیہ ایسوسی ایشن
مین بازار پتوکی، ضلع قصور، پاکستان
12 مارچ 1963ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکرز، اپارٹمنٹ نمبر 223-C
لارچمونٹ، نیویارک، یو۔ ایس۔ اے

پیاری ترین امی اور ابو!

گرچہ آپ کے سارے خط مجھے بغیر کسی مشکل کے مل جاتے ہیں لیکن فضائی ڈاک کے لحاظ سے ان میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کو میرے خط وقت سے نہیں ملتے تو آئندہ میں انہیں بذریعہ رجسٹری ڈاک بھیجا کروں گی، جب تک ڈاک کی خدمات بہتر نہ ہو جائیں۔

محمد انور کے گھر سے تازہ خبر بڑی افسوس ناک ہے۔ اماں دوبارہ بیمار پڑ گئی تھیں اور ان کی طبیعت سخت خراب تھی۔ انور کے بڑے بھائی سرور نے اصرار کیا کہ کسی اچھے یونانی حکیم سے مشورے اور علاج کے لیے اماں کو فوراً کراچی بھیجا جائے۔ عین انہی دنوں اسلم اور اشرف جو پاکستان رائل نیوی سے سالانہ تین مہینوں کی چھٹی پر آئے ہوئے تھے، ڈیوٹی پر طلب کر لیے گئے۔ چنانچہ عید کے فوراً بعد اماں، اسلم، ان کی بیوی

Marfat.com

مشتاق بیگم، اشرف اور ان کی اہلیہ انور بی بی، پتوکی سے بذریعہ ریل کراچی روانہ ہوگئے۔ وہ تیسرے درجے کے ڈبے میں، جسے ہم انٹر کلاس کہتے ہیں، گئے ہیں۔ ان کی روانگی کے بعد میں اور آپا گھر واپس آگئیں۔ آپا بہت اداس اور فکر مند تھیں۔ اگرچہ ہم خوشحال لوگ ہیں لیکن تھرڈ کلاس کے علاوہ کسی اور درجے میں سفر کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اول درجے میں صرف غیر ملکی لوگ سفر کرتے ہیں۔ اشرف اور اسلم جیسے جوان اور توانا آدمیوں کو تو تیسرے درجے میں سفر کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن مجھے اماں کے بارے میں تشویش تھی جن کی عمر ستر سال تھی اور ان کی حالت سخت نازک تھی۔ اس مصیبت میں انہیں پورا دن اور پوری رات سفر کرنا تھا۔ آپا نے مجھے کہا کہ فکر کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ عید کا رش ختم ہو چکا ہے اور ڈبوں میں زیادہ ہجوم نہیں ہوگا۔ محمد سرور چاہتے ہیں کہ اماں جون تک کراچی ہی ٹھہری رہیں۔ اس کے بعد وہ، ام کلثوم اور ان کے بیٹے بیٹیاں خاندان سے ملاقات کے لیے پتوکی آئیں گے۔ آپا کے اداس چہرے اور جھکی ہوئی نظروں نے مجھے فکر میں مبتلا کر دیا۔ انہوں نے جب میری طرف دیکھا تو اگرچہ ہم نے بات نہیں کی، لیکن انہیں معلوم تھا کہ ہم دونوں ایک ہی ڈگر پر سوچ رہی تھیں۔

میں نے ڈرتے ہوئے پوچھا، "کیا ہم اماں کو دوبارہ دیکھ سکیں گے؟ اگر کراچی میں ان کا انتقال ہوگیا تو؟"

آپا نے بڑے سکون سے جواب دیا "کوئی شخص اللہ تعالی کی مرضی کے بغیر نہیں مر سکتا۔ ان شاء اللہ اماں تین مہینوں میں واپس آجائیں گی۔"

اپنے پچھلے خطوں میں آپ نے پوچھا تھا کہ جب آپ پاکستان آئیں گے تو ہم آپ کو ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے کن دلچسپ لوگوں سے متعارف کروا سکیں گے تاکہ آپ کا آنا مفید ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ ہندوؤں کے معاملے میں، میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گی۔ کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں کسی ہندو کو نہیں جانتی، دوسرے یہ کہ تقسیم کے وقت بھارت میں جو کچھ ہوا، اس کی وجہ سے مسلمان ہندوؤں کے لیے

Marfat.com

مریم جمیلہ کا پتوکی میں اپنایا گیا گھرانہ

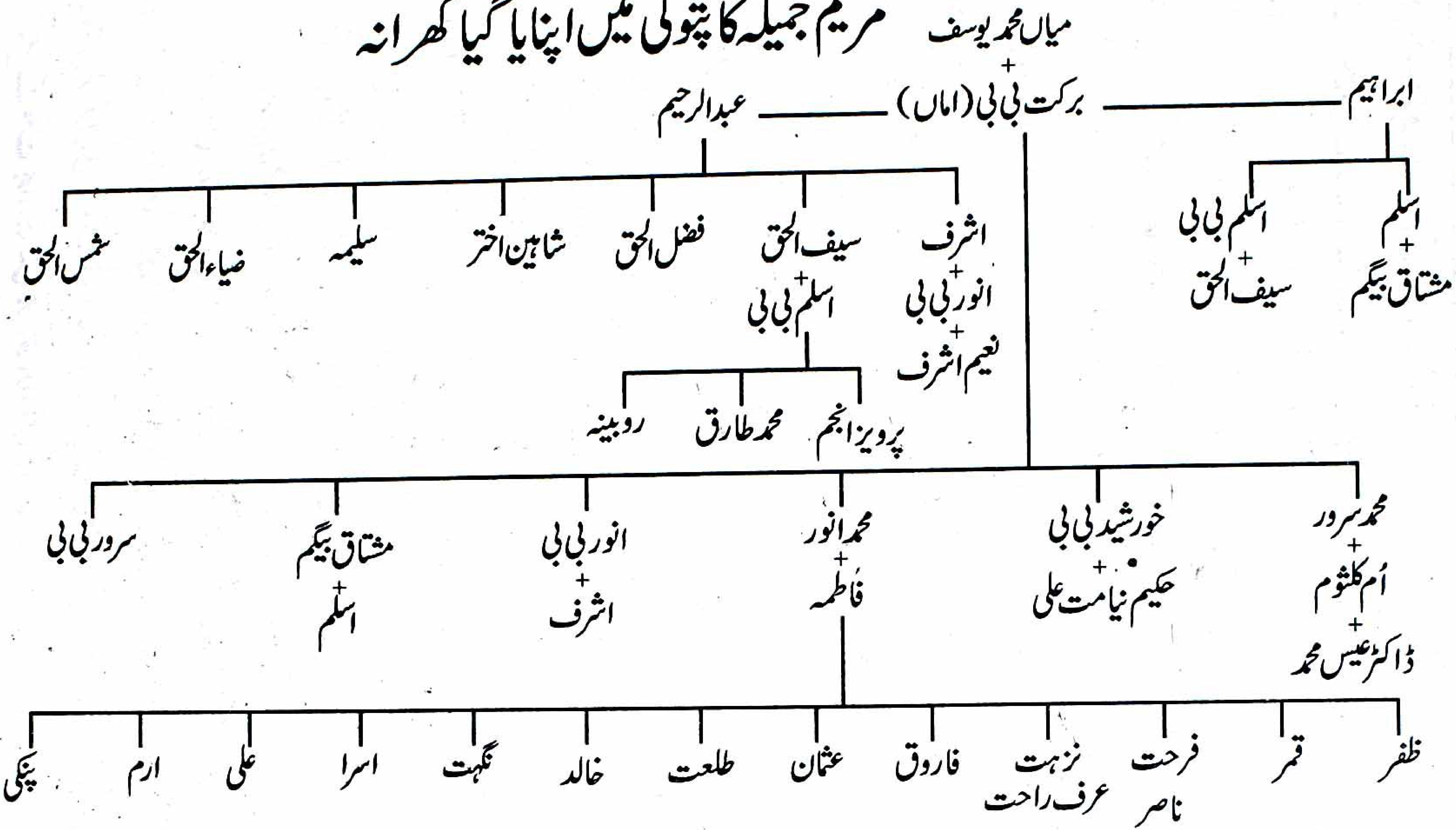

دوستانہ جذبات نہیں رکھتے۔

میں جن لوگوں کو سب سے پہلے متعارف کرواسکتی ہوں، وہ اپنے خاندان ہی کے لوگ ہیں جو باہم مربوط ہیں۔ پہلے آپا کی فیملی کو لیتے ہیں۔ ہماری محبوب اماں ہیں جن کی عمر ستر سال سے زائد ہے۔ وہ کئی سال پہلے بیوہ ہوگئی تھیں۔ ان کا اصلی نام برکت بی بی ہے۔ ان کا سب سے بڑا بیٹا محمد سرور ہے جن کی عمر چالیس سال ہے۔ وہ مکہ جا کر حج کر چکے ہیں۔ وہ پاک فضائیہ میں جہازوں کے میکینک ہیں۔ ان کی تنخواہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ ان کا کام ان جہازوں کی دیکھ بھال ہے جو کسی فنی خرابی کے باعث گراؤنڈ کر دیے جائیں۔ اگرچہ ان کے کئی بچے ہیں لیکن میں صرف ان کی بڑی بیٹی ام کلثوم سے واقف ہوں۔ ان کا گھر کراچی میں ہے۔ آپا جن کا اصلی نام خورشید بی بی ہے، ان کی دوسری بیٹی ہیں۔ وہ عمر کی تیسری دہائی کے وسط میں ہیں۔ خود بے اولاد ہیں لیکن ام کلثوم کو انہوں نے ہی پالا ہے اور اب وہ فرحت کی پرورش کر رہی ہیں۔ ان کے بعد محمد انور ہیں جن کی عمر تینتیس سال ہے۔ محمد انور کی بیوی کا نام فاطمہ ہے۔ وہ میری ہم عمر ہے لیکن ان کی شادی کو دس سال ہو گئے ہیں اور ان کے چھ بچے ہیں۔ نو سالہ ظفر ان کا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ میں اس سے نہیں ملی کیونکہ وہ کراچی کے کسی رہائشی سکول میں زیر تعلیم ہے اور وہیں رہتا ہے۔ دوسرا بیٹا قمر ہے۔ اس کی عمر سات سال ہے۔ رنگ زرد ہے اور چوہے جیسا دکھائی دیتا ہے۔ وہ بیمار لگتا ہے۔ کبھی کبھی اسے ملیریا کا بخار ہو جاتا ہے۔ اس کا پورا نام قمرالاسلام ہے۔ اس کے خد و خال اور رنگت یورپی بچوں سے ملتی ہے۔ مقامی مسجد کے امام صاحب کی زیر نگرانی اس نے حال ہی میں ناظرہ قرآن مکمل کیا ہے۔ وہ ذہین لڑکا ہے، انتہائی کم گو۔ اپنے ہم عمر بچوں کے برعکس اس کے طور اطوار بہت اچھے ہیں۔ اس کے بعد پانچ سالہ فرحت ہے جس کے بال سنہرے اور آنکھیں بھوری ہیں اور اس لحاظ سے وہ قمر سے مشابہت رکھتی ہے لیکن یہ زیادہ خوبصورت ہے اور جوان ہو کر اور زیادہ خوبصورت ہو جائے گی۔ اس کی پرورش کی ساری ذمہ داری آپا پر ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ہی کھاتی ہے اور ہمارے ساتھ ہی سوتی ہے۔ اس کے بعد

Marfat.com

ساڑھے تین سال کی بے بی نزہت ہے۔ گول مٹول، چمکدار آنکھوں والی اس کے گال گلابی اور بال بھورے ہیں۔ اس کے بعد دو سالہ فاروق ہے۔ اس کا رنگ گورا ہے اور وہ بھی یورپی بچوں کی طرح لگتا ہے۔ گرمیوں میں بس وہ ایک قمیص پہنے ننگے پاؤں پورے گھر میں دوڑتا پھرتا ہے۔ سب سے آخر میں دس مہینے کا عثمان ہے جو اپنی ماں پر گیا ہے، باپ کی کوئی مشابہت اس میں نہیں ہے۔ وہ صحیح معنوں میں پاکستانی بچہ ہے۔ اتنا حسین اور پیارا ہے کہ آپ تصور نہیں کر سکتے۔ یہ بڑی بڑی چمکدار، کوئلے جیسی سیاہ آنکھیں۔ اس کی جلد کی رنگت گندمی ہے۔ ایسا خوبصورت معصوم چہرہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس نے چار دانت نکال لیے ہیں لیکن اس کا دودھ ابھی تک نہیں چھڑایا گیا۔ فاطمہ اسے اپنا دودھ پلاتی ہے۔ وہ موٹا تازہ اور صحت مند ہے اور عنقریب چلنے لگے گا۔ اپنے پاؤں پر کھڑا تو ہونے لگا ہے۔ میں نے ایک دن فاطمہ سے کہا کہ اگر کبھی میرے بچے ہوئے تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گی کہ وہ بالکل عثمان جیسے ہوں۔

اماں کے بچوں میں پھر انور بی بی کی باری آتی ہے جو میری ہم عمر ہے۔ اس کی شادی اشرف سے ہوئی ہے جن کی عمر اکتیس سال ہے۔ وہ رائل پاکستان نیوی میں انجنوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ وہ چوڑے ڈیل ڈول کے ہنس مکھ انسان ہیں۔ اپنی چھٹی کے دو مہینوں کے دوران میں میری اردو بہتر بنانے میں انہوں نے بڑی مدد کی۔ اب جب کہ وہ سمندر میں اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے ہیں، مجھے بہت یاد آتے ہیں۔ انور بی بی بھی انہیں یقیناً یاد کرتی ہوں گی کیونکہ وہ سال کے نو مہینے گھر سے دور رہتے ہیں۔ ان کا ایک ہی بیٹا ہے، دو سالہ نعیم اشرف، جو کسی چھوٹے بندر کی طرح شرارتی اور چلبلا ہے۔ تمام چھوٹے بندروں کی طرح نعیم اشرف کو بھی کپڑے پہننے پسند نہیں اور بغیر کپڑوں کے ہی بھاگ دوڑ میں مصروف رہتا ہے، خاص طور پر گرمیوں کے دنوں میں۔

سب سے چھوٹی بیٹی مشتاق بیگم ہے جس کی عمر پچیس سال ہے۔ اپنے لمبے سرخ بالوں، گوری چٹی رنگت، سیاہ آنکھوں اور کسی مجسمے کے سے حسن کی وجہ سے وہ پورے خاندان کی حسین ترین خاتون ہے۔ پورے گھر بھر میں وہ واحد لڑکی ہے جو ساڑھی پہنتی

Marfat.com

ہے۔ آپا اسے ہندوؤں کا لباس سمجھ کر نا پسند کرتی ہیں۔ وہ ہے تو بڑی حسین لیکن بدقسمتی سے آپا کی طرح بے اولاد ہے۔ اگر مشتاق امریکہ میں ہوتی تو کوئی یقین نہ کرتا کہ وہ پاکستانی ہے۔ دیکھنے میں وہ مجھ سے بھی زیادہ مغربی لگتی ہے لیکن نظریں اکثر دھوکہ کھا جاتی ہیں۔ ایک دن محمد انور کے گھر میں ہم پیڑھیوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ میں نے اس سے ایک چمچ مانگا۔ بجائے چمچ دینے کے، اس نے میرے ہاتھ میں چپاتی کا ایک ٹکڑا تھما دیا اور کہا کہ بچی ہوئی دال میں روٹی سے کھاؤں۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا اور کہا، "تمہیں ایک مسلمان کی طرح کھانا کھانا چاہیے۔" اثبات میں سر ہلانے پر اس نے کہا، "چمچوں کا استعمال سنت نہیں ہے۔ تمہیں پتہ نہیں کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ہاتھ سے کھانا کھایا کرتے تھے۔"

مشتاق کے شوہر کا نام اسلم ہے جس کا کہنا ہے کہ اس کی عمر بتیس سال کے قریب ہوگی۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اسے اپنی عمر کے بارے میں صحیح پتہ نہیں۔ اس کی والدہ کو اس کی صحیح تاریخ پیدائش پتہ تھی لیکن ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ اسلم نے بتایا کہ پاکستانی لوگوں میں سالگرہ منانے کا کوئی رواج نہیں کیونکہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہم صرف دو آدمیوں کی سالگرہ مناتے ہیں۔ قائداعظم (1948-1876ء) کی جو کرسمس کے دن ہوتی ہے اور اپنے قومی شاعر علامہ اقبال (1938-1877ء) کی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے دن مسلمانوں کے ہاں عام تعطیل نہیں ہوتی۔ یہ سنت بھی نہیں ہے۔ ہمارے پیغمبر نے کبھی اپنے صحابہ سے یہ نہیں کہا کہ وہ ان کا یوم ولادت منائیں۔ میلاد النبی کی یہ لمبی چوڑی تقریبات ہمارے زوال کے عہد میں شروع ہوئیں۔

اسلم کا رنگ سانولا ہے لیکن ہے خوبصورت۔ قد کاٹھ میں چھوٹا ہے لیکن مضبوط اور توانا۔ اپنی بیوی کے برعکس اسے پاکستانی کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھا جا سکتا۔ اشرف کی طرح وہ بھی پاکستان نیوی میں ملازم ہے اور سال کا زیادہ حصہ سمندر میں گزارتا ہے۔ اسلم اور اشرف نے دنیا کے اکثر ملکوں کا سفر کیا ہوا ہے۔ اشرف ہنس مکھ اور خوش

Marfat.com

باش ہے جبکہ اسلم سنجیدہ ہے اور اپنے بھانجوں بھتیجوں سے کھیلنے کے وقت کے علاوہ اسے شاذ ہی ہنستے دیکھا گیا ہے۔ اپنی بیوی مشتاق کے بعد اس کی پہلی محبت اس کا چھوٹا بھتیجا عثمان ہے۔ وہ عثمان سے کھیلتا نہیں تھکتا اور اپنی تین مہینوں کی چھٹیوں کے پورے عرصے میں وہ اسے گود میں اٹھائے پھرتا تھا۔ جب وہ کام میں جتی ہوئی اپنی ماں کے ساتھ ہوتا ہے تو دن میں پچاس بار روتا ہوگا لیکن اپنے انکل اسلم کے ساتھ ہو تو کبھی نہیں روتا۔ وہ دونوں اکٹھے خوش رہتے ہیں۔ اسلم کی روانگی سے ذرا پہلے میں نے فاطمہ سے کہا،"عثمان کا خیال رکھنا۔ انکل اسلم اسے چرا کر نہ لے جائیں۔"

جب میں محمد انور کے گھر رہ رہی تھی تو ایک دن میں نے بڑی سنجیدگی سے اسلم سے کہا،"تم اور مشتاق بیگم بچوں سے اتنا پیار کرتے ہو! تمہارے اپنے ہاں ایک درجن بچے پیدا ہونے چاہئیں تھے۔"

اسلم نے بڑی سادگی سے جواب دیا،"اللہ کی مرضی ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں کہ اللہ کی رضا کی مصلحتوں کو جان سکیں۔"

اسلم کے والد ابراہیم اسم با مسمّٰی ہیں۔ وہ اماں کے بڑے بھائی ہیں۔ ان کی عمر چوراسی برس کے قریب ہوگی لیکن اماں کے برعکس ان کی صحت ٹھیک ہے۔ وہ پتوکی کے بزرگوں میں شامل ہیں اور ہمارے خاندان کے سرپرست اعلیٰ۔ اپنی شخصیت کے اعتبار سے وہ پوری طرح اس کے اہل بھی ہیں۔ ان کا قد چھوٹا، جسم دبلا پتلا اور لمبی سفید ڈاڑھی ہے۔ سفید پگڑی اور سفید کپڑے پہنتے ہیں۔ ہاتھ میں لاٹھی ہوتی ہے۔ وہ متانت و وقار کا مجسمہ ہیں۔ مجھے وہ منظر بڑا اثر انگیز لگتا ہے جب وہ کسی چھوٹے بچے کی انگلی تھامے اسے ساتھ لے جا رہے ہوں۔ اماں کے چھوٹے بھائی عبدالرحیم (نہایت مہربان، اللہ کا غلام) کی عمر ساٹھ سال کے قریب ہے۔ وہ بھی راسخ العقیدہ آدمی ہیں لیکن ان کی شخصیت مختلف ہے۔ وہ طویل قامت ہیں لیکن قدرے خمیدہ۔ لمبی کھچڑی داڑھی ہے۔ وہ ہمیشہ دھوتی اور پگڑی پہنتے ہیں۔ وہ کافی خوش باش ہیں اور کبھی کبھار فلک شگاف قہقہے لگاتے ہیں۔ میں جب سے یہاں آئی ہوں، میں نے کبھی انہیں بیمار نہیں دیکھا۔ اپنے

Marfat.com

ہشاش بشاش مزاج کے باوجود وہ خاندان میں سخت نظم و ضبط نافذ رکھتے ہیں۔ بچوں کے برا ماننے کی انہیں کوئی فکر نہیں ہوتی۔ کہنا نہ ماننے پر فوراً ڈنڈوں سے پٹائی کی جاتی ہے۔ یہاں پتوکی میں باپ کی بچوں بلکہ بھتیجوں تک کی پٹائی کو درست سمجھا جاتا ہے۔ اسلم کا کہنا ہے کہ اس نے بچپن ہی میں سیکھ لیا تھا کہ جھوٹ نہیں بولنا، چوری نہیں کرنی، نمازوں میں سستی نہیں کرنی اور بڑوں کی حکم عدولی نہیں کرنی ورنہ انکل عبدالرحیم کی ڈانٹ کھانی پڑتی بلکہ پٹائی بھی سہنی پڑتی۔ جب میں نے مزید کریدا تو اسلم نے کہا کہ یہ سب کچھ درست اور اس کی بھلائی کے لیے تھا۔ عبدالرحیم کی بیوی کا نام چارہ بی بی ہے اور وہ پچاس کے پیٹے میں ہوں گی۔ وہ سیاہ لباس میں رہتی ہیں اور کسی یہودی خاندان کی گھر گرہستن کی طرح لگتی ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ وہ سورج طلوع ہونے سے پہلے، ہر صبح بلاناغہ قرآن کی تلاوت کرتی ہیں اور بڑی دلکش آواز میں۔ اشرف سب سے بڑا بیٹا ہے اور اس کے بعد صفاء الحق ہے جو میرا ہم عمر ہے اور اسلم کی بہن، اسلم بی بی سے بیاہا ہوا ہے۔ صفاء الحق اور اسلم بی بی کے تین بچے ہیں۔ چار سالہ پرویز انجم، دو سالہ محمد طارق اور چھ مہینے کی روبینہ۔ پچھلی گرمیوں میں طارق کی آنکھوں میں ککرے اتر آئے تھے۔ مکھیاں اس کی دکھتی آنکھوں پر بھنبھناتی تھیں۔ لیکن بھائی جان اور محمد انور نے اس کے علاج میں دیر نہیں کی۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔ روبینہ فیملی کی بے بی ہے۔ وہ اگست میں میرے پتوکی آنے کے فوراً بعد پیدا ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ کو اس کی پیدائش پر بہت مایوسی ہوئی تھی۔ کیونکہ ایک تو وہ لڑکے کی امید کر رہے تھے، دوسرے یہ کہ اس کا رنگ بہت سانولا ہے، اپنے دونوں بھائیوں سے بھی زیادہ۔

لیکن اب چھ ماہ کے بعد جب اس کے خد و خال نمایاں ہوئے ہیں تو لگتا ہے کہ وہ بڑی ہو کر اپنے لمبے سیاہ بالوں کے ساتھ بڑی خوبصورت لگے گی۔ فضل الحق کے، جس کی عمر انیس سال ہے، گھنگھریالے ہلکے بھورے بال ہیں، شربتی آنکھیں، ستواں ناک، موٹے ہونٹ اور گوری چٹی رنگت۔ اگر آپ اسے نیو یارک میں دیکھتے تو بروکلین کا کوئی یہودی سمجھتے۔ خاندان بھر میں وہ واحد شخص ہے جو بھائی جان کی سخت ناپسندیدگی کے

Marfat.com

باوجود پتوکی کے اکلوتے سینما گھر کی سرپرستی فرماتا رہتا ہے۔ مجھے بالکل خبر نہیں تھی کہ پتوکی میں کوئی سینما گھر بھی ہے، فضل الحق نے ہی مجھے اس کے بارے میں بتایا۔ پھر شاہین اختر ہے۔ اس کی عمر بیس سال سے زیادہ ہے لیکن ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی۔ پتوکی میں ایسا شاذ ہی ہوتا ہے۔ یہاں چھوٹی عمر میں شادیوں کا عام رواج ہے۔ شاہین ایک پرائمری سکول میں ٹیچر ہے اور اس نے مجھے اردو سکھانے میں بڑی مدد کی ہے۔ جب وہ اپنے کاموں سے فرصت پاتی ہے تو برقع پہن کر گھر کے کاموں میں اپنی والدہ کا ہاتھ بٹانے آجاتی ہے۔ وہ روزانہ گھنٹوں چرخے پر سوت کاتتی ہے جیسے مہاتما گاندھی اور ان کے چیلے آشرم میں سوت کاتتے تھے۔ بازار کی نسبت، یہ گھر میں بنایا ہوا دھاگہ زیادہ، مضبوط سستا اور پائیدار ہوتا ہے۔ اس کے سیاہ لمبے بال، چہرے کی نمایاں اٹھی ہوئی ہڈیوں اور تانبے جیسی جلد کو دیکھ کر کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ وہ امریکی انڈین تو نہیں! اس کے بعد سلیمہ ہے، اٹھارہ انیس برس کی۔ اس کی حس مزاح بڑی تیز ہے اور اس کی صحبت میں انسان خوش رہتا ہے۔ پھر چودہ سالہ ضیاء الحق ہے جو بارہ سال سے بڑا نہیں لگتا۔ اس کی آواز اتنی سریلی ہے کہ زندگی میں اس کے جیسی آواز نہیں سنی۔ وہ اگر مغرب میں ہوتا تو یقیناً کسی کلب میں گلوکار بنتا۔ لیکن اسلام میں گلوکاری کو پیشے کے طور پر اپنانا منع ہے اور موسیقاروں کو بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ ہاں وہ بڑا ہو کر بہت اچھا مؤذن بن سکتا ہے۔ وہ مسجدوں کے کئی اماموں سے بہتر ترتیل سے پڑھتا ہے۔ سب سے چھوٹا شمس الحق، گیارہ سال کا ہے اور کسی یورپی کی طرح گورا ہے، اس کا بھائی ضیاء الحق سانولا ہے اور مشرق کا باشندہ ہی لگتا ہے۔ شمس الحق کے بال سنہرے ہیں۔ بالوں کی مخصوص طرز، شربتی آنکھوں اور ناک پر جھائیوں کی وجہ سے بالکل امریکی لڑکا لگتا ہے لیکن جب وہ منہ کھولتا ہے تو۔۔۔۔۔ صرف اردو بول سکتا ہے۔ وہ اپنے ہم عمر لڑکوں کے مقابلے میں بہت اچھا ہے اور ہماری اچھی دوستی ہو گئی ہے۔

اشرف کے گھر میں بارہ مرغیاں بھی ہیں۔ ایک والد، ایک والدہ، دس چوزے۔ اشرف نے مرغیوں کا یہ جوڑا انگلینڈ سے منگوایا تھا کیونکہ اس کا خیال ہے کہ انگریز

Marfat.com

مرغیاں دیسی مرغیوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر انڈے دیتی ہیں۔ اب جبکہ چوزے بڑے ہوتے جا رہے ہیں تو روز بروز بدصورت اور کمینے ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر وقت شور مچاتے رہتے ہیں لیکن انگریزی کا ایک لفظ نہیں بولتے۔ سلیمہ کا طوطا جس بلی نے کھایا تھا، وہی بلی اشرف کو ایک دن گلی میں مل گئی۔ اس نے ایک سفید کبوتری اپنے جبڑوں میں دبائی ہوئی تھی۔ اشرف نے اس کا پیچھا کیا اور کبوتری اس سے چھڑوا کر گھر لے آیا۔ دوسرے دن وہ بازار گیا اور اس کا جوڑا بنانے کے لیے ایک خوبصورت کبوتر خرید لایا۔ پاکستانی کبوتر ان کبوتروں جیسے نہیں ہیں جو نیویارک شہر میں نظر آتے ہیں۔ یہ بڑے نازک پیارے اور معصومیت کی تصویر ہوتے ہیں، امن کی علامت فاختاؤں کی طرح سفید۔ اگلے دن بکری کا بچہ گھر سے بھاگ گیا اور عبدالرحیم اس کے پیچھے پیچھے پورے پتوکی میں بھاگتے پھرے۔ اور بڑی مشکل سے پکڑ کر گھر لائے۔ بکری کا یہ بچہ بہت خوبصورت ہے لیکن ایک آنکھ سے اندھا ہے۔ شاید یہ پیدائشی نقص ہے۔ عبدالرحیم کا ارادہ ہے کہ بکری کو اس سال عیدالاضحیٰ پر قربان کیا جائے بچہ اگلے سال کام آئے گا۔ اشرف کی اپنی ایک بھینس ہے جس کا دو مہینے کا ایک بچہ ہے۔

بھائی جان کا خاندان اتنا بڑا نہیں ہے جتنا آپا کا۔ ان کے سگے والدین فوت ہو چکے ہیں لیکن ان کی سوتیلی ماں زندہ ہیں۔ ان کی عمر ستر کے قریب ہوگی۔ زندہ دل خاتون ہیں، ہر وقت قہقہے لگاتی رہتی ہیں۔ بھائی جان کی اکلوتی سگی بہن نعمت بی بی ہیں۔ وہ پینتیس برس کی ہوں گی۔ شادی شدہ ہیں۔ ملتان میں رہتی ہیں۔ اپنی سوتیلی ماں سے ان کے کئی سوتیلے بھائی بہن ہیں لیکن میں صرف عیسیٰ محمد کو جانتی ہوں جو ملتان میں میڈیکل کا طالب علم ہے۔ عیسیٰ عربی میں یسوع مسیح کو کہتے ہیں۔ اس کی چھوٹی بہن گلزار فاطمہ اگرچہ بیس سال کی ہے لیکن بارہ تیرہ سال کی لڑکی لگتی ہے۔ وہ اتنی سمارٹ ہے کہ کوئی امریکی لڑکی اسے دیکھ لے تو رشک کرے۔ وہ لباس بھی خوبصورت پہنتی ہے۔ اس کا میاں، محمد افضل اکاؤنٹنٹ ہے۔ دونوں کی شادی کو ایک سال ہوا ہے۔ محمد افضل ہی نے ہمیں میاں مٹھو خرید کر دیا تھا۔

Marfat.com

یہ ہے وہ خاندان جسے میں نے اپنایا ہے۔ ان میں محمد انور، اسلم، اشرف، عیسیٰ محمد، محمد سرور، محمد افضل، فضل الحق اور ام کلثوم انگریزی فر فر بولتے ہیں۔ دوسروں کو انگریزی کا ایک لفظ نہیں آتا۔

اور اب ہمارے ملازموں سے ملیے۔ شریف اور رحیم الرسل ڈسپنسری پر بھائی جان اور محمد انور کی مدد کرتے ہیں۔ دونوں بلوغت کی عمر کو پہنچنے والے ہیں۔ شریف تو بالکل اسی طرح کا ہے جیسے اس عمر کے امریکی لڑکے ہوتے ہیں۔ رحیم الرسل قدرے خاموش رہتا ہے۔ ان لڑکوں نے پچھلے دسمبر میں سٹرپسو مائی سین کی دس بوتلیں چرانے کی کوشش کی تھی۔ محمد انور نے تو مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا۔ بھائی جان پولیس میں رپورٹ کرنے لگے تھے لیکن دونوں نے التجا کی کہ خدا کے واسطے انہیں معاف کر دیا جائے۔ کوئی اور ملازم میسر بھی نہیں تھے چنانچہ وہ ابھی تک ہمارے ساتھ ہیں لیکن اس کے بعد سے ان کی کوئی شکایت سامنے نہیں آئی۔ ہمارے گھر کی ملازمہ کا نام فاطمہ ہے اور وہ چالیس سال کی عمر کی ہے۔ آپا اسے مائی کہہ کر پکارتی ہیں جو احترام کا لقب ہے۔ ہر صبح مائی ساڑھے چھ بجے آجاتی ہیں اور دوپہر تک کام کرتی ہیں۔ پھر وہ اپنے گھر چلی جاتی ہیں اور ساڑھے تین بجے واپس آجاتی ہیں۔ پھر وہ سورج غروب ہونے تک کام کرتی ہیں۔ ہم سب انہیں پسند کرتے ہیں۔ وہ اپنا کام دل لگا کر کرتی ہیں۔ آپا کو ان کی صرف ایک بات بری لگتی ہے کہ وہ رمضان کے علاوہ باقی دنوں میں نماز نہیں پڑھتیں۔ مائی کی دو بیٹیاں ہیں، اکیس سالہ حنیفہ اور تیرہ سالہ بلقیس۔ حنیفہ بھی ہمارے ہاں کام کرتی ہے۔ وہ اگرچہ کبھی سکول نہیں گئی اور ناخواندہ ہے لیکن ہے ذہین۔ صاف ستھری رہتی ہے اور دیکھنے میں بھلی لگتی ہے۔ وہ دیانتدار ہے اور قابل اعتبار اور اپنی ماں کے برعکس پانچوں وقت کی نماز بھی پڑھتی ہے۔ چنانچہ آپا اسے بہت اچھا سمجھتی ہیں۔ مائی چاہتی ہیں کہ حنیفہ کی جلد از جلد شادی ہوجائے۔ مائی کی ماہانہ تنخواہ صرف پندرہ روپے (ڈالر) ہے لیکن ان کے سارے خاندان کو کھانا ہمارے ہاں سے ملتا ہے۔ اس طرح اگرچہ ان کے لباس پرانے اور بوسیدہ ہیں لیکن وہ اتنا ہی اچھا کھانا کھاتے ہیں جتنا ہم۔

Marfat.com

اور آخر میں اپنی عیسائی ملازمہ کا ذکر ہو جائے۔ درحقیقت وہ واحد عیسائی خاتون ہے جو ہم پردہ نشین عورتوں کو نظر آتی ہے۔ اس کا نام دارا ہے۔ وہ روزانہ دو مرتبہ ٹوائلٹ صاف کرنے آتی ہے۔ کرسمس اور ایسٹر کے دو موقعوں پر اس کی چھٹی ہوتی ہے اور ہم کرسمس اور ایسٹر گندے ٹوائلٹوں کے ساتھ "مناتے" ہیں۔ میں ہمیشہ سوچتی تھی کہ دارا ہندو سے عیسائی بنی ہوگی لیکن ایک مرتبہ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے سختی سے اس کی تردید کی اور کہا کہ وہ جدی پشتی عیسائی ہے۔ اس کے والدین، دادا، دادی، نانا، نانی سب عیسائی تھے۔ اس کے سب بہن بھائی بھی عیسائی ہیں اور ان کے خاندان میں کوئی ہندو نہیں ہے۔ لباس اور بظاہر دیکھنے میں پتوکی کے عیسائیوں اور مسلمانوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ البتہ ان کی عورتیں پردہ نہیں کرتیں اور گندی رہتی ہیں۔ دارا اگر گندی نہ رہے تو بڑی خوبصورت لگے۔ اس کا کام ایسا ہے کہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے گھر کے ساتھ والے ہمسائے ہمارے بہت اچھے دوست ہیں۔ ان کا گھر ہمارے گھر کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور چونکہ چھتیں بھی ملی ہوئی ہیں، ہم آسانی سے ایک دوسرے کے ہاں ایسے چلے جاتے ہیں جیسے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں۔ دونوں گھروں کے صحن کے بیچ والی دیوار میں ایک سوراخ ہے۔ ان کے ہاں سے کسی کو بلانا ہو تو آپا اسی سوراخ سے آواز دے کر بلا لیتی ہیں۔ یہ ہمارا "ٹیلیفون" ہے۔

بھائی جان کی طرح ہمارے قریبی ہمسائے ارشاد صاحب بھی یونانی حکیم ہیں۔ ان کا اپنا دواخانہ ہے جہاں وہ بڑی دیر تک کام کرتے ہیں۔ پتوکی میں "ویک اینڈ" کے نام کوئی چیز نہیں۔ مسلمانوں میں یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح "سبت" کا کوئی تصور نہیں چنانچہ وہ ہفتے کے ساتوں دن کام کرتے ہیں۔ وقفہ صرف نمازوں کا ہوتا ہے جو روزانہ ایک ہی طرح کی ہوتی ہیں۔ جیسا کہ امید رکھنی چاہیے، بھائی جان اور ارشاد صاحب ملتے ہیں، تو اپنے دواخانوں کی باتیں ہی کرتے ہیں۔ ارشاد صاحب چھوٹے قد کے، کمر خمیدہ، گندمی رنگ کے آدمی ہیں۔ ان کی داڑھی سفید ہو رہی ہے۔ سردیوں میں

Marfat.com

وہ سفید کمبل لپیٹے، لاٹھی کے سہارے چلتے ہیں تو اپنی پچاس سال کی عمر سے کہیں زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ بڑے نرم خو اور شفیق انسان ہیں اور حیرت کی بات یہ کہ بہت اچھی انگریزی بولتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے بارے میں کوئی مسئلہ ہو تو ان سے مشورہ کیا جاتا ہے۔ بھائی جان کے برعکس جن کی حکمت کے بارے میں ساری تربیت ان کے والد اور دادا نے کی تھی، ارشاد صاحب لاہور کے طبیہ کالج کے گریجویٹ ہیں۔ انہوں نے 1936ء میں گریجویشن کی۔ طبیہ کالج یونانی دواؤں میں تربیت کا بڑا مرکز ہے۔ اہم اور رئیسی نصابی کتاب ابن سینا کی ضخیم تصنیف "قانون" ہے۔ یہ کتاب لاطینی ترجمے کے ساتھ سترھویں صدی تک یورپ کے تمام میڈیکل اداروں میں بطور نصاب پڑھائی جاتی تھی۔ الرازی کی طبی کتابوں کو، جو نویں صدی میں لکھی گئیں، بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔

ارشاد صاحب کی اہلیہ صغریٰ بڑی ذہین خاتون نظر آتی ہیں۔ ان کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہے، رنگ سانولا ہے اور اپنی عینک کے ساتھ وہ اور بھی زیادہ دانشور لگتی ہیں۔ ان کے آٹھ بچے ہیں جو سب مل کر تین چھوٹے چھوٹے کمروں میں رہتے ہیں۔ سترہ سالہ ادیبہ سب سے بڑی ہے۔ وہ تھوڑی بہت انگریزی بول لیتی ہے جو اس نے سکول میں سیکھی تھی لیکن اب اس نے اپنی پڑھائی مکمل کر لی ہے۔ اب وہ اس انتظار میں ہے کہ اس کے والد اس کے لیے کوئی اچھا شوہر ڈھونڈیں تو اس کی شادی ہو۔ اس سے چھوٹی بارہ سالہ نسیم ہے جو ملتان کے کسی دینی مدرسے میں پڑھ رہی ہے اور رمضان کے آخر میں چند دنوں کے لیے گھر آتی ہے۔ ارشاد صاحب اس کے اخراجات کے لیے ہر مہینے اسے پچاس روپے (دس ڈالر) بھیجتے ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے پچاس روپے بہت بڑی رقم ہے۔ نسیم بڑی کم گو اور سنجیدہ لڑکی ہے اور گھنٹوں اپنے عربی کے سبق دہراتی رہتی ہے۔ پھر دس سالہ سعیدہ ہے جس سے میری اور آپا کی اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ ہر سہ پہر کو چار بجے سعیدہ اپنا قرآن اٹھائے ہمارے گھر آتی ہے اور پیڑھی لے کر آپا کے پاس بیٹھ جاتی ہے جو روٹیاں پکانے میں مصروف ہوتی ہیں۔ وہ قرآن پڑھتی ہے اور

Marfat.com

کہیں کوئی غلطی کرے تو آپا اسے ٹوک دیتی ہیں۔ سعیدہ ابھی صرف دس سال کی ہے لیکن اسے وہ سب کچھ آتا ہے جو اس کی والدہ کو آتا ہے۔ گھرداری، سینا پرونا، کھانا پکانا اور بچوں کی دیکھ بھال۔ اس کا دبلا پتلا چہرہ سنجیدہ رہتا ہے لیکن وہ اتنی سنجیدہ بھی نہیں کہ اپنی دو چھوٹی بہنوں ساڑھے آٹھ سالہ صبیحہ اور سات سالہ نجیم کے ساتھ رسہ کودنے یا گیٹوں کے کھیل میں شریک نہ ہو۔

ایک دفعہ وہ میرے پیچھے پڑ گئیں کہ میں ان کے ساتھ رسہ کودوں۔ میں نے احتجاج کیا کہ میں ان کی طرح بچی نہیں ہوں بلکہ تیس سال کی عورت ہوں اور پچھلے بیس سال سے میں نے رسہ نہیں کودا۔ سعیدہ اپنی عمر کے کسی بھی امریکی بچے کو گیٹوں کے کھیل میں ہرا سکتی ہے۔ پتوکی میں اس کھیل میں جو پتھر استعمال ہوتے ہیں، وہ اصلی ہوتے ہیں اور سعدیہ نے خود اکٹھے کر رکھے ہیں۔ پھر چھ سالہ ہارون ہے۔ ہر لحاظ سے وہ ایک خوبصورت بچہ ہے۔ ذہانت سے اس کی بڑی بڑی آنکھیں چمکتی ہیں لیکن اپنے والد کی طرح اس کی ہڈیاں بھی کمزور ہیں۔ اس کی آواز خوبصورت ہے اور گونج دار۔ اگر وہ ہندو ہوتا تو کسی مندر میں رقاص بنتا یا گلوکار۔ لیکن دوسرے راسخ العقیدہ مسلمانوں کی طرح ارشاد صاحب بھی ان باتوں کو پسند نہیں کرتے اور ان کی سختی سے مذمت کرتے ہیں۔ پھر دو سال کی معصوم چہرے والی نازک ناہید ہے۔ آخر میں تین مہینے کا محمد امین ہے۔ وہ اس وقت پیدا ہوا تھا جب میں محمد انور کے گھر ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ بڑا کمزور ہے اور بیمار رہتا ہے کیونکہ صغریٰ کی چھاتیوں سے اتنا دودھ نہیں اترتا جو اس کے لیے کافی ہو۔ ہے بڑا پیارا۔ جب بھی مجھے دیکھتا ہے تو بڑی گرمجوشی سے مسکراتا ہے۔ وہ تین مہینے کا چھوٹا سا بچہ ہے لیکن بہت کم روتا ہے۔ ارشاد صاحب اور صغریٰ کے والدین بھی انہی کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی رہائش نیچے غارنما کمروں میں ہے جہاں بھینس بھی بندھی ہوتی ہے۔ ان کی بھینس بڑی کمزور اور ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے۔ اس کے مقابلے میں محمد انور کی بھینسیں بڑی شاندار اور صحت مند ہیں۔ اسے اس وقت تک رکھا جائے گا جب تک وہ بچوں کے لیے تھوڑا بہت دودھ دیتی رہے گی اور پھر ظاہر ہے ذبح ہو جائے گی۔

Marfat.com

اور ہانڈیوں کی زینت بنے گی۔

صغریٰ کی چھوٹی بہن ثریا بھی ان کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کی عمر بیس سال ہے۔ اس کا دماغ شروع ہی سے مفلوج ہے۔ صغریٰ نے بتایا کہ وہ پیدائش کے وقت سے ہی فاتر العقل ہے۔ وہ بالکل پاگل اور دیوانی ہے اور اسے دیکھتے ہی اس کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ ناقابل یقین حد تک گندی رہتی ہے۔ اس کے بال الجھے رہتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک ظالمانہ چمک ہوتی ہے اور وہ گالیاں دیتی رہتی ہے۔ ارشاد صاحب نے بتایا کہ اس نے ایک مرتبہ انہیں بھی "گدھے چور کی بیٹی" کہا تھا۔ وہ عبدالغنی کے چھوٹے بیٹے کے بالکل برعکس ہے۔ وہ بھی ذہنی طور پر معذور تھا لیکن وہ بڑا نرم خو اور پاکباز تھا اور کبھی اپنی نمازوں سے غافل نہیں ہوا۔ کرسمس کے دن اس کا انتقال ہوا۔ ثریا نماز تو کیا پڑھے گی، اسے شعور ہی نہیں کہ نماز ہوتی کیا ہے۔ اگرچہ رشتہ داروں نے ثریا کے والدین کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ اسے لاہور میں دماغی امراض کے ہسپتال بھجوا دیں لیکن وہ سخت انکاری ہیں۔

یہ ہیں میری زندگی میں آنے والے سب لوگ۔ آپ جب پتوکی آئیں گے تو ان سب سے ملیں گے۔ ہر شخص مجھ سے پوچھتا ہے کہ آپ کب آ رہے ہیں؟ مزید لوگوں سے ملاقات کے لیے بیگم مودودی آپ کی زیادہ مدد کر سکیں گی۔ وہ اپنے دس بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہیں۔ ایک کے سوا سب لاہور ہی میں رہتے ہیں۔ ان کی چھوٹی بہنوں میں کوئی بھی پردہ نہیں کرتی اور سب بڑی روانی سے انگریزی بولتے ہیں۔ ان کے مالدار، آرائشی گھرانوں میں ٹی پارٹیاں، آپ کی میل ملاقات کی ضرورت کو باحسن پورا کریں گی۔ لیکن ظاہر ہے، شراب نوشی کی کوئی محفل برپا نہیں ہو سکے گی۔ اگر آپ کو اردو سے شناسائی ہوتی تو بیگم مودودی آپ کو جماعت اسلامی کی خواتین کارکنان سے بھی ملوا دیتیں۔ بھائی جان کی لاہور میں کئی علماء سے جان پہچان ہے اور پتوکی کے کئی صوفی بزرگ ان کے دوست ہیں۔ ان میں سے ایک یہیں مقامی مسجد کے امام ہیں۔ لیکن ظاہر ہے یہ سب آپ کی دسترس سے دور ہوں گے کیونکہ انہیں انگریزی نہیں آتی۔

Marfat.com

عرب دنیا کی طرح پاکستانی بھی بڑے مہمان نواز ہیں۔ آپ کے میزبان آپ سے نہ کسی صلے کی توقع رکھتے ہیں نہ ادلے کا بدلہ چاہتے ہیں۔ بس آپ خوشگوار آداب کے ساتھ آئیں، مذہبی اور سیاسی گفتگو سے پرہیز کریں تو آپ کا وقت اچھا گزرے گا۔

اگر آپ کراچی سے لاہور پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز سے سفر کریں تو آپ کو وہ سہولت اور آرام ملے گا جو امریکہ میں بھی میسر نہیں۔ ان کی کارکردگی ایک معجزہ ہے۔ آپ کے ہم سفر لوگوں میں امریکی بھی ہوں گے اور مغربی رنگ میں رنگے ہوئے اونچے طبقے کے پاکستانی بھی۔ لیکن اگر آپ یہ ملک دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو ریل کے تیسرے درجے (انٹر کلاس) میں سفر کرنا چاہیے۔ اس میں ازدحام ہوگا اور یہ آرام دہ بھی نہیں ہوگا لیکن کرایہ بہت سستا۔ کراچی سے لاہور سات سو میل ہے لیکن اس کا کرایہ صرف تیس روپے ہے یعنی چھ ڈالر۔ لاہور سے پتوکی پچاس میل ہے اور اس کے کرایے پر آپ کے پچاس سینٹ (ڈھائی روپے) صرف ہوں گے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

لاہور اور کراچی میں کوئی آپ کی موجودگی محسوس نہیں کرے گا کیونکہ دنیا کے تمام بڑے شہروں کی طرح یہاں کے شہری بھی ہر ملک کے طرح طرح کے سیاح دیکھنے کے عادی ہیں۔ لیکن یہاں پتوکی کے دیہاتی ماحول میں بالکل نئی صورت حال ہوگی۔ آب جونہی ریل یا بس سے اتریں گے تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ خاص طور پر عورتیں اور بچے آپ کو ٹکٹکی باندھ کر ایسے دیکھیں گے کہ ان کی آنکھیں ابل پڑیں گی۔ آپ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ وہ آپ سے گستاخی نہیں کر رہے ہوں گے اور ان کا رویہ غیر دوستانہ نہیں ہوگا بلکہ وہ ناخواندہ، سادہ لوح لوگ ہیں جنہوں نے کبھی کسی امریکی یا یورپی کو نہیں دیکھا۔ آپ کی آمد ان کے لیے اہم واقعہ ہوگی۔

مَیں جب یہاں آئی تو پاکستانی کھانوں کی عادی ہونے سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ جب بھی بھوک لگتی تو میری نظروں کے سامنے امریکہ کے رنگ برنگے کھانے، بڑے گوشت کے پارچے، برگر، آلوؤں کے چپس، پنیر کے کیک اور اسی طرح کی

Marfat.com

دوسری چیزیں گھومنے لگتی تھیں۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ جب آپ تفصیل سے کسی سالگرہ کی تقریب کے ڈنر یا ویسٹ چیسٹر کے ہوٹلوں کے کھانوں کے بارے میں لکھتے تھے تو ان کی یادیں میرے لیے اذیت ناک ہوتی تھیں۔ مولانا مودودی نے بتایا کہ انہیں بھی سعودی عرب میں اسی طرح کے تجربات سے گزرنا پڑا۔ جب وہ سعودی عرب جاتے تھے تو بادشاہ کے خصوصی مہمان ہونے کے ناطے ان کے اعزاز میں جو دعوتیں ہوتی تھیں ان میں پورا پورا اونٹ روسٹ کر کے رکھا ہوتا تھا، جس میں اس کی سری بھی موجود ہوتی تھی اور اس کی آنکھیں اور اعضائے تناسل مہمان خصوصی کو بطور اعزاز پیش کیے جاتے تھے، اور کوہان کی تلی چربی کھانے سے پہلے استعمال ہوتی تھی۔ پاکستانی اپنے کھانوں کے عادی ہوتے ہیں اور ایک اجنبی بھی جب مرچ مسالوں کا عادی ہو جائے تو اس کے بغیر کھانے اس کے لیے بے مزہ ہو جاتے ہیں۔ اب برگروں اور سنیک کا تصور ختم ہو گیا ہے۔ اب مجھے بھوک لگتی ہے تو گرم گرم چپاتیاں، چٹپٹی دال، ساگ، بند گوبھی کے سالن جن میں مکھن پڑا ہو، میرے دل کو لبھاتے ہیں۔ بکرے کے گردے کلیجی اور انڈوں کے ساتھ ملا کر پکایا گیا مغز مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ آپا یہ ڈش پکانے میں بڑی ماہر ہیں۔ بیٹی کو بتایئے گا کہ انہیں پھول گوبھی بہت پسند ہے، تو یہاں وہ جی بھر کر اپنا شوق کر پورا کر سکتی ہیں کیونکہ وہ سستی بھی ہے اور ہماری پسندیدہ غذا بھی۔

آج کل میں باقاعدگی سے آپا کی نگرانی میں "چپاتیاں بنانے کے اعلیٰ ادارے" میں زیر تعلیم ہوں۔ فرحت میری ہم جماعت ہے اور آپا ہمیں چپاتیاں بنانا سکھا رہی ہیں۔ آپا نے مجھے یقین دہانی کروائی ہے کہ اگر میں نے اپنے سبق محنت سے یاد کیے تو ایک دو ہفتوں میں چپاتیاں بنانے کی ماہر ہو جاؤں گی۔

پچھلے چند ہفتوں سے بھائی جان کافی خاموش ہو گئے ہیں اور الگ تھلگ رہتے ہیں۔ ان کے فارغ وقت کا بیشتر حصہ، سورج نکلنے سے پہلے صبح دو تین گھنٹے اور رات کا کچھ حصہ، وہ چھت پر ٹہل کر گزارتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح ہوتی ہے جس کے دانوں پر وہ ذکر کرتے رہتے ہیں۔ قریبی گھر سے ریڈیو پر روشن آراء بیگم کے کلاسیکی

Marfat.com

گانوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ ہم انہیں پکے راگ کہتے ہیں۔ آج کل کچھ پرانے لوگ ہی کلاسیکی موسیقی یا پکے راگ پسند کرتے ہیں۔ نئی نسل تو پاپ میوزک یا نئے گانوں کی شیدائی ہے۔ مجھے کلاسیکی موسیقی کی اداس دھنیں اچھی لگتی ہیں۔ جب بھائی جان چھت پر ٹہل کر ذکر میں مشغول ہوتے ہیں تو میں روشن آراء کے اداس مگر خوبصورت گیت سنتی رہتی ہوں۔ ساڑھے نو بجے کے قریب تمام گھروں میں ریڈیو اور روشنیاں بند ہوجاتی ہیں۔ یہاں پتوکی میں شبینہ سرگرمیوں کا کوئی تصور نہیں۔ یہاں رات کو گلیوں سے آوارہ بلیوں کے رونے کی آوازیں آتی ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کوئی بلی رو رہی ہے یا انسانی بچہ۔ جنگلی کتے بھی پرشور بحث میں مصروف ہوتے ہیں اور ان کے بھونکنے کی آوازیں پورے قصبے میں گونج رہی ہوتی ہیں۔ اس وقت بجلی کی تمام روشنیاں اور مٹی کے تیل کے دیے بجھ چکے ہیں۔ آسمان صاف اور ستاروں سے روشن ہے جن کے بیچ آدھا چاند بھی چمک رہا ہے۔ بھائی جان تن تنہا چھت پر ٹہلتے ہوئے تسبیح پر ذکر کر رہے ہیں۔۔۔ اکیلے اپنے خدا سے ہم کلام ہیں۔ آپا کے خیال میں صوفی بن گئے ہیں۔

تمام تر محبتوں کے ساتھ

مریم جمیلہ

Marfat.com

مینٹل ہسپتال سے خط

مریم جمیلہ
گورنمنٹ مینٹل ہسپتال
جیل روڈ، لاہور
پاکستان
3 اگست 1963ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
لارچمونٹ ایکرز، اپارٹمنٹ نمبر C-223
لارچمونٹ، نیو یارک، یو۔ ایس۔ اے

پیاری ترین امی اور ابو!

اب جبکہ مجھے اس ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا ہے، میں آپ کو بتانا چاہوں گی کہ مجھے یہاں کیوں اور کیسے داخل کیا گیا، یہ جگہ کیسی ہے، میرا علاج کیسے کیا گیا اور پھر کس طرح فارغ کیا گیا۔

بات ابتدا سے شروع کرتی ہوں۔ میں جب پچھلے سال جون کے آخر میں مولانا مودودی کے گھر پہنچی تو وہ مجھے دیکھ کر بہت مایوس ہوئے۔ میں جو کچھ ہوں، وہ اس سے بالکل مختلف لڑکی کی توقع کر رہے تھے۔ مجھ سے ملنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ انہیں یقین نہیں آتا کہ میں وہی شخص ہوں جس نے انہیں شاندار خط لکھے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مریم جمیلہ کے دو روپ ہیں۔ ایک تحریروں میں، دوسری میری شخصیت میں۔ ایک سرپرست کی حیثیت سے انہوں نے ایک سخت گیر باپ کا سا رویہ اختیار کیا۔ وہ مجھے

Marfat.com

مسلسل ڈانٹ پلاتے تھے اور میرے رویے پر تنقید کرتے رہتے تھے۔ اگر وہ خود ڈانٹ نہیں پلاتے تھے تو مجھے رقعہ لکھتے تھے جس میں میری غلط حرکتوں کی نشاندہی کی جاتی تھی۔ میں اتنی سخت اذیت میں تھی کہ گھر میں ملنے آنے والوں کے سامنے دل کا غبار نکال کر ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس پر مولانا اپنے آفس میں بلا کر اجنبی لوگوں کے سامنے ان کے بارے میں توہین آمیز کلمات کہنے پر مجھے سخت سست کہتے اور بری طرح ڈانٹ پلاتے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے مجھے اردو سکھانے کے لیے جس ٹیوٹر کا انتظام کیا ہے، وہ مسلسل شکایت کرتے ہیں کہ میں اپنے اسباق پر اتنی توجہ نہیں دیتی جتنی دینی چاہیے بلکہ میں ان سے اپنے ذاتی مسائل پر گفتگو کرتی رہتی ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ ہر وہ شخص جس سے میں ملی، اس نے میری شکایت کی۔ لوگ محبت سے ملنے آتے ہیں لیکن واپس جاتے ہیں تو تلخیوں کے ساتھ۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ اس وقت میں اسلام کی اچھی مبلغ نہیں تھی۔ مجھ میں اتنی مہارت نہیں تھی کہ یہ پتہ ہو کہ مختلف لوگوں سے کیسے ملنا ہے اور ان کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا ہے۔ میل جول میں بالکل ناتجربہ کار اور ناپختہ تھی۔ مجھے یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ جن لوگوں کو میں ناپسند کروں یا جن سے مل کر پریشان ہو جاؤں تو ان سے اچھا رویہ کیسے اختیار کیا جائے۔

میں جب مولانا مودودی کے گھر میں رہائش پذیر تھی تو سب سے افسوسناک واقعہ تب رونما ہوا جب مجھے بیگم مودودی کے چھوٹے بھائی کے گھر ٹی پارٹی پر بلایا گیا۔ میں شوق سے اس موقع کی منتظر تھی کیونکہ بیگم مودودی نے بتایا تھا کہ ان کے بھائی نے کینیڈا کے ایک نوجوان کو بھی مجھ سے ملانے کے لیے مدعو کیا ہوا ہے جس نے حال ہی میں اسلام قبول کیا ہے۔ اسے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر کے نام سے متعارف کروایا گیا۔ وہ خود بھی جدید طرز کا آدمی تھا اور اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ وقت کا ساتھ دینے کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کی بھی جدید تشریح کی جائے۔ میں اس کی باتیں سن کر بدحواس ہو گئی۔ اس نے ان مشکلوں کا ذکر کیا جو اسے پچھلے سال حج کے موقع پر پیش آئیں۔ اسے

Marfat.com

حج کی اجازت لینے میں سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ سعودی حکام یورپ کے نومسلموں کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس پر اسے سخت مایوسی تھی اور اس کے نزدیک مسلمان گندے اور دقیانوسی لوگ تھے۔ وہ جس مسلمان ملک بھی گیا وہاں سے مایوس لوٹا۔ اس کے نزدیک مولانا مودودی بھی ایک رجعت پسند دیوانے تھے۔ اس کی پاکستانی بیوی جس کی پیدائش کینیڈا میں ہوئی تھی، دبلی پتلی خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ اپنے شوہر سے زیادہ جدید ذہن کی مالک تھی۔ ایک سمجھدار بیوی کے بجائے اس کا رویہ امریکہ کی کسی نوجوان "ٹیڈی گرل" جیسا تھا۔ گرما گرم بحث کے دوران میں مایوسی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ٹی پارٹی کو ادھورا چھوڑ کر میں تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئی اور میں نے التجا کی کہ مجھے گھر لے جایا جائے۔ مولانا مودودی اس پر سخت ناراض ہوئے اور انتہائی درشت لہجے میں، جس کا اس سے پہلے مجھے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا، کہا کہ میں نے ان کے بھتیجے کے گھر میں ان کے خاندانی روابط توڑنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ کینیڈا کا نومسلم شخص عبدالرحمٰن بارکر، کینیڈا کے شہر مونٹریال کی میک گل یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ میں اسلامیات کا پروفیسر ہے اور اس نے اس وقت تک مولانا مودودی کے ہاں آنے سے انکار کر دیا ہے جب تک میں یہاں ہوں۔ اس سے پہلے وہ ان سے ملنے آتا تھا اور مختلف اسلامی موضوعات پر ان سے تبادلہء خیالات کرتا تھا۔ میں جن لوگوں کو ناپسند کرتی تھی ان کے لیے مولانا نے "قابل احترام" کا لفظ استعمال کیا۔ ہر شخص "قابل احترام" تھا سوائے میرے۔ میں نہیں تھی قابل احترام۔

چند دنوں بعد کی بات ہے کہ مجھے انڈیا کے کچھ ہیجان انگیز، فحش رسالے نظر آئے جو مولانا کے بالغ بیٹوں میں سے ایک کی ملکیت تھے۔ میں وہ رسالے مولانا کے دفتر میں ان کے پاس لے گئی اور انہیں بتایا کہ یہ ہیں وہ رسالے جو ان کے بیٹے پڑھتے ہیں۔ گھر کے سب لوگ مجھ سے ناراض ہو گئے اور الزام لگایا کہ میں ان کی جاسوسی کرتی ہوں اور ان کی خبریں ان کے والد کو دیتی ہوں۔ مولانا مودودی نے کہا کہ میں ان کے

Marfat.com

خاندان کی تذلیل کر رہی ہوں۔ لیکن اتنا کچھ ہونے کے باوجود معجزانہ طور پر انہوں نے مجھے آپ کے پاس امریکہ نہیں بھجوایا بلکہ پتوکی بھجوا دیا، اس امید سے کہ شاید وہاں میری ذہنی صحت بحال ہو جائے۔

لیکن بحالی کے بجائے پتوکی پہنچنے کے فوراً بعد میرا اعصابی نظام اس طرح مفلوج ہو گیا جیسے امریکہ میں 1953ء اور 1958ء کے درمیان ہوا تھا۔ میں نے اس سے پہلے جان بوجھ کر آپ کو نہیں بتایا کہ آپ خواہ مخواہ تشویش میں مبتلا ہو جائیں گے۔ جوں جوں میری حالت خراب تر ہوتی گئی، مولانا مودودی کے خطوں کا رویہ درشت سے درشت تر ہوتا گیا۔ بالآخر 12 مارچ کے خط میں انہوں نے میری ان ساری غلطیوں کو دہرایا جو میں پتوکی میں کرتی رہی تھی اور جن کی شکایت بھائی جان نے لاہور جا کر مولانا سے کی تھی۔ یہ میرے لیے خوفناک ترین صدمہ تھا۔ بھائی جان مجھ پر اتنا مہربان تھے اور ہمیشہ ہمدردی سے پیش آتے تھے، وہ یہ کام کیسے کر سکتے تھے؟ مجھے احساس ہوا کہ میں کسی پر اعتبار نہیں کر سکتی۔ باقی خط میں انہوں نے وہ ساری غلطیاں دہرائی تھیں جو پاکستان آنے کے بعد مجھ سے سرزد ہوئی تھیں۔ انہوں نے لکھا تھا:

"شروع شروع میں مَیں نے سوچا تھا کہ تمہاری یہ حالت شادی نہ ہونے کی مایوسی کی وجہ سے ہے، لیکن اگر میں تمہاری شادی کروانے کی ذمہ داری اٹھا بھی لیتا تو اور تمہاری حالت پھر بھی بہتر نہ ہوتی تو کیا ہوتا؟ اس غریب کی تو پوری زندگی تباہ ہو جاتی!"

آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس خط کا مجھ پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ اس کے بعد والے ہفتے ناقابل بیان ذہنی اذیت میں گزرے اور اس مصیبت میں، میں نے اپنے ہمسائے ارشاد صاحب کے گھر میں پناہ لی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مولانا مجھے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، سو میں نے کراچی کے ایک صحافی شہیر نیازی کو، جس کے ساتھ میری خط و کتابت تھی، خط لکھا کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے، اس کے پیش نظر میں مزید مولانا مودودی کی سرپرستی میں نہیں رہنا چاہتی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ پتوکی آ سکتا ہے تاکہ ہم یہ مشورہ کر سکیں کہ میں اس ملک میں اپنے طور پر کیسے رہ سکتی ہوں۔ شہیر نیازی نے

Marfat.com

جواب دیا کہ وہ فوراً پتو کی پہنچ رہا ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ یہاں پہنچتا، ایک صبح جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل میاں طفیل محمد تشریف لے آئے۔ ان کے ساتھ لاہور میں امریکی قونصل خانے کا ایک نامعلوم آدمی اور سنہرے بالوں والی دبلی پتلی خوبصورت لڑکی بھی تھی۔ اس لڑکی نے اپنا تعارف جینٹ حنانم کے نام سے کروایا اور بتایا کہ وہ صدر کینیڈی کی "پیس کور" کی رکن ہے۔ ایک اور آدمی بھی تھا جو میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ چھوٹے قد کا بھاری بھر کم سانولا سا انسان۔ میں نے میاں طفیل محمد سے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا "میرا ایک ذاتی دوست، ڈاکٹر رشید چودھری۔" مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ لاہور میں دماغی امراض کے ہسپتال کے ڈائریکٹر ہیں اور پورے پاکستان میں مشہور ماہر نفسیات۔ بھائی جان کے گیسٹ روم میں ایک ٹی پارٹی ہوئی جس میں چائے اور مٹھائی پیش کی گئی۔ ٹی پارٹی کے اختتام پر مجھے بتایا گیا کہ میں اپنا سامان پیک کرلوں اور چلنے کے لیے تیار ہو جاؤں۔ جب یہ بات واضح ہوگئی کہ میں جا رہی ہوں تو آپا اور بھائی جان کے سب گھر والے جمع ہو گئے۔ کئی لوگ میری روانگی کا منظر دیکھ کر اور یہ سوچ کر کہ شاید میں کبھی واپس نہ آؤں، رونے لگے۔ بھائی جان نے کہا:

"ہمیں بھلا نہ دینا، کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا۔ تمہاری مدد کر کے مجھے خوشی ہوگی۔" آپا نے مجھے گلے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔ وہ ایسے سسکیاں بھر رہی تھیں جیسے ان کا دل ٹوٹ گیا ہو۔

تو ہم پانچ افراد، میاں طفیل محمد، ان کے" ذاتی دوست" ڈاکٹر رشید چودھری، امریکی قونصل خانے کا ڈائریکٹر، میں اور پیس کور کی کارکن جینٹ حنانم ایک کار میں سوار ہو گئے۔ اس موقع پر متجسس تماشائیوں کا ایک ہجوم "میم صاحب" کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ (پاکستانی امریکہ یا یورپ کی سفید فام خواتین کو اسی نام سے پکارتے ہیں)۔ ہجوم کو پیچھے چھوڑ کر ہم روانہ ہو گئے۔

ہم جب ادارے میں پہنچے تو مجھے فوری طور پر ایڈمشن آفس لے جایا گیا جہاں

Marfat.com

مجھے پتہ چلا کہ ڈاکٹر رشید چودھری ڈائریکٹر انچارج ہیں۔ نہ کوئی راہ فرار تھی نہ متبادل انتظام۔ میں نے فرمانبرداری ہی میں عافیت جانی اور کوئی مزاحمت نہیں کی۔ میں نے ان تمام دستاویزات پر خود دستخط کیے جن میں یہ درج تھا کہ میں "رضا کارانہ" مریض کی حیثیت سے یہاں داخل ہو رہی ہوں حالانکہ اپنی مرضی سے میں اس ادارے میں کبھی نہ آتی۔ میں نے سوچا "کیا وہ صحافی شہیر نیازی مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچ پائے گا اور مجھے بچا کر لے جائے گا؟"

لیکن ہوا یوں کہ لاہور میں یہاں قیام کا تجربہ اتنا برا ثابت نہیں ہوا، جتنا میں توقع کر رہی تھی۔ امریکہ میں 1957ء سے 1959ء تک جو دو سال میں نے پرائیوٹ اور سرکاری اداروں میں گزارے، ان کے مقابلے میں یہ جگہ جنت تھی۔ مجھے ابھی تک امریکی شہریت حاصل تھی اور مجھے یہاں صرف پرائیویٹ مریض کی حیثیت سے داخل کیا جا سکتا تھا۔ مجھے بہت جلد یہ احساس ہو گیا کہ امریکی شہریت کی وجہ سے مجھے پورے ہسپتال میں زبردست استحقاق حاصل ہے۔ دوسرے مریضوں کا یہ حال تھا کہ کئی کئی افراد ایک کمرے میں رہتے تھے لیکن مجھے ایک کشادہ، روشن کمرہ دیا گیا تھا جو صرف میرے لیے مخصوص تھا۔ چوبیس گھنٹے تین آیائیں صرف میری خدمت پر مامور تھیں۔ دوسرے مریضوں کے برعکس، میرا سامان بھی مجھ سے نہیں لیا گیا۔ اور مجھے اپنے کپڑے اور کتابیں اپنے کمرے میں رکھنے کی اجازت تھی۔ اور چونکہ دوسرے مریضوں کی طرح میں نے کبھی خودکشی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی، مجھے ریزر، بلیڈ اور ماچس بھی رکھنے کی اجازت تھی جو عام طور پر دماغی امراض کے اداروں میں نہیں دی جاتی۔ روزانہ ڈاکٹر رشید یا ان کی ماتحت ڈاکٹر سعیدہ مجھ سے ملنے آتی تھیں۔ تمام ڈاکٹرز، نرسیں اور سوشل ورکر مجھ سے بڑے حسن سلوک سے پیش آتے۔ ہر شخص مجھ پر مہربان تھا، میرا خیال رکھتا تھا بلکہ احترام کرتا تھا۔ امریکہ کے اداروں میں میرے قیام کے تجربات بڑے خوفناک تھے۔ ان اداروں اور اس ادارے میں بڑا فرق تھا۔ وہاں عملے کے لوگ مریضوں سے بری طرح سے پیش آتے تھے اور مریض بالکل بے بس اور بے یار و مددگار ہوتے

Marfat.com

تھے۔ نیویارک کے اداروں کے برعکس یہاں کے عملے پر کوئی پابندی نہیں تھی اور وہ جتنا وقت چاہتے مریضوں کے ساتھ گزار سکتے تھے۔ میں اپنا وقت پڑھنے لکھنے، سینے پرونے اور اسلامی رسائل کے لیے مضامین لکھنے میں گزارتی تھی۔ یہ مضامین میں مولانا مودودی کی رضامندی سے، انھی کے پتے سے بھیجا کرتی تھی۔ جینٹ بھی تقریباً ہر روز مجھے ملنے آتی تھی اور میں جس چیز کی خواہش کرتی، بازار سے لا کر مجھے دیتی تھی۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر میاں طفیل محمد میرے لیے ایک بہت اچھی بھیڑ لے کر آئے جس کے لیے مجھے صرف ستر روپے ادا کرنے پڑے۔ پورے ہسپتال میں، میں واحد مریضہ تھی جس نے قربانی کا اہتمام کیا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اس کا گوشت تمام آیاؤں اور ہسپتال کے غریب عملے میں تقسیم کیا۔

خواتین کے شعبے میں تقریباً پانچ سو مریضائیں تھیں۔ ان میں چار سو پچھتر سرکاری اخراجات پر رہ رہی تھیں اور پچاس ساٹھ روپے ماہانہ ادا کرتی تھیں۔ اور اگر کوئی بہت ہی غریب خاندان سے ہوتی تو اسے مفت بھی داخل کرلیا جاتا تھا۔ سرکاری اخراجات پر رہنے والے مریضوں کی رہائشی سہولتیں انتہائی گھٹیا اور صفائی کے انتظامات نا گفتہ بہ تھے۔ ہم پرائیویٹ مریضوں کا کھانا تو خراب ہوتا ہی تھا لیکن سرکاری مریضوں کو صرف پتلی دال اور سوکھی چپاتیوں پر گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ دال کو دیکھ کر ہی گھن آتی تھی اور میں سوچتی تھی کہ یہ لوگ اسے کیسے کھاتے ہیں لیکن بعد میں پتہ چلا کہ بہت سی مریضائیں ایسی ہیں جو اپنے گھروں میں بھی اسی طرح کی زندگی گزار رہی تھیں اور ادارے کے حالات ان کے لیے اتنے برے نہیں ہیں۔ امریکی اداروں کے برعکس، یہاں ماؤں کو گود کے اور دوسرے چھوٹے بچے اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت تھی۔ ماؤں کے نقطۂ نظر سے تو یہ بڑی ہمدردانہ سہولت تھی لیکن بچوں کے لیے یہ خوفناک ماحول تھا۔ ہمارے پاس روشن آنکھوں والے کچھ شرارتی بچے تھے جو نارمل لگتے تھے اور آپس میں کھیلتے رہتے تھے بلکہ سکول بھی جاتے تھے لیکن انہوں نے اس وقت تک یہاں ٹھہرنا تھا جب تک ان کی مائیں صحت یاب نہ ہو جاتیں کیونکہ ان کے پاس کہیں اور جانے کی کوئی

Marfat.com

جگہ ہی نہیں تھی۔ کچھ بچے مریض بھی تھے۔ ان میں سے زیادہ تر دماغی طور پر بہت ہی معذور تھے اور جب وہ اپنی ماؤں کے لیے بہت زیادہ پریشانی کا باعث بنتے اور جوان کی مزید دیکھ بھال نہیں کر سکتی تھیں، تو وہ انہیں یہاں چھوڑ گئیں۔ انہیں دیکھ کر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ وہ ننگ دھڑنگ بھاگتے پھرتے تھے۔ ان کے سوکھے ہوئے جسموں پر میل کی تہیں چڑھی ہوتیں۔ کہیں سے روٹی کا کوئی ٹکڑا مل جاتا تو چھین کر کسی خوفزدہ، فاقہ زدہ جانور کی طرح بھاگ اٹھتے۔ چھوٹے بچے تو اتنے نحیف ونزار تھے کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آتے۔ ڈاکٹر رشید نے بتایا کہ وہ انہیں بچانے کی پوری کوشش کرتے ہیں لیکن ان میں سے زیادہ بچے انتقال کر جاتے ہیں۔

سرکاری مریضوں کی دو قسمیں تھیں۔ ایک عمارت ان مریضوں کے لیے مخصوص تھی جن کی بحالی صحت کی رفتار تسلی بخش ہوتی اور جن کے چند مہینوں یا زیادہ سے زیادہ ایک سال تک فارغ ہونے کا امکان ہوتا۔ وہ اپنے گھر کے کپڑے پہنتے تھے اور انہیں چھوٹا موٹا سامان بھی اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت تھی۔ لیکن کمروں میں چونکہ کوئی محفوظ جگہ نہیں تھی، وہ مجبور تھے کہ اپنا سامان ملازموں کے پاس رکھوائیں جو امریکی اداروں کی طرح، اکثر چوریاں کرتے رہتے تھے۔ انتہائی جھلستی ہوئی گرمیوں میں بھی وہ ہفتے میں صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ نہا سکتے تھے۔ کتنی بڑی مصیبت تھی۔ ان کا علاج بجلی کے جھٹکوں یا سکون آور دواؤں سے کیا جاتا تھا۔ جو لوگ ملیریا، پیچش، ٹائیفائڈ، تپ دق وغیرہ میں مبتلا ہو جاتے انہیں متعلقہ دوائیں دی جاتی تھیں۔ گرمی میں بجلی کے پنکھوں کا انتظام نہیں تھا اور سردی میں ان کے پاس گرم کپڑے اور مناسب بستر نہیں ہوتے تھے۔ انہیں سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا۔ ان میں سے اکثریت دیہاتی عورتوں اور لڑکیوں کی ہے جو انتہائی سادہ، غریب اور ناخواندہ ہیں۔ وہ کبھی کوئی شکایت نہیں کرتیں۔ دوسری عمارت دیرینہ مریضوں کے لیے ہے۔ میرا مطلب ہے جو کئی سالوں سے ذہنی بیماریوں میں مبتلا ہیں اور جن کے بارے میں زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ زندہ اس ادارے سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ ان میں زیادہ تر مریضوں کے الگ

Marfat.com

الگ سیل ہیں جو جیلوں کے سیل سے مختلف نہیں ہیں اور ان میں رہنا ذلت کی انتہا ہے۔

مہینے میں ایک بار "وزیٹرز کمپنی" کا اجلاس ہوتا ہے جس میں ڈاکٹر رشید کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ کن مریضوں کو رہا کیا جا سکتا ہے۔ وہ سرکاری اور پرائیویٹ مریض جنہیں ان کے گھر والوں نے داخل کروایا ہو، اس کمیٹی کے متفقہ فیصلے پر ہی رہا ہو سکتے ہیں، اور کمیٹی کا اجلاس ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو منعقد ہوتا ہے۔ وہ پرائیویٹ مریض جو رضا کارانہ طور پر خود اپنی مرضی سے داخل ہوئے ہوں۔ ڈاکٹر رشید کی سفارش پر کسی بھی وقت رہا کیے جا سکتے ہیں۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو تمام دیرینہ اور پیچیدہ مریض اپنے سیلوں سے باہر نکال کر ایڈمشن آفس میں لائے جاتے ہیں جہاں ڈاکٹر رشید اور ڈاکٹر سعیدہ ان کا جسمانی معائنہ کرتے ہیں۔ ان مریضوں کو دیکھنے سے دل بیٹھتا ہے۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ ان کے سروں میں جوئیں نہ پڑ جائیں ان کے سر مونڈ دیے جاتے ہیں۔ وہ ننگے تو نہیں ہوتے لیکن ان کے تن پر چیتھڑوں کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ ملازم انہیں ایک ایک کر کے ڈاکٹر کے دفتر میں لے جاتا ہے جہاں ان کا معائنہ کیا جاتا ہے خاص طور پر تپ دق کی علامات کے لیے جو یہاں عام ہے۔ وہ ایک ایک کر کے سکیل پر کھڑے ہوتے ہیں۔ اکثر مریض نوے پاؤنڈ سے زیادہ نہیں ہوتے۔ کچھ تو ستر پاؤنڈ یا اس سے بھی کم ہوتے ہیں۔ جن کی جسمانی حالت بہت ہی کمزور ہو، انہیں دودھ اور اچھا کھانا دیا جاتا ہے۔

سرکاری مریضوں کی اکثریت کچھ نہیں کرتی۔ وہ بستروں میں پڑے رہتے ہیں۔ باہر نکل کر زمین پر بیٹھے رہتے ہیں یا مدہوشی کی سی حالت میں ادھر ادھر گھومتے رہتے ہیں۔ جن کی صحت بحال ہو رہی ہوتی ہے، پیشہ ورانہ تھراپی کے لیے جاتے ہیں جو لازمی نہیں ہے لیکن جو لوگ اس مشغلے میں مصروف ہوتے ہیں، بڑے خوبصورت شاہکار تخلیق کرتے ہیں۔ کچھ اور روبصحت رہائشی زمین پر بیٹھے قرآن پڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ نماز بھی پڑھتے ہیں۔

امریکی اداروں کے برعکس، جہاں ملاقاتوں پر سخت پابندی ہے، یہاں پاکستان

Marfat.com

میں، جہاں خاندانی بندھن بہت مضبوط ہیں، قریبی رشتہ داروں کو کسی بھی وقت آنے کی اجازت ہے اور وہ جتنا وقت چاہیں، مریضوں کے ساتھ گزار سکتے ہیں۔ زیادہ تر ملاقاتی صبح کے وقت آتے ہیں اور پورا میدان رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس لوگوں سے بھرا ہوتا ہے۔ کسی تہوار کا سا سماں ہوتا ہے۔ جن مریضوں کے خاندان قریب ہوتے ہیں، وہ روزانہ ملاقات کے لیے آتے ہیں۔ جن مریضوں کے ملاقاتی نہیں آتے یہ وہ مریض ہوتے ہیں جو ذہنی طور پر بہت زیادہ معذور ہوتے ہیں اور کافی عرصے سے یہاں ہیں یا وہ جن کے دوست احباب بہت دور رہتے ہیں۔

ہم پرائیویٹ مریضوں کے کوارٹر الگ ہیں لیکن سرکاری مریضوں اور ان کوارٹروں کے بیچ کوئی دیوار نہیں ہے۔ سرکاری مریض یہاں کی سہولتیں دیکھ کر احساس محرومی کا شکار ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کوارٹروں میں جا کر چوری چکاری بھی کرتے رہتے ہیں اور پرائیویٹ مریض اکثر اپنی چیزیں چوری ہونے کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔ چاہے وہ کتنے ہی قفل لگا کر رکھیں، ان کی چیزیں محفوظ نہیں رہتیں۔ مجھے چونکہ بہت زیادہ مراعات حاصل ہیں اور آیائیں مستقل میری خدمت پر مامور ہیں، مجھے اس طرح کی کوئی شکایت نہیں، سوائے اس کے کہ میری وہ نیلی ریشمی شلوار قمیص جو پتو کی میں عید کے موقع پر آپا نے میرے لیے خاص طور پر بنائی تھی، چوری ہوگئی ہے اور مجھے اس کا بڑا دکھ ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ چوری میری کسی آیا نے کی ہے لیکن چونکہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ کس آیا نے چرائی ہے اور میرے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے تو صبر کے سوا کوئی اور چارہ نہیں۔ زیادہ تر پرائیویٹ مریض دو دو یا تین تین، ایک کمرے میں رہتے ہیں اور چونکہ ان کے پاس سامان وغیرہ نہیں ہوتا تو ان کے کمرے، تارک الدنیا راہبوں کی رہائش گاہیں معلوم ہوتی ہیں۔ تاہم کچھ مریضوں کے پاس ریڈیو ہیں۔ میں چاہوں تو ریڈیو خرید سکتی ہوں لیکن مجھے یہ پسند ہی نہیں۔

پرائیویٹ وارڈ میں ایک مریض کو ڈھائی سو روپے ماہانہ ادا کرنے ہوتے ہیں۔ بہت امیر لوگ ہی یہ مصارف برداشت کر سکتے ہیں تو اس طرح مجھے یہاں اعلیٰ سوسائٹی

Marfat.com

کے لوگوں کی رفاقت حاصل ہے۔ کہ زیادہ تر مریضائیں متمول کاروباری لوگوں یا بڑے بڑے زمینداروں کی بیٹیاں ہیں۔ وہ بڑی تہذیب یافتہ اور پڑھی لکھی ہیں۔ سترہ سال کی ایک خوبصورت لڑکی نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس زہر سے بھری چھوٹی چھوٹی خوبصورت بوتلیں تھیں، "بس میں نے انہیں چکھا تھا" ۔ یہاں آنے کی یہی وجہ ہے۔ اسی کی عمر کی ایک اور لڑکی ہے جو موٹی ہے اور نک سک سے بھی درست نہیں، اسے بری طرح مرگی کے دورے پڑتے ہیں۔ پھر پینتیس سال کی سعدیہ ہے جو چار بچوں کی ماں ہے۔ وہ پندرہ برس سے ذہنی مریض ہے۔ وہ کبھی سکول نہیں گئی لیکن اس کے شوہر نے انگلینڈ میں تعلیم حاصل کی اور اس کے ساتھ رہ رہ کر اسے بھی انگریزی آ گئی ہے۔ وہ عمدہ لہجے میں انگریزی بولتی ہے۔ مجھ سے بہتر۔ اس نے بتایا کہ وہ پانچ سال لندن کے ذہنی امراض کے ادارے میں رہی۔ اس نے بتایا کہ اس کی کڑی نگرانی کی جاتی تھی کیونکہ وہ کئی مرتبہ خودکشی کی کوشش کر چکی تھی۔ یہاں بھی وہ واحد مریضہ ہے جس نے بہادری کا مظاہرہ کیا۔ ایک دن وہ بیرونی دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہوگئی لیکن آزادی کی طرف چھلانگ لگاتے ہوئے وہ اپنا ٹخنہ توڑ بیٹھی۔ جب سے وہ بستر پر پڑی رہتی ہے اور سارا دن ریڈیو سنتی ہے۔ یہاں کی سب سے پرانی مریضہ ڈھاکہ کی اداس آنکھوں، بھورے بالوں والی ایک خاتون ہے جو کبھی یونیورسٹی کی روشن دماغ پروفیسر تھی۔ اس کے محبوب شوہر کی اچانک وفات سے اسے اتنا گہرا صدمہ پہنچا کہ وہ افسردگی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئی۔ وہ انتہائی کمزور ہوگئی ہے لیکن کھاتی کچھ نہیں۔ وہ مردہ دلی سے اپنے بستر پر بیٹھی رہتی ہے، کوئی بات نہیں کرتی۔ بس خالی نظروں سے فرش کو تکتی رہتی ہے۔ وہ واحد خاتون ہے جو ساڑھی پہنتی ہے۔ چونکہ اس کے سارے رشتہ دار اور دوست دور مشرقی پاکستان میں رہتے ہیں، اسے کوئی ملنے نہیں آتا۔ میرے ساتھ والے کمرے میں پنجاب کے ایک بڑے زمیندار کی بیٹی ہے۔ وہ ذہنی طور پر معذور نہیں ہے بلکہ نشہ آور اشیاء کی عادی ہے اور اسی کے علاج کے لیے یہاں آئی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا کوئی بڑا آپریشن ہوا تھا اور درد کم کرنے کے لیے اسے پیتھاڈین دی جاتی رہی۔ یہ کوئی

Marfat.com

بہت ہی خوفناک دوا ہوگی کیونکہ زیادہ تر مریض پیتھاڈین کے ہی عادی ہیں۔ پیتھاڈین کا نشہ مارفین کے نشے جیسا ہے لیکن اس کے باوجود پاکستان کے تمام ہسپتالوں میں آپریشن کے بعد یہی دوا استعمال کروائی جاتی ہے۔آپ اس لڑکی کو دیکھیں تو حیران رہ جائیں۔ بمشکل بیس سال کی ہوگی لیکن نری ہڈیوں کا ڈھانچہ۔اس کی ٹانگوں اور بازوؤں پر پیپ بھرے زخم ہیں۔

پیتھاڈین کی ایک اور نشئی ایک متکبر نواب کی بیٹی ہے۔نواب صاحب لاکھوں نہیں، کروڑوں کے مالک ہیں۔ان کے پاس اتنی دولت ہے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا وہ اس کا کیا کریں۔لڑکی نے مجھے بتایا کہ وہ صرف بارہ سال کی تھی جب اس کی شادی کر دی گئی۔نوکروں کی ایک فوج ظفر موج تھی۔ اس کے تین بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ایک آیا تھی۔اس نے اپنی زندگی کی جو کہانی مجھے سنائی، وہ الف لیلہ کی کوئی داستان لگتی تھی۔ وہ اتنے امیر ہیں کہ بقول اس کے، ان کے مربعوں پر دس ہزار بھینسیں اور ہزاروں بھیڑ بکریاں ہیں۔ ان کی ضرورت کا سارا گوشت، دودھ اور سبزیاں ان کے مربعوں سے آتی ہیں۔ اس نے بڑے فخر سے بتایا، "میرے انکل امریکہ میں پڑھے ہیں۔ ان کی تیس بیویاں ہیں۔" حیرت سے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، "تیس؟ لیکن ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا تو یہ کہنا ہے کہ ایک شخص چار سے زائد بیویاں نہیں رکھ سکتا۔"

اس نے اپنے نازک شانے اچکائے اور بولی" میرے انکل بادشاہ ہیں۔انہیں کون روک سکتا ہے؟"

ایک اور مریضہ گداز جسم کی موٹی تازی خاتون ہے۔اس کے گال گلابی اور بال سیاہ گھنگھریالے ہیں۔اس کے مطابق اس کی عمر چالیس سال کے قریب ہے۔ڈھاکہ والی خاتون اور دوسری مریضاؤں کے برعکس، جو اپنے دکھوں میں مبتلا ہیں اور انہیں اپنی کوئی پروا نہیں ہوتی، یہ خاتون ہمیشہ بنی ٹھنی رہتی ہے۔ یہ بالکل پاگل ہے اور کبھی بامعنی گفتگو نہیں کرتی۔ ڈاکٹر سعیدہ نے مجھے بتایا کہ وہ اس سے پہلے پانچ مرتبہ یہاں آچکی

Marfat.com

ہے اور جب رو بہ صحت ہوکر یہاں سے جاتی ہے تو سال کے اندر اندر اسے پھر کوئی دورہ پڑ جاتا ہے۔ اپنی بیماری سے پہلے وہ لاہور کی ایک ممتاز لیڈی ڈاکٹر تھی اور اس کی پریکٹس خوب چل رہی تھی۔ ذہنی مریضہ ہونے کا احساس بڑا ذلت آمیز اور شرمناک ہے۔ اس احساس سے نکلنے کے لیے، جب بھی ڈاکٹر رشید وارڈوں کا چکر لگاتے ہیں، یہ ان کے ساتھ ہو جاتی ہے اور کہتی ہے وہ ڈاکٹر رشید کی مددگار ہے۔

میرے ہمسایوں میں سب سے رنگین مزاج میری سہیلی سیف الدین رابرٹس ہے۔ وہ پاکستانی عیسائی ہے اور اس کا خاندان "ہائی انگلیکن چرچ" سے وابستہ ہے۔ وہ لمبی اور دبلی پتلی ہے۔ اپنے چمکدار، سیاہ لہراتے بالوں کے ساتھ وہ بڑی پُروقار لگتی ہے۔ اس کی جلد ملائم ہے اور آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہے۔ تیس سال کی عمر کے باوجود وہ بڑی حسین عورت ہے، اتنی حسین کہ اس نے عورتوں کے کئی رسائل کے لیے تصویریں اتروائیں اور پاکستان کی کئی فلموں میں کام کیا ہے۔ اس نے کئی دلچسپ مضامین بھی لکھے ہیں جو مقامی اردو اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس نے کئی نامور لوگوں کے انٹرویو بھی کیے جن کی تصویریں اس نے مجھے دکھائیں۔ اپنے تمام تر حسن، ذہانت اور صلاحیتوں کے باوجود وہ مخبوط الحواس ہے اور شاید ناقابل علاج۔ دس سال پہلے اس نے کسی انگریز سے شادی کی تھی لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکی اور چند ماہ بعد ہی ان میں علیحدگی ہوگئی۔ اس وقت وہ حاملہ تھی اور اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش کے بعد اس کا اعصابی نظام جواب دے گیا اور اسے لندن کے ذہنی امراض کے ادارے میں داخل کروا دیا گیا۔ جب بجلی کے جھٹکوں سے اس کی صحت بحال ہوئی تو اس کی والدہ اسے لاہور لے آئیں۔ کیونکہ وہ اپنے بچے کی پرورش نہیں کرسکتی تھی، اس لیے اس کی ماں نے یہ ذمہ داری سنبھال لی۔

بیچاری سیف الدین سوتے جاگتے اس مغالطے میں مبتلا رہتی ہے کہ اسے اور اس کے خاندان کو بلیک میل کیا جا رہا ہے۔ وہ بڑی تفصیل سے "بلیک میلر" کا نقشہ کھینچتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ اسے صاف نظر آتا ہے۔ اس کے بقول بلیک میلر کا نام علی رضا ہے۔ علی

Marfat.com

رضا اور اس کا مکار ملازم لاہور کے ریڈ لائٹ ایریا، ہیرا منڈی کی گلیوں میں رہتے ہیں۔علی رضا ایک قحبہ خانہ چلاتا ہے اور اتنا کمینہ ہے کہ اپنی بیوی اور بیٹی کو بھی "گاہکوں" کو پیش کر دیتا ہے۔ اس کے بقول، علی رضا کی بیوی نیم پاکستانی، نیم انگریز ہے اور ہمیشہ مغربی طرز کا لباس پہنتی ہے۔اس کی بارہ سالہ بیٹی بہت موٹی اور بدصورت ہے اور اس کا چہرہ کیل مہاسوں سے بھرا رہتا ہے۔ بے چاری سیف الدین ہر وقت کاغذوں کو کاٹ کاٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بناتی ہے اور ان پر اپنی خوبصورت ہینڈ رائٹنگ میں بلیک میلر کو رقعے لکھتی رہتی ہے۔اس کا کہنا ہے کہ بلیک میلر کی شرارتوں سے محفوظ رہنے کے لیے اسے بہت اچھا وکیل کرنا پڑے گا اور اس نے اے کے بروہی کا انتخاب کر رکھا ہے جن کا شمار پاکستان کے بہترین وکیلوں میں ہوتا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ اے کے بروہی کو یہ پتہ بھی نہ ہو کہ سیف الدین کون ہے، کہاں ہے لیکن وہ اس کے دماغ پر چھائے رہتے ہیں اور وہ روزانہ انہیں تقریباً ایک درجن خط لکھتی ہے جن میں یہ درخواست ہوتی ہے کہ وہ اسے، اس کی والدہ اور بیٹے کو بلیک میلر سے بچائیں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ اس کے خط کبھی اپنی منزل مقصود پر نہیں پہنچتے، ڈاکٹر رشید اس سے خط لے لیتے ہیں لیکن ان میں محض بکواس ہوتی ہے، اس لیے وہ انہیں ایک فائل میں رکھ چھوڑتے ہیں۔سیف الدین کو اس بات کا پتہ نہیں اور وہ مسلسل خط لکھتی رہتی ہے۔ایک دفعہ میں نے ڈاکٹر رشید سے پوچھا کہ سیف جو کہانیاں سناتی رہتی ہے، ان میں کوئی حقیقت ہے۔انہوں نے بتایا کہ ہسپتال کی تحقیقات کے مطابق اس کی ساری کہانیاں من گھڑت اور فریب خیال ہیں۔پھر میں نے پوچھا کہ علی رضا کے نام کا کوئی شخص اس کا خاندان ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہسپتال کی تحقیقات کے دوران میں علی رضا نام کا ایک شخص سامنے آیا تھا لیکن وہ اور اس کے خاندان والے معمولی لوگ ہیں اور اس بیان سے مطابقت نہیں رکھتے جو سیف دیتی رہتی ہے۔

میں جب سے یہاں آئی ہوں، سیف الدین میری مستقل ساتھی ہے کیونکہ اپنے تمام تر خیالی مغالطوں کے باوجود وہ دلچسپ خاتون ہے جبکہ دوسرے مریض کند ذہن

Marfat.com

اور چڑچڑے ہیں۔ ایک دفعہ آپ اسے اس کے مغالطوں سے نکال لیں تو وہ ہر موضوع پر بڑی ذہانت سے عقل کی باتیں کرتی ہے۔ آپ کو شبہ بھی نہیں ہوگا کہ اس میں کوئی خرابی ہے۔ وہ بہت مذہبی ہے۔ اپنی تسبیح اور کیتھولک عیسائی درویشوں کی تصویریں ہمیشہ اپنے پاس رکھتی ہے۔ زیادہ تر وقت بائبل پڑھنے میں گزارتی ہے۔

ڈاکٹر رشید نے مجھے بتایا ہے کہ چند دنوں میں سیف الدین کی والدہ اسے لے جائیں گی کیونکہ بجلی کے جھٹکے اس کی ذہنی صحت کی مستقل بحالی میں ناکام ہو گئے ہیں اور اب وہ اس کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ سیف الدین کہتی ہے کہ اس کا آدھا دماغ خالی ہے، بجلی کے جھٹکوں نے میرا دماغ تباہ کر دیا ہے، میرا آدھا دماغ پگھل گیا ہے۔ اب میں لندن جانا چاہتی ہوں اور اپنا بیٹا ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ مگر وہ لاہور کے بہترین کانونٹ سکول میں پڑھ رہا ہے، اسے پاکستان میں رہنا پسند نہیں، وہ صرف لندن جانا چاہتا ہے۔ مریم! میں لندن جا کر ہارلے سٹریٹ کے کسی اچھے ڈاکٹر سے ملوں گی اور اپنے دماغ کا معائنہ کرواؤں گی۔"

اب میں اپنی کہانی کی طرف آتی ہوں۔ پچھلے مہینے کے وسط سے، جب سے میں یہاں آئی ہوں، جون کے شروع تک، میں اپنے مقدر پر قانع اور مطمئن تھی۔ میرے یہاں داخلے کے کئی دن بعد مولانا مودودی اور ان کی بیگم حج کے لیے مکہ، مدینہ چلے گئے تھے۔ یہ خبر سن کر میرا دل بہت دکھی ہوا کیونکہ پتو کی روانگی کے وقت بیگم مودودی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ حج پر جانے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں اور جب بھی وہ گئے مجھے ساتھ لے کر جائیں گے۔ اپنے خیالات میں گم، میں اپنے بستر پر بیٹھی سوچتی ہوں کہ اگر حالات مختلف ہوتے تو اس وقت میں حج ادا کر رہی ہوتی۔

مئی کے آخر میں مولانا مودودی کی سعودی عرب سے واپسی ہوئی تو وہ میاں طفیل محمد اور ایک اجنبی شخص کے ساتھ مجھے ملنے آئے۔ اس اجنبی کا تعارف محمد یوسف خان کے نام سے کروایا گیا۔ وہ طویل قامت، گوری چٹی رنگت کا غیر معمولی وجیہ شخص تھا جس کی لمبی، گھنی اور سیاہ داڑھی تھی۔ میں نے انہیں نہیں پہچانا لیکن ان کا کہنا تھا کہ پتو کی

Marfat.com

جانے سے پہلے ان کے گھر میں ایک ٹی پارٹی پر میری ان سے ملاقات ہو چکی ہے۔ مجھے کچھ یاد نہیں تھا اور میں نے انہیں اجنبی ہی سمجھا۔ اس طویل قامت، وجیہ اور باریش آدمی نے مجھ سے روزانہ ملنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی وہ دن میں دو بار بھی آیا کرتے۔ جب بھی آتے میرے لیے کافی سارے تحائف لے کر آتے۔ میں انہیں جس چیز کا بھی کہتی وہ حاضر کر دیتے۔ مجھے ہسپتال کے کھانے کی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ وہ روزانہ میرے لیے کھانے پینے کی وافر اشیاء لایا کرتے۔ وہ روزانہ میرے لیے مٹھائیاں اور شربت کی بوتلیں لایا کرتے جسے برف والے پانی میں ملایا جاتا تو بہترین مشروب تیار ہو جاتا۔ ان کے اس رویے سے میں ان کے بارے میں شک میں مبتلا ہو گئی، کیونکہ مجھے یقین تھا کہ ایک ایسے شخص کی طرف سے جسے میں بالکل نہیں جانتی تھی اور جو میرے لیے اجنبی تھا، میں ایسی مہربانیوں کی مستحق نہیں تھی۔

ایک صبح ایک شخص شہیر نیازی مجھ سے ملنے آیا۔ یہ وہی صحافی تھا جس سے میں نے پتوکی سے راطہ کیا تھا اس نے بتایا کہ اس نے بالآخر میرا پتہ چلا لیا تھا اور جیسے ہی پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں وہ بلا تاخیر کراچی سے یہاں آ گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ اور اس کی بیوی پتوکی گئے تھے۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ میں جا چکی ہوں۔ اس نے مجھے بتایا کہ میری جان سخت خطرے میں ہے۔ مولانا مودودی مجھے کسی دور دراز گاؤں میں بھیج کر اذیتیں دے دے کر ہلاک کروا دیں گے۔ مجھے فوراً ان کی سرپرستی سے جان چھڑانی چاہیے اس نے پیشکش کی کہ میں اس کے اور اس کی بیوی کے ساتھ اس وقت تک کراچی میں رہ سکتی ہوں جب تک خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو جانے کے قابل نہ ہو جاؤں۔ میں اس کی اس زبردست تجویز پر بڑی خوش ہوئی۔ اس کی کہانی چاہے جتنی بھی ناقابل اعتبار تھی، میں نے اس کے ایک ایک لفظ کو سچ جانا۔ شہیر نے مجھے کہا کہ میں فوراً اسے ایک تحریر لکھ کر دوں جس میں کہا گیا ہو کہ میں مولانا مودودی کی سرپرستی سے انکاری ہوں اور خود مختار طریقے سے کراچی میں رہنا چاہتی ہوں۔ میں نے فوری طور پر اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ شہیر نیازی نے وعدہ کیا کہ وہ دوسرے دن مجھے ہسپتال سے نکال لے

Marfat.com

گا۔ جوش میں مبتلا ہو کر میں نے اپنے سب جاننے والوں کو خط لکھنے شروع کر دیے اور انہیں بتایا کہ میں کیوں مولانا مودودی کی سرپرستی چھوڑ کر شہیر نیازی کے ساتھ فرار ہو رہی ہوں۔ ان میں سے زیادہ تر خط جو میں نے ڈاکٹر رشید کو دیے تھے، سنسر ہو گئے اور ظاہر ہے کہ سپردِ ڈاک نہیں کیے گئے۔ لیکن کچھ اور خط میں نے اپنی حماقت سے آیا کی معرفت باہر سے امریکی قونصل خانے بھجوا دیے۔

دوسری صبح شہیر نیازی نے مجھے ہدایت کی کہ میں اپنا سارا سامان پیک کر لوں۔ وہ مجھے ہسپتال سے نکال لے گا اور رات ہونے تک میں کراچی جانے والی ریل میں بیٹھی ہوں گی۔ میں بے صبری سے انتظار کرتی رہی لیکن جانے سارے عمل میں کہاں کیا خرابی ہوئی کہ شہیر نیازی مجھے ہسپتال سے رہائی نہ دلوا سکا۔ اس کے بعد کے چند دن میں نے نہایت افسردگی میں گزارے جب کہ شہیر نیازی دوبارہ آیا ہی نہیں۔

اس کے چند ہفتوں بعد مجھے آپ کے خط ملے جن میں آپ نے بتایا تھا کہ چونکہ میں نے مولانا مودودی کی سرپرستی میں رہنے سے انکار کر دیا ہے، امریکی قونصل خانہ مجھے پاکستان میں مزید قیام کی اجازت نہیں دے گا۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں اپنے پاس موجودہ ساری رقم استعمال کرتے ہوئے نیویارک کا جہاز کا ٹکٹ خریدوں اور اس کے بعد امریکی حکام مجھے نیویارک کے "ہڈسن ریور سٹیٹ" کے دماغی امراض کے ادارے میں داخل کروا دیں گے۔ آپ ہی نے مجھے بتایا تھا کہ امریکی قونصل خانے نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ شہیر نیازی ایک خطرناک آدمی تھا اور ایک صحافی کی حیثیت سے وہ بددیانتی کے لیے بدنام ہے۔ اسی لیے امریکی قونصل خانے نے اسے میرے بارے میں کسی قسم کی ذمہ داری دینے سے انکار کر دیا تھا۔ امی اور ابو! آپ نے اپنے پچھلے خط میں جو کچھ لکھا تھا، اسے پڑھ کر میں پاگل ہو گئی تھی۔ آپ نے لکھا تھا، "اگر تمہارے پاس امریکی کپڑے نہیں ہیں تو جینٹ سے مانگ لو اور مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد اپنے کپڑوں میں سے کوئی لباس تمہیں دے دے گی۔ ڈارلنگ، دو تین دنوں میں ہماری نیویارک کے ایئرپورٹ پر ملاقات ہو گی۔۔۔۔" اس پر میں نے سوچا کہ

Marfat.com

میرے والدین بھی میرے خلاف ہوگئے ہیں۔ میں نے آپ کو غصے بھرے خط لکھے تھے اور بتایا تھا کہ امریکہ واپسی اور اس ادارے میں داخلے سے جہاں میں 1958-1959ء میں رہی تھی، میری رہی سہی زندگی مکمل طور پر تباہ ہوجائے گی۔ میں نے آپ کو یاد دلایا تھا کہ میں مولانا کی پاکستان ہجرت کی پیش کش کبھی قبول نہ کرتی اگر امریکہ میں میری حالت مایوس کن نہ ہوتی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرے ساتھ زبردستی کی گئی تو الگ بات ہے ورنہ میں کسی قیمت پر امریکہ واپس نہیں آؤں گی۔

مجھے تب احساس ہوا کہ شہیر نیازی کس چکر میں تھا۔ میری واحد امید یہ تھی کہ مولانا مودودی مجھے معاف کردیں اور ایک مرتبہ پھر میری ذمہ داری قبول کرلیں۔ چنانچہ میں نے انہیں ایک خط لکھا کہ میں شہیر نیازی کے برے ارادے بھانپ گئی ہوں لیکن میری امریکہ واپسی کا مطلب مکمل تباہی ہوگا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا سو کیا، کیا وہ مجھے معاف کردیں گے؟ اگر وہ ایسا کریں تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ ان کی سرپرستی دوبارہ قبول کرلوں گی۔ اس کے بعد کئی دن اذیت میں گزرے، لیکن ایک رات میں ایک نرس سے بات چیت کر کے اپنے کمرے میں آئی تو میز پر شربت کی دو بوتلیں اور مٹھائی کا ایک بڑا ڈبہ رکھا تھا۔ میں نے سکھ کا سانس لیا، میری ساری تکلیف جاتی رہی کیونکہ میں نے اسے ایک اچھا شگون سمجھا۔ دوسرے دن ڈاکٹر رشید نے مجھے مولانا مودودی کا ایک خط دیا اور بتایا کہ مولانا نے انتہائی کٹھن اور دشوار حالات کے باوجود، محض انسانی ہمدردی کی بنیاد پر میرے لیے وہ سب کیا ہے جو ان کے بس میں تھا اور اب اگر میں ان کے خاندان کو تنگ نہ کروں، ان کے کام میں مداخلت کی کوشش نہ کروں اور اگر میں انہیں اپنا خیر خواہ سمجھوں تو وہ ماضی کی سب باتیں بھلا کر مجھے اپنی سرپرستی میں لینے کو تیار ہیں۔ ڈاکٹر رشید نے بتایا کہ جب میں ادارے سے فارغ ہونے لگوں تو وہ مجھے رہائش کے لیے الگ گھر لے دیں گے اور یہاں سے نکال لیں گے۔ میں نے شکریے کے ساتھ یہ شرائط قبول کرلیں۔

اس کے کچھ دیر بعد وہی باریش اجنبی مجھ سے ملنے آئے اور اس دفعہ صرف تحفے

Marfat.com

ہی نہیں لائے بلکہ اپنی بیوی، بہنیں اور چار بچے بھی ساتھ لائے اور مجھ سے ان کا تعارف کروایا۔ اس کے بعد وہ مجھے سیر کے لیے شالامار باغ، لارنس باغ، چڑیا گھر اور دوسرے تاریخی مقامات کی سیر کے لیے بھی لے جاتے رہے۔ ایک دن جب وہ مجھے اپنے گھر لے گئے تو مجھے فوراً یاد آ گیا کہ میں اس گھر میں آ چکی ہوں۔ میری دھندلی یادوں میں یہ واقعہ محفوظ تھا کہ میرے لاہور آنے کے بعد بیگم مودودی مجھے ایک ٹی پارٹی کے لیے یہاں لے کر آئی تھیں۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ مجھے یہ گھر بہت پسند آیا تھا اس لیے کہ یہ صحیح معنوں میں ایک پاکستانی گھرانہ تھا اور اس میں مغربی تہذیب کے کوئی اثرات نہیں تھے اور یہ کہ اس گھر کے لوگوں نے کبھی مولانا سے میری کوئی شکایت بھی نہیں کی تھی۔ اس اجنبی باریش شخص کی بوڑھی والدہ، بہنوں اور چھوٹے بھانجوں، بھتیجوں نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا اور میرا نام لے کر مجھے پکارا جبکہ مجھے ان میں سے کسی کا نام یاد نہیں تھا۔ پھر وہ روزانہ مجھے ڈنر پر اپنے یا اپنی بہنوں کے گھر لے جانے لگے جو قریب ہی رہتی تھیں۔ آخر ایک دن ہمت کر کے میں نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ وہ کون ہیں اور یہ سب کچھ میرے لیے کیوں کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ مولانا مودودی اپنے کام میں سخت مصروف رہتے ہیں اور ان کے پاس میری دیکھ بھال کے لیے وقت نہیں ہے، اس لیے یہ ذمہ داری انہوں نے مجھے سونپی ہوئی ہے۔

جولائی کے آخر میں، ہر سہ پہر کو انہوں نے مجھے اندرون شہر کے بازاروں میں شاپنگ کے لیے لے جانا شروع کر دیا اور وہ تمام چیزیں خریدنی شروع کر دیں جس کی گھر داری میں ضرورت پڑ سکتی ہے۔ مٹی کے تیل کا چولھا، لالٹین کہ بجلی جانے پر روشنی کے لیے استعمال ہو سکے، دیگچیاں، ڈوئیاں، ہر طرح کے کھانے کے برتن وغیرہ وغیرہ۔ میں نے پوچھا کہ ان سب چیزوں کی کیا ضرورت آ پڑی تو انہوں نے نرمی سے جواب دیا کہ اپنے گھر کے قریب ہی وہ میرے لیے ایک گھر کے کچھ کمرے کرائے پر لینے کی کوشش کر رہے ہیں جہاں میں آزادانہ رہ سکوں۔

چند دن پہلے وہ مجھے وہ گھر دکھانے لے گئے جہاں میں نے رہنا تھا۔ انہوں نے

Marfat.com

مجھے میرا کمرہ دکھایا۔ اس میں میری اپنی چارپائی تھی، بالکل نئی۔ بجلی کا نیا پنکھا، کپڑے رکھنے کے لیے ٹین کے بکس اور ہر وہ چیز جس کی مجھے ضرورت ہو سکتی تھی۔ پھر وہ مجھے نیچے مکان کی مالکہ سے ملانے لے گئے۔ انہوں نے مسز عثمانی کے نام سے اپنا تعارف کروایا۔ مجھے وہ دیکھتے ہی اچھی لگیں، اس وجہ سے نہیں کہ وہ پڑھی لکھی تھیں اور بہت اچھی انگریزی بولتی تھیں بلکہ اس لیے کہ وہ سختی سے پردے کی پابند مسلمان خاتون تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ صبح کو مقامی ہائی سکولوں کی انسپکٹریس کے طور پر سرکاری ملازمت کرتی ہیں لیکن دوپہر کو گھرداری اور اپنے چار بچوں کی دیکھ بھال کے لیے واپس آجاتی ہیں۔ ہم بہت جلد سہیلیاں بن گئیں۔

کل دوپہر میں ہسپتال سے فارغ ہو گئی تھی۔ آج ہفتہ ہے۔ محمد یوسف خان مولانا کی ہدایت کے مطابق میرا بڑا خیال رکھتے ہیں ان کی غیر موجودگی میں اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت پڑے تو مسز عثمانی موجود ہیں جو میرے ساتھ بہت اچھی ہیں۔ اگر میں کبھی تنہائی محسوس کروں تو میں اپنا برقع پہنتی ہوں اور پانچ منٹ میں محمد یوسف خان کے گھر پہنچ جاتی ہوں جہاں مجھے ان کی بہنوں اور بھتیجیوں کی رفاقت مل جاتی ہے۔ بیگم مودودی نے تین دن بعد یعنی اس مہینے کی چھ تاریخ کو مجھے گھر بلایا ہے تاکہ میں ان سے اور بچوں سے دوبارہ مل سکوں۔ اس کے بارے میں تفصیل آئندہ خط میں لکھوں گی۔

میرے بارے میں فکر نہ کیجیے گا۔ آپ کو فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ طویل ڈراؤنا خواب ختم ہو چکا ہے اور میرا خیال ہے کہ اب میں ان شاء اللہ خوش رہوں گی۔

آپ کی محبت کرنے والی بیٹی

مریم

Marfat.com

سنت نگر لاہور سے پہلا خط

مریم جمیلہ
معرفت محمد یوسف خان
15/49 سنت نگر، لاہور-1
پاکستان
11 دسمبر 1963ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
49- کیلے ڈی لاسینیا
پاما ڈی مالورکا، میجورکا
سپین

پیاری امی اور ابو!

اب جب کہ آپ امریکہ کو چھوڑ کر سپین میں ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں جہاں موسم معتدل ہے اور پنشن کے لحاظ سے رہنے سہنے کے اخراجات کم، تو آپ کو میری شادی کی خبر سن کر یقیناً حیرت ہوگی۔ میرا خیال ہے آپ کو یہ امید ہی نہیں ہوگی کہ میں شادی کرلوں گی۔ سچ بتاؤں تو مجھے خود بھی اس کی امید نہیں تھی۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تفصیل سے بتاؤں کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔

میں جب ذہنی امراض کے ادارے سے فارغ ہوئی تو میں نے اپنے پچھلے خط کے آخر میں بتایا تھا کہ مجھے چھ اگست کو مولانا مودودی کے گھر مدعو کیا گیا تھا۔ تین بجے سہ پہر، روانگی سے آدھ گھنٹہ پہلے محمد یوسف خان تیار ہونے میں میری مدد کر رہے تھے کہ اچانک انہوں نے بے خیالی کے انداز میں مجھ سے پوچھا، "آپ مجھ سے شادی

Marfat.com

کریں گی؟"

فطری طور پر میں حیرت زدہ رہ گئی کیونکہ اپنی انتیس سالہ زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی ذمہ دار شخص نے سنجیدگی سے مجھے رشتے کی پیش کش کی ہو۔ انہوں نے اشتیاق بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر پوچھا، "مجھ سے شادی کریں گی؟" "لیکن۔۔۔۔لیکن" میں ہکلانے لگی۔ آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں جبکہ آپ شادی شدہ ہیں اور آپ کے چار بچے ہیں؟ آپ اپنی بیوی سے محبت کرتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہے؟"

"ہاں" یوسف نے سنجیدگی سے جواب دیا،" میں ان سے بہت محبت کرتا ہوں لیکن آپ جانتی ہیں کہ اسلام میں ایک شخص چار بیویاں رکھ سکتا ہے اور میں آپ سے بھی شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ جانتی ہیں کہ مولانا مودودی نے مجھے آپ کا خیال رکھنے کو کہا ہے۔ کوئی اور ایسا آدمی میسر نہیں جو آپ کا خیال رکھے۔ پڑوس والے کیا سوچیں گے جب وہ روزانہ مجھے اکیلے آپ کے کمرے میں داخل ہوتا دیکھیں گے؟ اخلاقی نقطہ نظر سے بھی نہ یہ میرے لیے بہتر ہے نہ آپ کے لیے۔ لیکن اگر آپ مجھ سے شادی کر لیں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ سب معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"لیکن آپ کا خاندان، آپ کی بیوی کا خاندان، وہ یقیناً آپ کی دوسری بیوی لانے پر اعتراض کریں گے۔"

"آپ اس کی فکر نہ کریں۔ یوسف نے سختی سے یقین دلایا،" وہ میری ذمہ داری ہے۔ اب بتائیں، مجھ سے شادی کریں گی؟"

میں اب بھی جھجک محسوس کر رہی تھی۔ میں نے جواب دیا،" اچھا! میں مولانا مودودی سے مشورہ کروں گی، اگر انہوں نے کہا کہ میں یہ رشتہ قبول کر لوں تو میں یقیناً یہ بات مان لوں گی۔"

میں نے بیگم مودودی اور بچوں کے ساتھ ایک خوشگوار دوپہر گزاری۔ پھر انہوں

Marfat.com

نے مجھے رات کے کھانے کے لیے رکنے کو کہا۔ ڈنر کے بعد، علیحدگی میں، میں نے مولانا مودودی سے مشورہ مانگا۔ انہوں نے بڑے پرزور انداز میں کہا،" آپ جانتی ہیں، ذہنی امراض کے ادارے میں داخلے کے بعد شادی کے معاملے میں آپ کی قدر بالکل ختم ہو چکی ہے۔ اب اگر ایک بہترین کردار کا شخص آپ کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار ہے تو یہ بڑی ہمدردی کی بات ہے۔ آپ انہیں انکار کیوں کرتی ہیں؟"

میں نے جب یہ گفتگو یوسف کو بتائی تو ان کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔" میں نے مولانا سے پوچھا تھا کہ آپ سے شادی کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے تو انہوں نے کہا تھا کہ میں کیوں انکار کر رہی ہوں؟ وہ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی اور آپ سے شادی کروں گی۔"

یوسف نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا،" مولانا بہت تھک گئے ہیں، ان کی صحت خراب ہے اور وہ کام کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ پچھلے سال انہیں آپ کے بارے میں سخت تشویش لاحق تھی۔"

دوسرے دن صبح ہی محمد یوسف خان نے عمل درآمد کرنے میں کوئی تاخیر نہیں کی۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں اپنا سیاہ برقع پہن کر اپنی چارپائی پر بیٹھوں اور صبر سے انتظار کروں۔ پھر وہ باہر چلے گئے اور کوئی ایک گھنٹے کے بعد دو تین باریش، پگڑی پوش افراد کے ساتھ واپس آئے۔ ان میں سے ایک ہماری قریبی مسجد کے امام تھے اور ایک مسز عثمانی کے اسّی سالہ والد، جنہوں نے مجھے بڑی صاف انگریزی میں بڑی تفصیل سے بتایا کہ وہ میرے وکیل ہوں گے۔ میں کئی گھنٹوں تک برقع میں ملبوس اپنی چارپائی پر خاموش بیٹھی رہی اور تینوں بوڑھے آدمی فرش پر بیٹھے بہت سی دستاویزات اور اردو اور عربی کے بہت سے کاغذات الٹ پلٹ کرتے رہے، پھر کوئی لفظ کہے بغیر وہ کمرے سے چلے گئے۔ یوسف نے وضاحت کی کہ سرکاری طور پر اس دن ہماری شادی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ پاکستان فیملی آرڈیننس کے نئے قانون کی وجہ سے کچھ پیچیدگیاں آڑے آ گئی تھیں۔ اس قانون کے تحت ایک سے زائد شادیاں کرنے پر سخت پابندیاں ہیں۔

Marfat.com

اس غیر اسلامی قانون کے مطابق دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کی اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریری اجازت ضروری ہے۔ پھر دوسری شادی کی وجوہات بیان کرنا ضروری ہے جن کے جائز، ناجائز ہونے کا فیصلہ مقامی عدالت کرتی ہے۔ یوسف نے بتایا کہ وہ ان غیر اسلامی قوانین کے اتنے خلاف ہیں کہ 1961ء کے مارشل لاء میں ان کی مخالفت کی پاداش میں انہوں نے نو ماہ قید با مشقت کاٹی۔ لیکن اب جب کہ یہ قوانین تمام علماء اور مذہبی سکالروں کی متفقہ مخالفت کے باوجود، عوام کی خواہشات کے خلاف ہوتے ہوئے بھی نافذ کر دیے گئے ہیں تو انہیں ان کے مطابق ہی چلنا تھا۔

دوسرے دن 8 اگست 1963ء کو یوسف مٹھائیوں سے بھرا ہوا ایک شاندار ٹوکرا لیے میرے کمرے میں آئے اور سرگوشی میں کہا، "جلدی سے برقع پہن لو۔" میں نے برقع پہن لیا۔ اس کے بعد وہی تین آدمی، اردو اور عربی کے کچھ کاغذات اٹھائے کمرے میں آئے۔ وہ فرش پر بیٹھ گئے اور جلدی جلدی انہوں نے بہت سے فارم پُر کیے۔ ان پر مسز عثمانی نے دستخط کیے، پھر امام صاحب نے، تیسرے نے انگوٹھا لگایا کیونکہ وہ ناخواندہ تھے۔ پھر امام صاحب نے حدیث کی ایک پرانی کتاب کھولی اور اس میں سے عربی کی کچھ عبارات پڑھیں:

"تمام زبانی، جسمانی اور مالی عبادتیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ اے نبی! آپ پر سلامتی ہو، ہم پر بھی سلامتی ہو اور اللہ کے تمام نیک بندوں پر۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ تمام تعریف اللہ کے لیے ہے۔ ہم اسی سے مدد مانگتے ہیں اور اسی سے معافی چاہتے ہیں اور اسی کی پناہ میں آتے ہیں اپنے اعمال کی برائیوں سے۔ جسے اللہ رہنمائی عطا فرمائے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جس کے نام سے تم ایک دوسرے سے تعلق قائم کرتے ہو۔ یقیناً اللہ تم پر زبردست نگران ہے۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچ بولو۔ وہ تمہارے اعمال کی اصلاح کر دے گا اور گناہوں

Marfat.com

کو معاف کر دے گا، اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی، اس نے عظیم کامیابی حاصل کر لی۔"

مجھے کہا گیا تھا کہ میں یہ الفاظ ان کے ساتھ ساتھ دہراتی جاؤں۔ یہ نکاح کی دعائیں ہیں جو ہر مسلمان کی شادی کے موقع پر پڑھی جاتی ہیں۔ اس وقت مجھے یہ تفصیل پتہ نہیں تھی۔ پھر مسز عثمانی کے والد صاحب نے مجھے نکاح نامہ کے کاغذات دے کر ان پر دستخط کرنے کو کہا۔ چونکہ یہ نکاح نامہ اردو میں تھا اس لیے میں نے بھی اردو میں دستخط کر دیے لیکن مجھے کہا گیا کہ میں انگریزی میں دستخط کروں۔ سادہ سی تقریب ختم ہوئی اور تینوں آدمی مجھے اور یوسف کو اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔

پھر انہوں نے بڑے اہتمام سے وضو کیا اور مجھے کہا کہ میں ان کے ساتھ دو رکعت نماز پڑھوں۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ تک بڑے خشوع وخضوع سے دعا مانگتے رہے اور پھر۔۔۔۔ ہم نے کھیلنا شروع کر دیا۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھے کہ میں بالکل سادہ ہوں اور مجھے ان باتوں کا کچھ علم نہ تھا۔۔۔ ہم ایک دوسرے کے منہ میں مٹھائی ٹھونستے رہے اور بچوں کی طرح کھیلتے رہے۔

اس کے بعد کئی روز تک یوسف کے قبیلے کے لوگ مجھے دیکھنے کے لیے آتے رہے۔ یوسف کی بہنیں اور بھتیجیاں تو بڑی خوش تھیں اور ان کا رویہ دوستانہ تھا لیکن کچھ اور لوگ ناراض تھے جیسے پہلی بیوی کی والدہ جنہوں نے بڑی سرد مہری کا رویہ اختیار کیا۔ وہ خاموشی سے مجھے گھورتی رہیں جیسے کہہ رہی ہوں "یوسف میری بیٹی کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟" یوسف روزانہ اپنی بیوی اور چار بچوں کو میرے پاس لاتے تھے تاکہ ہم ایک دوسرے سے مانوس ہو جائیں۔ پہلی بیوی کا نام شفیقہ تھا۔ وہ میری ہم عمر تھیں لیکن سختیاں برداشت کرنے سے ان کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ پانچ بچے پیدا کرنے اور ایک کو اس کے بچپن میں کھونے کے بعد ان کا جسم پھول رہا تھا اور بے ڈول ہو گیا تھا اور وہ مجھ سے کہیں بڑی نظر آتی تھیں۔

شفیقہ کے ہاں میرے شوہر سے جو پانچ بچے پیدا ہوئے، ان کی تفصیل یہ ہے:

Marfat.com

عائشہ جو آٹھ مہینے کی ہو کر فوت ہو گئی۔ عمر فاروق جس کی عمر پانچ سال ہے، یہ چھوٹا تھا تو کافی بیمار رہا لیکن اب صحت مند ہے اور اس کی آنکھیں بڑی چمکدار ہیں۔ چھوٹا گول مٹول احمد فاروق، عمر چار سال۔ میرے شوہر کی رائے میں، وہ ان کے بچوں میں سب سے زیادہ ذہین ہے۔ دو سالہ محمد فاروق اس وقت پیدا ہوا جب اس کے والد جیل میں تھے۔ وہ میرے شوہر کا لاڈلا بیٹا ہے اور چاہے کتنی ہی رات گزر جائے وہ ان کے بغیر سوتا نہیں ہے۔ وہ چاہے آدھی رات کو گھر آئیں، وہ انہی کے بستر میں گھستا ہے۔ اور ایک سال کی ننھی حمیرا۔ سب بچے ایک جیسے لگتے ہیں۔ اگر شفیقہ انہیں صاف ستھرا رکھے تو وہ بڑے خوبصورت نظر آئیں۔ سب کی بڑی بڑی خوبصورت سیاہ آنکھیں ہیں سیدھے بھورے بال اور گوری چٹی رنگت، اور دلکش خدوخال۔ سارے باپ پر کم اور ماں پر زیادہ گئے ہیں۔ وہ بھی اپنے بچپن میں انہی جیسی ہوں گی۔ میرے شوہر کے دل میں مولانا مودودی کا اتنا احترام ہے کہ انہوں نے اپنے سارے بچوں کے نام، ان کے بچوں پر رکھے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ زیادہ نہ سہی ان کی اولاد اتنی ہی ہو جتنی مولانا کی۔ وہ خاندانی منصوبہ بندی کے سخت خلاف ہیں اور ہاتھ تنگ ہونے کے باوجود بڑا خاندان چاہتے ہیں۔ شفیقہ ان کے ساتھ تعاون کرتی ہیں اور ہر سال کسی کاکے یا کاکی کو جنم دیتی ہیں۔ کاکی پنجاب میں چھوٹی بچی کو اور کاکا چھوٹے بچے کو کہتے ہیں۔ میرے شوہر کو چھوٹے بچے بہت اچھے لگتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے ہیں اور وہ سب بھی ان سے پیار کرتے ہیں۔

میں جلد ہی گھر گئی۔ شادی کے دو ہفتوں بعد ہی مجھے الٹیاں آنے لگیں۔ حمل کی الٹیوں کو "صبح کی بیماری" کہتے ہیں۔ میرا معاملہ یہ تھا کہ الٹیاں صرف صبح تک محدود نہیں تھیں بلکہ سارا سارا دن آتی رہتی تھیں۔ چار مہینوں تک میرا یہ حال رہا کہ میں غذا کو دیکھ نہیں سکتی تھی۔ میری طبیعت سخت خراب رہی اور شروع کے مہینوں میں میں بستر سے لگی رہی لیکن میرے شوہر خوش تھے۔ انہیں جب پتہ چلا کہ شفیقہ بھی پیٹ سے ہے تو وہ اور زیادہ خوش ہوئے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میرے شوہر دونوں سے پورا پورا انصاف کرتے

Marfat.com

ہیں اور یکساں جانبداری برتتے ہیں۔

جب میری حالت قدرے بہتر ہوئی تو میں نے نیچے مسز عثمانی کے پاس جانا شروع کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں ان سے انگریزی میں روانی سے بات کرسکتی تھی اور مجھے وہ اعصابی دباؤ برداشت نہیں کرنا ہوتا تھا جو اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں دوسروں کو اپنی بات سمجھانے کے وقت درپیش ہوتا ہے۔ میں نے مسز عثمانی سے پوچھا کہ میں اپنے شوہر کو کیا کہہ کر پکارا کروں؟ انہوں نے مشورہ دیا کہ میں انہیں "خان صاحب" کہہ کر بلایا کروں، اور چونکہ میرے شوہر بھی اس سے مطمئن ہیں، میں انہیں "خان صاحب" کہہ کر ہی بلاتی ہوں۔

اب شاید آپ کو میرے شوہر کا خاندانی پس منظر جاننے کا تجسس ہوگا۔ میرے شوہر کا خیال ہے کہ ان کی عمر انتالیس سال ہوگی۔ باقی پاکستانیوں کی طرح انہیں بھی اپنی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ میرے شوہر کا خاندان پٹھانوں پر مشتمل ہے اور انہیں اس پر فخر ہے۔ اسی فخر کی وجہ سے وہ باہر شادیاں نہیں کرتے۔ ہمارا زیادہ تر میل جول اپنے خاندان تک ہی محدود ہے لیکن ہمیں کسی محرومی کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ یہ خاندان کافی وسیع ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی رشتہ دار آیا رہتا ہے اور رات یہیں بسر کرتا ہے۔

خان صاحب کے آباؤ اجداد کا تعلق افغانستان سے تھا لیکن تقسیم ہند کے وقت ان کا خاندان بھارت کے شہر جالندھر میں آباد تھا۔ مسلمان پٹھانوں کی بستی اکثریتی ہندوؤں اور سکھوں سے الگ تھی۔ میری بوڑھی ساس نے مجھے اس کی تفصیلات بتائی ہیں، "ہماری پٹھان برادری جالندھر کی جس گلی میں رہتی تھی، اس کا نام ہی "پٹھان گلی" پڑ گیا تھا۔ اس گلی اور باقی بستی کے درمیان ایک اونچی دیوار تھی۔ رات کو گلی کے دروازے بند کردیے جاتے تھے اور بغیر اجازت کوئی شخص گلی میں نہیں آسکتا تھا۔ میرے شوہر کے والد محمد امین خان بہت بڑے زمیندار تھے۔ خاندان خوشحال تھا اور وہ ایک کشادہ مکان میں رہتے تھے۔ اس وقت اگرچہ انگریزوں کی حکمرانی تھی لیکن مغربی تہذیب کے اثرات

Marfat.com

پٹھان گلی میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ میرے شوہر وہیں پیدا ہوئے اور ان کی پرورش خالص روایتی اسلامی ماحول میں ہوئی۔ میری ساس بڑی حسرت سے جالندھر کے ان پرانے دنوں کا ذکر کرتی ہیں جب ہر شخص بڑی دل جمعی سے اسلامی تعلیمات پر عمل کرتا تھا۔ سب لوگ پانچ وقت کی نماز پڑھتے تھے اور عورتیں سختی سے پردہ کرتی تھیں، اتنا سخت کہ آج کل کی نوجوان لڑکیاں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ ان دنوں بارہ سال کی لڑکی برقع اوڑھ لیتی تھی اور کوئی لڑکی اس سے پہلے ہی جوان ہو جاتی تو اسے پردے میں بٹھا دیا جاتا۔ میری بوڑھی ساس کبھی پیدل باہر نہیں گئیں۔ ان دنون رواج تھا کہ کسی معزز پٹھان خاتون نے کبھی کبھار کسی رشتہ دار سے ملنے جانا ہوتا تو نہ صرف وہ برقع پہنتی بلکہ اسے کہار ایک ڈولی میں بٹھا کر لے جاتے۔ جس کے چاروں طرف پردے لگے ہوتے۔ سخت پردے کے باوجود میرے شوہر کے خاندان میں کوئی لڑکی ناخواندہ نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے والد نے انہیں اعلیٰ تعلیم دلوائی ہے۔ میرے شوہر کی بہنوں کو انگریزی نہیں آتی لیکن ان کے لیے گھر پر اردو فارسی اور عربی پڑھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ میری بوڑھی ساس جن کی عمر اسّی برس ہوگی اور ان کی بہن جو ان سے دو سال چھوٹی ہیں، اردو اور عربی جانتی ہیں۔ وہ روزانہ باقاعدگی سے قرآن پڑھتی ہیں اور پھر اردو اخبار کا بڑی باریک بینی سے نہ صرف مطالعہ کیا جاتا ہے بلکہ اس کے بعد حالات حاضرہ پر بحث بھی ہوتی ہے۔ جالندھر میں انہوں نے خوشگوار زندگی بسر کی۔ ان کے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ اسلامی تعلیمات پر عمل کیا جاتا تھا اور خونی رشتوں کے مضبوط بندھن انہیں تحفظ فراہم کرتے تھے۔

تقسیم نے یہ سب حالات بدل دیے۔ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان خوفناک فسادات کی وجہ سے میرے شوہر کے خاندان کو اپنی جائیداد اور مال و متاع چھوڑ کر جانیں بچا کر بھاگنا پڑا۔ جب وہ بکھر گئے تو ان کے خاندان کا اتحاد بھی باقی نہ رہا۔ کچھ نے لاہور آ کر پناہ لی، کچھ ملتان جا بسے اور کچھ فیصل آباد چلے گئے۔ وہ تہی دامن تھے اور خالی ہاتھ۔ چاروں طرف مایوسیوں کے اندھیرے تھے۔ دوسری

Marfat.com

مریم جمیلہ اور یوسف خان کا گھرانہ ایک نظر میں

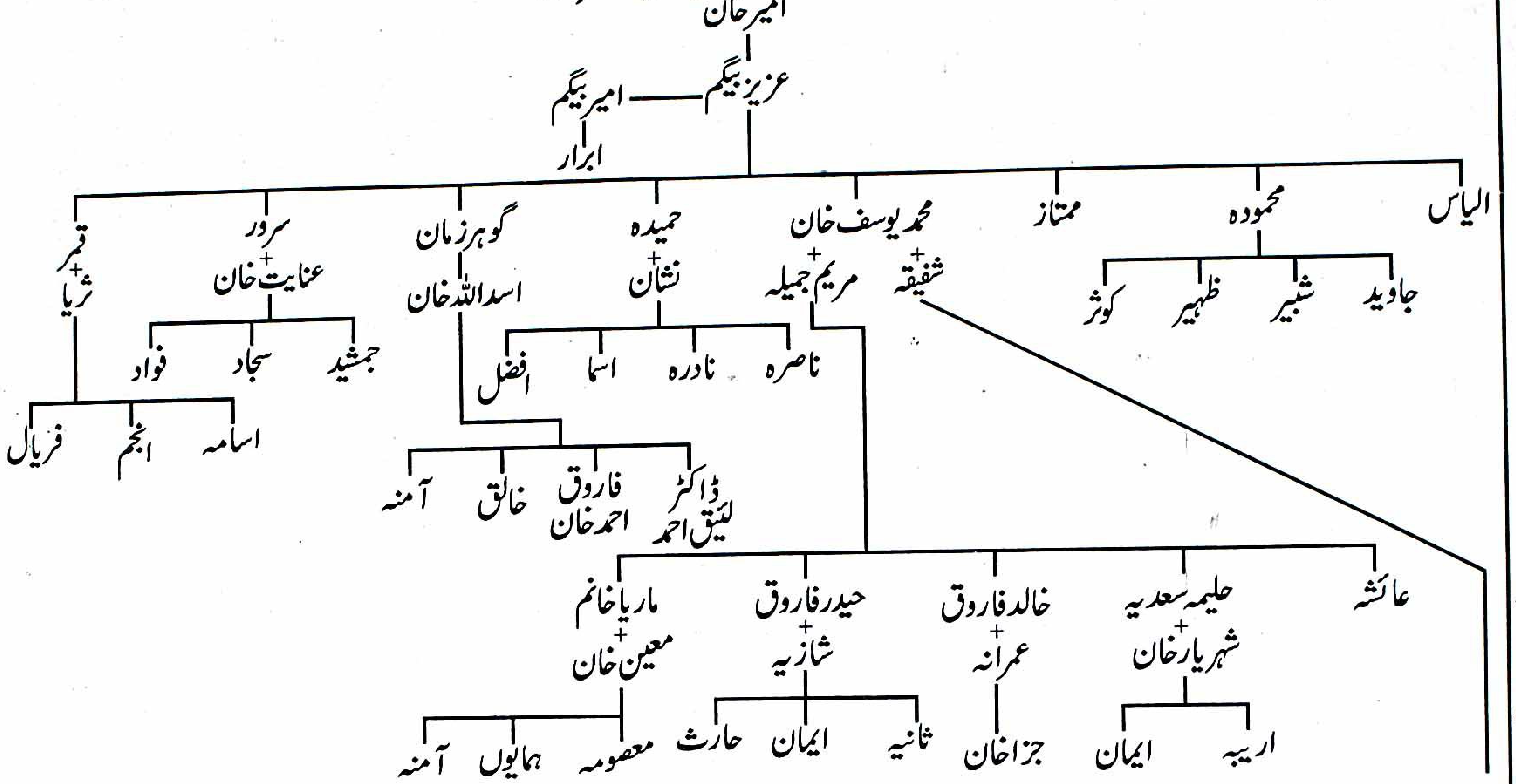

Marfat.com

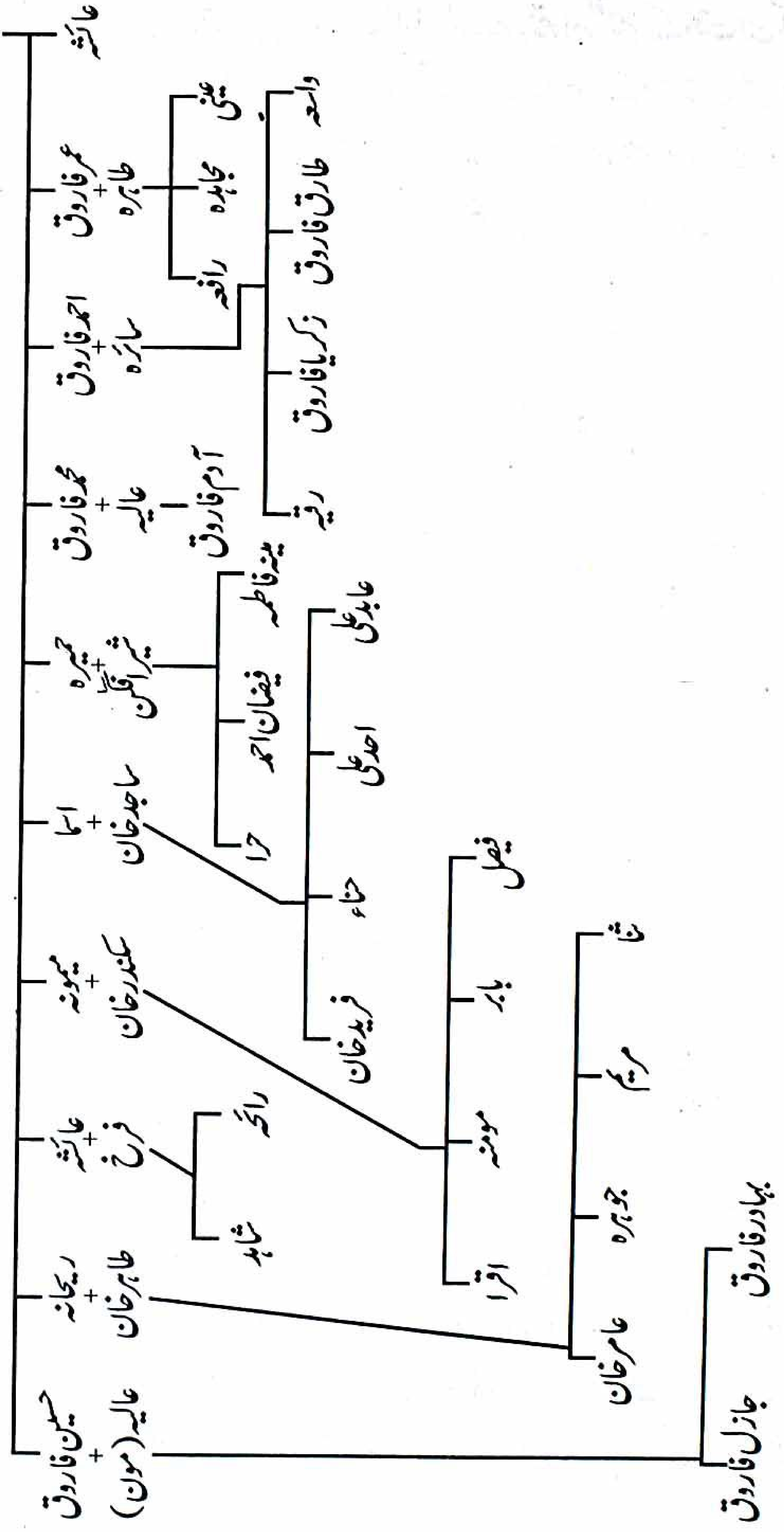
عائشہ
عمر فاروق + طاہرہ
عینی
مجاہدہ
رافعہ
احمد فاروق + سائرہ
واسعہ
طارق فاروق
زکریا فاروق
رقیہ
محمد فاروق + عالیہ
آدم فاروق
حمیرہ + میر افگن
یمنیٰ فاطمہ
فیضان احمد
حرا
اسما + ساجد خان
عابد علی
احمد علی
حناء
فرید خان
میمونہ + سکندر خان
فضل
بابر
مومنہ
اقرا
عائشہ + فرخ
شاہد
ریحانہ + طاہر خان
ثنا
مریم
جویریہ
عامر خان
حسین فاروق + عالیہ (مون)
بہادر فاروق
جازل فاروق

جنگ عظیم میں، میرے شوہر جاپانیوں کے خلاف لڑے تھے اور تقسیم کے وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ دو سو میل کا سفر طے کر کے وہ تھکے ماندے لاہور کے مضافات میں ایک مہاجر کیمپ میں پہنچے۔ گرچہ میرے شوہر صحت مند اور توانا تھے لیکن مہاجر کیمپ میں انہیں ملیریا، بخار اور پیچش نے آلیا۔ وہ ایک سال تک بیمار رہے۔ کئی سال بعد میرے شوہر کو ایک ایسی جگہ مل گئی جہاں وہ مستقل آباد ہو سکتے تھے۔ یہ کسی خوشحال ہندو خاندان کا چھوڑا ہوا وسیع لیکن بوسیدہ گھر تھا۔ میرے شوہر نے یہ گھر خالی پا کر اس پر دعویٰ کر دیا۔ آدھا ان کے خاندان کے پاس تھا اور باقی حصے میں درجنوں غریب خاندان آباد ہو گئے۔ جیسے پوری دنیا میں کچی آبادیوں کا حال ہے، جس گھر میں ایک خاندان آرام سے رہتا تھا، اس کے ہر کمرے میں ایک خاندان سما گیا۔ ایک سال بعد وہ ہندو خاندان جو تقسیم سے پہلے اس گھر میں رہتا تھا، اپنا گھر دیکھنے آئے۔ میرے شوہر نے بتایا کہ جب انہوں نے گھر کی حالت دیکھی جو کبھی بڑا خوبصورت تھا، تو وہ رو پڑے۔ میرے شوہر نے حسب استطاعت انہیں کچھ معاوضے کی پیشکش کی لیکن وہ دل شکستہ تھے اور افسردگی کے عالم میں واپس چلے گئے۔

تقسیم سے پہلے سنت نگر خالص ہندوؤں کی آبادی تھی لیکن اب سارے ہندو جا چکے ہیں۔ ان کے مندر گرا دیے گئے اور چاروں طرف مسجدیں اور مینار ہیں۔ اسی طرح جالندھر میں اب کوئی مسلمان نہیں بچا اور ہمارا خوبصورت گھر سکھوں کے قبضے میں ہے۔

1951ء میں میرے شوہر کی مولانا مودودی سے واقفیت ہوئی۔ احیائے اسلام کے لیے مولانا مودودی نے جو زبردست تحریک شروع کی تھی، میرے شوہر اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ وہ شوق سے جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے۔ مولانا بھی ان کے بے داغ کردار، راست بازی اور دیانت داری سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ جلد ہی جماعت کے ہمہ وقتی کارکن بن گئے۔ وہ جماعت کی حمایت میں نکلنے والے ایک اردو ہفت روزہ "شہاب" کے مینیجر بن گئے۔ 1954ء میں ان کے والد نے ان کی شادی

Marfat.com

ان کی چچا زاد شفیقہ سے کروا دی اور ان کے پے در پے بچے پیدا ہوئے۔ میرے شوہر اور شفیقہ کی شادی کے ایک سال بعد اکتوبر 1955ء میں مون سون کی غیر معمولی بارشوں کی وجہ سے دریائے راوی میں، جو لاہور کے قریب ہی بہتا ہے، زبردست سیلاب آ گیا اور اس کا پانی پورے شہر میں پھیل گیا۔ سنت نگر میں بھی دس دس فٹ پانی کھڑا تھا اور ہمارے آس پاس کا پورا علاقہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہمارے مکان کو تقسیم کے فسادات کے دوران میں بھی نقصان پہنچا تھا۔ اس سیلاب نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ شفیقہ نے مجھے بتایا کہ ان دنوں انہیں کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بھوک اور ٹائیفائڈ کی وجہ سے کئی لوگ ہلاک ہو گئے، ہزاروں گائیں بھینسیں ڈوب کر مر گئیں۔ ان دنوں خان صاحب کشتی پر جا کر کھانے پینے کی چیزیں لایا کرتے تھے۔

1958ء میں جب ہمارے صدر نے ملک میں مارشل لاء نافذ کیا تو تمام سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں لگا دی گئیں۔ لیکن میرے شوہر مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے کارکنان کی طرح بہادر اور نڈر تھے۔ جب قابل نفرت فیملی لاز آرڈیننس جس میں مقدس شریعت کی بہت سی دفعات تبدیل کر دی گئی تھیں، ملک کا قانون بنایا گیا تو جماعت نے ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں اسّی ممتاز علماء نے اپنے دستخطوں سے یہ اعلان کیا کہ یہ آرڈیننس اسلامی قانون کے خلاف ہے۔ میرے شوہر نے بلا خوف و خطر علماء کی اس تنقید کا پورا متن ہفت روزہ شہاب میں شائع کر دیا۔ یہ شمارہ پریس سے باہر آتے ہی سنسر ہو گیا اور حکومت کی طرف سے ضبط کر لیا گیا۔ میرے شوہر کو گرفتار کر کے نو ماہ قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ شفیقہ کے لیے یہ بڑی مصیبت کے دن تھے کہ آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ مجبور ہو کر اس نے گھر کا خرچ چلانے کے لیے اپنی سونے کی چوڑیاں ایک ایک کر کے بیچ دیں۔ اس کے باوجود کبھی کبھی انہیں فاقے سے رہنا پڑتا۔ جب خان صاحب جیل میں تھے تو محمد فاروق پیدا ہوا۔

میرے پاکستان آنے سے چند دن پہلے ہی میرے شوہر رہا ہوئے تھے۔ اپنی گرفتاری اور مارشل لاء کے نفاذ سے پہلے، جس کے دوران میں دوسری سیاسی جماعتوں

Marfat.com

کے ساتھ جماعت پر بھی پابندیاں لگا دی گئی تھیں، میرے شوہر مولانا مودودی کی کتابیں فروخت کرنے کا کاروبار کرتے تھے۔ چونکہ مولانا کی کتابیں کافی مقبول ہیں اور کئی کتابیں "بیسٹ سیلرز" ثابت ہوئیں، میرے شوہر کا کاروبار چمک اٹھا تھا، لیکن گرفتاری کے بعد قید بھی ہوئی، جرمانہ بھی اور سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا۔

جولائی 1962ء میں جب مارشل لاء اٹھا لیا گیا تو اس کے باوجود کہ جماعت کا بیت المال ضبط کر لیا گیا تھا، اس کے کارکنان اتنے مستعد اور فعال تھے کہ جماعت پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ بحال ہوئی۔ جماعت بڑے شوق سے عیدالاضحیٰ کا انتظار کرتی ہے۔ اس میں رُوحانی فوائد بھی ہیں اور مالی بھی۔ چونکہ جماعت کے بے شمار ہمدرد، قربانی کی کھالیں جماعت کو عطیہ کرتے ہیں اور ان کی آمدنی سے جماعت کے بہت سے خیراتی ادارے چلتے ہیں۔ جماعت اسلامی اور مصر کی اخوان المسلمون کی قیادت اگرچہ الگ الگ اور اپنے اپنے ملک میں خودمختار ہیں لیکن ان کے مقاصد ایک ہی ہیں۔ دونوں جماعتیں اپنے ملک میں معاشرے کی اصلاح اور ایک ایسی اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتی ہیں جس کی بنیاد اسلامی قوانین پر ہو۔ جماعت اسی لیے اخوان المسلمون کی طرح سیاست میں فعال ہے۔

آج کل مولانا مودودی شاہ سعود کے مہمان کی حیثیت سے سعودی عرب گئے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد سے وہ پندرہ مرتبہ سعودی عرب جا چکے ہیں۔ پاکستان اور سعودی عرب کے درمیان سفارتی تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔ سعودی عرب میں مولانا مودودی کو موقع ملا کہ وہ اخوان المسلمون کے کئی رہنماؤں سے مل سکیں۔ چند دن پہلے مجھے اور میرے شوہر کو اخوان کے پانچ افراد کی طرف سے ایک کارڈ وصول ہوا جس میں ہمیں شادی کی مبارکباد دی گئی تھی۔ مولانا مودودی نے انہیں ہمارے بارے میں بتایا ہوگا۔

امی ابو! آپ نے پوری دنیا کی سیاحت کا جو منصوبہ بنایا ہے، اس میں آپ اسرائیل جانے پر مصر کیوں ہیں؟ مجھے پتہ ہے کہ آپ صیہونیت اور اسرائیل سے بڑی

Marfat.com

ہمدردی رکھتے ہیں لیکن آپ کو پتہ ہونا چاہیے کہ آپ بیک وقت اسرائیل اور عرب ملکوں میں نہیں جا سکتے، کیونکہ عرب ملکوں نے اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا ہوا۔ آپ کو عرب ملکوں اور اسرائیل میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ آپ اپنا منصوبہ بدلتے کیوں نہیں؟ آپ عرب ملکوں کی سیاحت کیوں نہیں کرتے؟ مولانا مودودی وہاں کئی لوگوں کو جانتے ہیں اور وہ مجھے بھی جانتے ہیں۔ سعودی عرب کے بعد مولانا مودودی شام کو پسند کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہاں بہت اطمینان محسوس کرتے ہیں اور دمشق میں ہوں تو ایسے لگتا ہے جیسے لاہور میں ہیں۔ آپ اگر اسرائیل جانے کا ارادہ ترک کر دیں تو مولانا مودودی مصر اور شام میں کئی اخوانیوں کو جانتے ہیں۔ آپ اگر وہاں جائیں تو وہ اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکل کر آپ کا استقبال کریں گے اور آپ عربوں کی فیاضی اور میزبانی سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔

میں آپ کو جماعت کی سالانہ کانفرنس کے بارے میں بتانا بھول گئی۔ یہ 25 سے 28 اکتوبر تک لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس کے انتظامات کے سلسلے میں میرے شوہر صبح سے رات گئے تک کام کرتے تھے۔ اس اجتماع میں لاکھوں لوگوں کی شمولیت متوقع تھی۔ حکومت کی طرف سے اسے ناکام بنانے کے لیے لاؤڈ سپیکر کے استعمال پر پابندی لگا دی گئی لیکن مولانا نے ایک انوکھی ترکیب استعمال کی۔ انہوں نے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اپنے کارکن متعین کر دیے جو ان کی تقریر کو دہراتے تھے اور اس طرح سب لوگ ان کی تقریر سن سکتے تھے۔ جماعت کا پریس بھی ان کی تقریر کی ہزاروں کاپیاں چھاپنے میں مصروف تھا۔ طباعت کا کام ختم ہوتے ہی جماعت کے کارکنان مولانا کی تقریر پورے شہر میں تقسیم کر رہے تھے۔ میں کئی ہفتوں سے اس اجتماع کی منتظر تھی کیونکہ اس میں خواتین کے لیے بھی الگ انتظام کیا گیا تھا اور یہ بیگم مودودی اور ان کی سہیلیوں سے ملنے کا بھی بہترین موقع تھا۔ جس دن اجتماع شروع ہونا تھا، خان صاحب صبح سویرے یہ کہہ کر چلے گئے تھے کہ وہ ساڑھے نو بجے مجھے اور شفیقہ کو لینے آئیں گے۔ دس، گیارہ، پھر بارہ بج گئے لیکن ان کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ دوپہر کے وقت وہ واپس

Marfat.com

آئے تو ان کا چہرہ فق تھا۔ ہم فوراً سمجھ گئے کہ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔

مولانا مودودی نے تقریر شروع کی ہی تھی کہ حکومت کی طرف سے بھیجے ہوئے کئی غنڈے ایک ٹرک سے اترے اور انہوں نے چاروں طرف بھاگنا دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ اجتماع کے خیموں کو آگ لگا رہے تھے اور اجتماع کے سامعین پر بے دردی سے سوڈے کی بوتلیں پھینک رہے تھے۔ جماعت کے کارکنان نے بڑے حوصلے سے صورت حال کا مقابلہ کیا اور کسی ہیبت میں مبتلا ہوئے بغیر بڑے طریقے سے غنڈوں کو قابو میں کرلیا۔ لیکن مولانا کی تقریر کے دوران میں اچانک ایک غنڈے نے پستول نکالا اور مولانا کو نشانہ بناتے ہوئے تین گولیاں فائر کیں۔ اگرچہ مولانا مودودی کو کہا گیا کہ وہ کسی آڑ میں نیچے بیٹھ جائیں، لیکن وہ سکون سے کھڑے رہے اور بولے، "اگر میں بھی بیٹھ گیا تو پھر کھڑا کون رہے گا۔" وہ بلا خوف و خطر کھڑے رہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ غنڈے کا نشانہ چوک گیا اور مولانا مودودی محفوظ رہے۔ انہوں نے سامعین سے کہا کہ کوئی اپنی جگہ نہ چھوڑے، وہ تقریر مکمل کریں گے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس دوران میں پشاور کے پگڑی پوش قبائلی پٹھانوں نے جو مسلح تھے، مولانا کے گرد ایک حصار بنا لیا۔ اس دوران جماعت کے کارکن فائر کرنے والے غنڈے کا تعاقب کر رہے تھے۔ اس نے بھاگتے بھاگتے پھر اپنی پستول سے فائر کیا جس سے جماعت کا ایک کارکن شہید ہوگیا۔ میرے شوہر نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ پٹھان بڑے بہادر ہوتے ہیں اور میرے شوہر نے اس روایت کو قائم رکھا۔ دوسرے دن یہ ساری خبر میرے شوہر کی تصویر کے ساتھ لاہور کے ایک روزنامہ کوہستان میں شائع ہوئی۔

میرے شوہر اسی طرح کی گرمجوش زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن آئیں میں آپ کا تعارف ان خواتین سے کرواؤں جو میرے نئے خاندان سے متعلق ہیں۔

سب سے پہلے تو میری سوکن شفیقہ ہے۔ ابتدائی مہینوں میں وہ خان صاحب کی دوسری شادی پر اتنی ناراض تھیں کہ وہ پورے گھر میں کڑک مرغی کی طرح پھرتی تھیں۔

Marfat.com

بے جان، بے روح۔ کسی سے کوئی شکایت نہیں کرتی تھیں لیکن کھانا پینا چھوڑ رکھا تھا۔ خان صاحب مجھے کہا کرتے تھے،"شفیقہ نے تمہارے لیے بڑی قربانی دی ہے۔ تمہیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔" مجھے افسوس تو تھا لیکن ہماری بول چال بند تھی۔ میرے شوہر بہت اچھے ہیں اور دونوں پر یکساں مہربان۔ اب جب شفیقہ کو یہ احساس ہوا کہ اسے چھوڑا نہیں گیا تو آہستہ آہستہ ان کے چہرے پر رونق آنے لگی ہے۔ شفیقہ مکمل طور پر گھر کے کاموں اور بچوں میں منہمک رہتی ہیں کیونکہ ان کی کوئی اور دلچسپی یا مشغلہ نہیں ہے۔ وہ مکمل ناخواندہ نہیں ہیں، پرائمری سکول میں چوتھی پانچویں جماعت تک پڑھی ہوئی ہیں۔ امور خانہ داری میں اتنی مصروف رہتی ہیں کہ ان کے پاس کچھ پڑھنے کا وقت ہی نہیں۔ میں نے انہیں کبھی کسی کو خط لکھتے نہیں دیکھا، فیملی کے قریبی رشتہ داروں کو بھی نہیں۔ شفیقہ دو رسالے منگواتی ہیں" سیارہ" جو جماعت کا ادبی اور ثقافتی میگزین ہے اور "بتول" جو جماعت کی خواتین ونگ کا رسالہ ہے جس کی سربراہ بیگم مودودی ہیں۔ ایک پاکباز خاتون حمیدہ بیگم اس کی مدیر ہیں اور اپنے دل اور جسم پر ورم کی تکلیف کے باوجود بے تکان کام کرتی ہیں۔" بتول" شفیقہ کا پسندیدہ رسالہ ہے۔ وہ ہر مہینے ایک پوری دوپہر اسے الف سے ے تک اونچا اونچا پڑھ کر سب کو سناتی ہیں۔ بتول میں ایسے مضامین ہوتے ہیں جن میں اچھی مسلمان خواتین بننے کے لیے رہنمائی کی جاتی ہے۔ کبھی کبھی اس میں میرے مضامین کا ترجمہ بھی شائع ہوتا ہے۔

میرا کمرہ الگ ہے جس میں، میں نے اپنی کتابیں اور کاغذات رکھے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر عربی خطاطی کے نمونوں کے فریم سجے ہوئے ہیں۔ شفیقہ کا کمرہ چھوٹا ہے جس میں کوئی کھڑکی بھی نہیں۔ سورج کی شعاعیں اس کمرے تک نہیں پہنچتیں اور بجلی ہر وقت جلائے رکھنی پڑتی ہے لیکن اس کا ایک فائدہ بھی ہے، جھلتی گرمیوں کے موسم میں پورے گھر کا یہ ایک کمرہ بہت ٹھنڈا رہتا ہے۔

عید تہوار کے علاوہ ایک سے زیادہ ڈش نہیں بنتی اور وہ بھی دال کی یا چٹپٹی سبزیوں کی جسے ہم چپاتیوں کے ساتھ کھاتے ہیں۔ یہاں پنجاب میں جو سبزیاں ہمیں

Marfat.com

پسند ہیں، وہ امریکہ میں نہیں ملتیں۔ مثلاً شفیقہ کی پسندیدہ ڈش میتھی ہے جو سبز پتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ شفیقہ کی ایک اور پسندیدہ ڈش ساگ ہے۔ یہ امریکہ میں ملنے والی بند گوبھی کی طرح کی ایک سبزی ہے جو پنجابی لوگ، امیر ہوں یا غریب، خاص طور پر سردیوں میں بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ غریب لوگ پوری سردی عام طور پر ساگ اور میتھی پر ہی گزارہ کرتے ہیں کیونکہ ان میں بہت زیادہ وٹامن ہوتے ہیں اور یہ صحت کے لیے مفید ہیں۔ امریکی بچے سبزیوں کو ہاتھ تک نہیں لگاتے لیکن یہاں کے بچے سبزیاں شوق سے کھاتے ہیں اور ہل من مزید پکارتے رہتے ہیں۔ چاول عام طور پر شادی کے موقعوں پر نظر آتے ہیں یا اس وقت پکائے جاتے ہیں جب فیصل آباد یا ملتان سے کوئی خاص مہمان آیا ہوا ہو۔ گوشت ہم سال میں عید الاضحیٰ کے موقع پر سیر ہو کر کھاتے ہیں جب جانوروں کی قربانی دی جاتی ہے۔ گھی یہاں بہت مہنگا ہے اور ہماری دسترس سے باہر، چنانچہ ہم سبزیوں سے نکالے ہوئے تیل بناسپتی پر گزارہ کرتے ہیں۔ یہ دس پاؤنڈ کے ٹین کے ڈبوں میں ملتا ہے۔ دریائے راوی کے قریب ہمارے خاندان کی کچھ مشترکہ زمین ہے جہاں ہم نے ملازم رکھے ہوئے ہیں۔ وہاں اپنے استعمال کے لیے سبزیاں اگاتے ہیں جیسے گاجر، شلجم، بینگن، آلو، پیاز اور شاندار گوبھی کے پھول۔ ہم مولیاں بھی اگاتے ہیں اور کیا آپ یقین کریں گے کہ ہم اسے پکا کر کھاتے ہیں، نہ صرف اس کی جڑیں بلکہ اس کے پتے بھی۔ سردیوں میں کھانوں کے درمیانی وقفوں میں بھوک ستائے تو ہمارے پسندیدہ سنیک گنے ہیں۔ یہ دس دس فٹ لمبے ڈنڈوں کی شکل میں ہوتے ہیں اور ہم یہ کافی مقدار میں خرید لیتے ہیں۔ پھر میرے شوہر کے بھتیجے انہیں چھیل کر بارہ بارہ انچ کے ٹکڑوں میں کاٹ لیتے ہیں۔ یہ ٹکڑے تمام افراد میں تقسیم کر دیے جاتے ہیں جو انہیں چبا چبا کر اس کا میٹھا رس چوستے ہیں۔ بچوں کو یہ بہت پسند ہیں۔ سفید چینی کمیاب ہے اور راشن سے ملتی ہے لیکن اس کی خام شکل یعنی گنا اس کا بہترین نعم البدل ہے۔ سردیاں ہوں تو مہمانوں کی آمد پر انہیں چائے ضرور پیش کی جاتی ہے (ہم کافی کبھی نہیں پیتے)۔ گرمیوں میں کوکا کولا کی بوتلوں سے میزبانی کی جاتی ہے۔

Marfat.com

شفیقہ کی ملازمہ ستر سال کی ناٹے قد کی ایک بوڑھی خاتون ہے جو اپنے بڑھاپے کے باوجود بڑی چاق و چوبند اور پھرتیلی ہے۔ ہم احترام سے اسے مائی کہتے ہیں۔ جالندھر میں وہ شفیقہ کی نرس تھی۔ گویا ہمیشہ سے ہمارے ساتھ ہے۔ اس سے صفائی اور جھاڑو بہارو کے کام تو نہیں ہوتے لیکن کھانے پکانے اور بعد میں برتن دھونے کی ذمہ داری اسی پر ہے۔ وہ اتنے عرصے سے ہمارے ساتھ ہے کہ اب وہ گھر کا ایک فرد ہی بن گئی ہے۔ میرا مائی نے دس بچوں کو جنم دیا تھا لیکن صرف ایک بیٹا ہی زندہ بچا۔ ہم اس کے پوتے پوتیوں کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ اس کا بڑا بیٹا، جو اس کا بڑا لاڈلا ہے، آج کل تپ دق میں مبتلا ہے اور ہسپتال میں داخل۔ گھر کے چھوٹے موٹے کام کرنے پر ہم اس کے بچوں کو کھانا بھی دیتے ہیں اور کبھی کبھار کپڑے لتے بھی کہ ان کے اپنے ہاں ان کی گنجائش ہی نہیں۔

میرا مائی کے علاوہ ہم نے عیسائی جمعداروں کے ایک خاندان کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں جو ہمارے پاخانے صاف کرتے ہیں، فرش پر جھاڑو لگاتے ہیں اور کوڑا اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ ان کی ماں محتاج بی بی ہے جو اپنی عمر سے کہیں بوڑھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کا والد عام طور پر ننگے پاؤں رہتا ہے۔ ہم اس سے گھر کے باہر گلی صاف کرواتے ہیں یا اور بھاری کام لیتے ہیں۔ ان کی دو بیٹیاں ہیں، تیرہ سالہ ماجی اور گیارہ سالہ چیمہ۔ ماجی اور چیمہ ذہین ہیں لیکن کبھی سکول جا کر لکھنا پڑھنا نہیں سیکھیں گی بلکہ انہیں اپنے آبائی پیشے کی تربیت ہی دی جائے گی۔ سیاہ کالی جلد والے یہ عیسائی جمعدار اصل میں ہندو اچھوت تھے۔ معاشی دوڑ میں سب سے پیچھے ہیں۔ انہیں ہمارا گھر محل لگتا ہے اور ہماری غذا جو امریکی معیار کے حساب سے شاید کنجوسوں کا کھانا نظر آئے، ان کے نزدیک کسی پر تکلف ضیافت کا کھانا ہوتا ہے۔ یہ سب اس پر منحصر ہے کہ آپ اسے کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

میری ساس کی چھوٹی بہن کو پانچ سال پہلے دل کا دورہ پڑا تھا اور اب وہ کسی کی مدد کے بغیر چل پھر بھی نہیں سکتیں۔ اپنی فطری ضروریات کے لیے انہیں رات کو راہداری

Marfat.com

میں سونا پڑتا ہے۔ ٹوائلٹ بیرونی دروازے کے ساتھ ہے اور راہداری سے اس کا فاصلہ کم ہے۔ میری ساس اگرچہ چل پھر لیتی ہیں لیکن جوڑوں کے درد کی وجہ سے انہیں دشواری پیش آتی ہے۔ پھر ان کا جسم بھی کافی بھاری ہوگیا ہے۔ ان کا الگ کمرہ نہیں ہے۔ گرمیوں میں وہ صحن میں سوتی ہیں اور سردیوں میں شفیقہ کے کمرے کے باہر والی تنگ و تاریک راہداری میں۔ اپنا کمرہ نہ ہونے سے انہیں کافی مشکل کا سامنا ہے جب کہ جالندھر میں وہ کافی سہولتوں کی عادی تھیں۔ اب ان کے پاس کوئی مناسب جگہ نہیں جہاں وہ کپڑے بدل سکیں یا اپنا مختصر سامان رکھ سکیں اور جہاں انہیں تنہائی میسر ہو۔

میری ساس عزیز بیگم کے دس بچے ہوئے۔ ان میں سے دو فوت ہو گئے۔ ایک بچہ چھ مہینے کے حمل میں ضائع ہوا اور دوسرا تین سال کا ہو کر ٹائیفائڈ کے بخار سے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ان کے زندہ بچوں میں سب سے بڑا بیٹا الیاس ہے۔ اس کی عمر پینتالیس سال ہے۔ قد چھوٹا اور جسم بھاری ہے۔ وہ زیادہ تر خاموش رہتے ہیں اور اپنے آپ میں مگن۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ جائیداد کی خرید و خروخت کا کام کرتے ہیں اور اپنے موٹر سائیکل پر پورے لاہور میں گھومتے پھرتے ہیں۔ خاندانی روایات کے مطابق مجھے ان سے بھی پردہ کرنا ہوتا ہے۔ ان کی موجودگی میں، میں چہرہ پر نقاب تو نہیں لیتی لیکن ہم ایک دوسرے سے بات چیت نہیں کرتے۔ اگر میں مٹی کے تیل کے چولھے کے پاس پیڑھی پر بیٹھی کھانا کھا رہی ہوں اور وہ آ جائیں تو مجھ سے توقع کی جاتی ہے کہ میں ان کے احترام میں فوراً کھڑی ہو جاؤں، پیڑھی انہیں پیش کر دوں اور خود کہیں اور جا بیٹھوں۔ بڑا ہونے کے ناتے ان کا احترام لازم ہے۔ وہ پاکستان ٹائمز منگواتے ہیں۔ اب اگر میں اخبار پڑھ رہی ہوں اور وہ ناشتے کے لیے آ جائیں تو مجھے فوراً اخبار انہیں دینا ہوتا ہے کہ پہلے وہ پڑھ لیں۔

میرے شوہر کی سب سے بڑی بہن محمودہ ہیں جن کے چار بچے زندہ ہیں۔ انیس سالہ کوثر اور بیس بائیس برس کے ظہیر اور شبیر جو گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے ہیں۔ چھ سالہ جاوید گردوں کے مرض میں مبتلا ہے اور سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ وہ پٹھان نظر نہیں

Marfat.com

آتا بلکہ پنجابیوں کی طرح اس کا رنگ سانولا ہے۔ اگر وہ بیمار نہ ہوتا تو بڑا خوبصورت ہوتا۔ جاوید ذہنی طور پر بھی معذور تھا اس لیے اپنے بہن بھائیوں کی طرح سکول نہیں جا سکا اور بالکل ناخواندہ ہے۔ بیمار ہونے سے پہلے وہ گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتا تھا، اپنی والدہ یا دادی کے لیے بازار سے سودا سلف لے آتا تھا یا گھر کی عورتوں سے بات چیت میں وقت گزارتا تھا۔ گھر والے بتاتے ہیں کہ اسے ریڈیو پر موسیقی سننے کا بڑا شوق تھا۔ وہ موسیقی سنتا بھی تھا اور خود بھی گھنٹوں گاتا رہتا تھا۔ میری بوڑھی ساس بتاتی ہیں کہ اس کی آواز بڑی سریلی تھی اور وہ اس سے نعتیں سنا کرتی تھیں۔ شاعری میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی جائے تو اسے نعت کہتے ہیں۔ لیکن اب وہ اتنا کمزور ہوگیا ہے کہ اس سے چلا بھی نہیں جاتا۔ وہ دردوں میں مبتلا رہتا ہے۔ گانوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ پچاس سالہ ممتاز ہے جو اپنے عمر رسیدہ شوہر کے ساتھ فیصل آباد میں رہتی ہیں لیکن اکثر لاہور آتی رہتی ہیں اور ہمارے ہاں قیام کرتی ہیں۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہے لیکن ان کے شوہر کے پہلی بیوی سے دو بچے ہیں جو اب کافی بڑے ہو گئے ہیں۔ ممتاز سے شادی سے کئی سال پہلے ان کی پہلی بیوی فوت ہوگئی تھی۔ ممتاز جب بھی آتی ہیں تو مشین پر میرے لیے کپڑے سیتی ہیں۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی خدمت میں لگی رہتی ہیں۔ وہ بے غرض، دوسروں کا خیال رکھنے والی اور مذہبی خاتون ہیں اور خان صاحب کی سب بہنوں میں سب سے اچھی ہیں۔

میرے شوہر کی بہنوں میں ایک اور ادھیڑ عمر حمیدہ ہیں۔ وہ اوپر والی منزل میں رہتی ہیں۔ ان کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں وہ، ان کا شوہر نشان اور تین بیٹیاں، نادرہ، اسماء اور افضل، رہتی ہیں لیکن وہ اپنے کمرے کو ہمیشہ صاف ستھرا رکھتی ہیں۔ ان کے چار بیٹے تھے جو میری ساس کے مطابق انتہائی خوبصورت تھے لیکن چاروں کا بچپن میں ہی میں انتقال ہوگیا۔ دو کا ہیضے سے اور دو کا ٹائیفائڈ کے بخار سے۔ چاروں کا انتقال جالندھر میں ہی ہوا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں حالات اتنے

Marfat.com

خوشگوار نہیں تھے، جتنے میں سمجھتی تھی۔ حمیدہ کی بیٹیوں میں سب سے حسین اور ذہین، ان کی سب سے بڑی بیٹی ناصرہ تھی لیکن جب وہ اٹھارہ برس کی تھی، تو میرے پاکستان آنے سے پہلے، وہ ایک سال تک تپ دق کی بیماری میں مبتلا رہنے کے بعد چل بسی۔

خان صاحب کی چوتھی بہن گوہر زماں بیوہ ہے۔ ان کے شوہر کا پانچ سال پہلے انتقال ہوا۔ آپ کو پتہ ہے، ہمارے خاندان میں ایک ولی بھی ہے، اسد اللہ خان۔ وہ بڑا مذہبی، پاکباز اور اسلامی تعلیمات پر سختی سے عمل کرنے والا شخص تھا، عربی، فارسی کا عالم۔ جب وہ ذہنی طور پر معذور ہوا تو اپنی مادری زبان اردو بھول گیا اور اب صرف عربی بولتا ہے۔ گوہر زماں جدید طرز کی خاتون ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو مولوی نہیں بنانا چاہتیں چنانچہ انہوں نے اسد اللہ سے خلع لے لیا اور بچوں کو لے کر الگ ہوگئیں۔ اس افسوسناک صدمے کے بعد اسد اللہ بے گھر ہوگئے۔ وہ شہر شہر پھرتے تھے اور مسجدوں میں ٹھکانہ رکھتے تھے۔ انہیں جو بھی دیکھتا تھا، ترس کھاتا تھا۔ لوگ انہیں سچا ولی سمجھتے تھے اور کھانا اور کپڑے دیتے تھے۔ ایک دن فجر کی نماز کے دوران میں سجدے کی حالت میں ان کا انتقال ہوگیا اور انہیں بڑے احترام سے دفن کیا گیا۔ گوہر زمان کا سب سے بڑا بیٹا لئیق احمد ایک لائق ڈاکٹر ہے اور لاہور کے میو ہسپتال میں بچوں کے سیکشن میں کام کرتا تھا۔ حال ہی میں وہ سرکاری وظیفے پر امریکہ گیا ہے اور کلیولینڈ اوہائیو کے لیک وڈ ہسپتال میں بچوں کی دواؤں کے بارے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کررہا ہے۔ اس نے میرے جسم پر جا بجا نکلنے والے پھوڑوں اور ملیریا کے چار حملوں کے دوران میں میرا علاج کیا اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے بغیر میرا کیا بنے گا۔ یہاں تو آئے دن، کسی نہ کسی کو، کوئی نہ کوئی بیماری گھیرے رہتی ہے اور ہر وقت اس کی ضرورت رہتی تھی۔ وہ خاندان کا مفید ترین شخص ہے۔

لئیق احمد کا چھوٹا بھائی فاروق احمد خان بیس اکیس سال کا نوجوان آدمی ہے۔ وہ پیشہ ور کھلاڑی ہے اور آج کل ہاکی اور دوڑ کے مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے جرمنی، انگلینڈ، انڈونیشیا اور میکسیکو کا دورہ کررہا ہے۔ وہ اولمپک کھیلوں میں بھی شریک ہوتا لیکن

Marfat.com

عین وقت پر کسی وجہ سے اس کا انتخاب نہ ہوسکا۔ اس کا کمرہ میڈلوں اور ٹرافیوں سے بھرا ہوا ہے۔ فاروق احمد خان کے دل میں اپنے مرحوم والد کا بہت احترام ہے اور اس نے وہ سارے خط سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں جو انہوں نے شہر شہر پھرتے ہوئے مختلف مسجدوں سے عربی زبان میں اسے لکھے تھے۔ تیسرا بھائی، بیس سالہ خالق ہے جو پاکستان آرمی میں آفیسر ہے۔ وہ مغربی طرز کا آدمی ہے اور بڑی روانی سے انگریزی بولتا ہے۔ وہ خاندان کا واحد شخص ہے جو رات کو شب خوابی کا لباس پہن کر سوتا ہے۔ ورنہ باقی گھر والے انہی کپڑوں میں سوجاتے ہیں جو دن بھر پہنے ہوتے ہیں۔ سب سے چھوٹی بھانجی سترہ سالہ امینہ ہے جو کالج کی طالب علم ہے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک ماڈرن لڑکی ہے لیکن اپنے والد کی طرح اسے بھی عربی بہت محبوب ہے۔ اس نے مجھے اپنے مضامین کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ عربی اس کا پسندیدہ مضمون ہے۔

میرے شوہر کی پانچ بہنوں میں سب سے چھوٹی سرور ہے جو ہمارے گھر میں نہیں رہتی بلکہ ایک قریبی فلیٹ میں رہائش پذیر ہے جو بڑا شاندار اور آرام دہ ہے۔ سرور کا شوہر عنایت خان بھاری ڈیل ڈول کا خوش مزاج شخص ہے۔ وہ ایک ریٹائرڈ آرمی آفیسر ہے۔ اسے حکومت سے اچھی خاصی پنشن مل جاتی ہے اور ان کی زندگی مزے میں گزر رہی ہے۔ سرور کے تینوں بیٹے کانونٹ سکولوں میں پڑھتے ہیں اور فرفر انگریزی بولتے ہیں۔ میں اگرچہ مسلمان بچوں کو کانونٹ سکولوں میں بھیجنا پسند نہیں کرتی لیکن ایک بات کہنی پڑتی ہے ان سکولوں میں پڑھنے والے کی تربیت بہت عمدہ ہوتی ہے اور وہ ادب آداب سے بخوبی آشنا ہوتے ہیں۔ گورنمنٹ کے عام سکولوں میں پڑھنے والے بچوں میں یہ عادتیں نہیں ہوتیں۔ سرور کے بچے بھی با ادب ہیں۔ جب ہمارے ہاں آتے ہیں تو صاف ستھرے، اچھے لباس میں۔ تینوں میں سب سے بڑا جمشید ہے جو سترہ سال کا ہے اور کسی طرح کسی انگریز سے کم نہیں۔ وہ زبردست کھلاڑی ہے، پیراکی کا ماہر اور کئی مقابلے جیت چکا ہے۔ پاکستان ٹائمز کے کھیلوں کے صفحے پر کئی بار اس کا ذکر شائع ہو چکا ہے اور اس کا کمرہ میڈلوں اور ٹرافیوں سے بھرا ہوا ہے۔

Marfat.com

جمشید اپنے سکول کی تعلیم مکمل کر چکا ہے اور کالج میں داخل ہونے والا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے، سکول کی تعلیم مکمل ہونے پر اس کے والد نے اسے کیا تحفہ دیا ہوگا؟ اس کے والد نے فخر سے اپنی بھینس اسے عطا کی کہ اس کی رکھوالی بھی اس کے ذمے ہے اور دودھ دوہنا بھی۔ میرے شوہر کو اس پر بڑا رشک آتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ سے بھینس پالنے کے شوقین رہے ہیں۔

میرے شوہر کا سب سے چھوٹا بھائی قمر ہے۔ میری عمر کا پسندیدہ شخص جو ایک چھوٹا دکاندار ہے۔ ایک مقامی بازار کی ایک تنگ سی گلی میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں اس کی دکان ہے۔ اسے آلتی پالتی مارے، گاہکوں سے تکرار کرتے دیکھیں تو وہ مشرقی طرز کا ایک مخصوص سوداگر دکھائی دیتا ہے۔ قمر کی ایک بیٹی ہے، روشن آنکھوں والی، چھ سالہ انجم۔ اس کی بیوی کا نام ثریا ہے اور وہ پھر امید سے ہے۔ دونوں کی خواہش ہے کہ اس مرتبہ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہو۔

اور آخر میں ابرار کا ذکر کروں گی جو میری ساس کی چھوٹی بہن کا بیٹا اور میرے شوہر کا خالہ زاد بھائی ہے۔ وہ میرا ہم عمر ہے اور مقامی ڈاکخانے میں کام کرتا ہے۔ وہ اپنے مزاج کے لحاظ سے بالکل ٹھیک جگہ پر ہے۔ کیونکہ ٹکٹیں جمع کرنا اس کا مشغلہ ہے۔ مجھے چونکہ پوری دنیا سے خط آتے ہیں تو میں نے اس کے مشغلے میں اس کی کافی مدد کی ہے۔ جب بھی مجھے کسی غیر ملک سے کوئی خط ملتا ہے تو ٹکٹیں میں اسے دے دیتی ہوں۔ ابرار خان اتنا باعمل مسلمان ہے کہ وہ اپنی البم میں تصویروں والی کوئی ٹکٹ نہیں لگاتا۔ وہ اصل میں اسلام کی اس ممانعت پر عمل کرتا ہے کہ جو بت پرستی کے خلاف احتیاط کے طور پر انسانوں اور جانوروں کی تصویروں پر لاگو ہے۔ وہ خود اپنی تصویر بھی نہیں اترواتا۔ قمر اور میرے شوہر کی طرح اس نے بھی لمبی داڑھی رکھی ہوئی ہے۔ وہ کبھی مغربی لباس میں نظر نہیں آیا۔ میرا خیال تھا کہ میرا شوہر ہی کٹر مسلمان ہے لیکن ابرار سے ملنے کے بعد پتہ چلا کہ پورے خاندان میں سب سے زیادہ کٹر وہی ہے۔ میں جب بھی خطوں کے لفافے دینے اس کے کمرے میں جاتی ہوں تو اسے عبادت میں مصروف

Marfat.com

پاتی ہوں۔ وہ نہ صرف فرض نمازیں پڑھتا ہے بلکہ بڑے اہتمام سے نفلی نمازیں بھی پڑھتا ہے۔ اگرچہ وہ جماعت اسلامی کا باقاعدہ رکن نہیں ہے لیکن مولانا مودودی کا پرستار ہے اور ان کی کتابیں شوق سے پڑھتا ہے۔ وہ کہتا ہے، میں ہر اس حکومت کا حامی ہوں جو اسلامی قوانین نافذ کرے۔ ابرار کی شادی شفیقہ کی بہن راحت سے ہوئی ہے جو میری بڑی گہری سہیلی ہے۔ میں اکثر اسے اور اس کے دو بچوں، پانچ سالہ مونا اور ڈیڑھ سالہ طاہرہ سے ملنے اس کے کمرے میں جاتی رہتی ہوں۔ مونا، عمر فاروق کی ہم جولی ہے، دونوں اکٹھے کھیلتے ہیں اور اکٹھے سکول جاتے ہیں۔ طاہرہ بڑی پیاری بچی ہے۔ وہ اکثر چارپائی پر بیٹھی نظر آتی ہے اور اس کی دادی بڑے لاڈ سے اسے چھوٹی موٹی چیزیں کھلاتی رہتی ہیں۔ مونا اور طاہرہ کے درمیان راحت کے ہاں ایک بیٹا بھی پیدا ہوا تھا لیکن میرے پتو کی جانے کے بعد وہ ڈیڑھ سال کا ہو کر کالی کھانسی کے ہاتھوں انتقال کر گیا۔

تمام تر گندگی، بیماریوں اور مشکلات کے باوجود مجھے اس گھر اور اس کے اردگرد کے ماحول سے محبت ہے اور میں کسی اور جگہ جانے کو تیار نہیں۔ لاہور میں زیادہ تر امریکی گلبرگ کے فیشن ایبل بنگلوں میں رہتے ہیں۔ گلبرگ لاہور کا "پارک ایونیو" ہے لیکن مجھے وہاں جانے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ میں کھڑکی میں بیٹھی باہر جھانکتی رہتی ہوں اور اردگرد کی زندگی کا مشاہدہ کرتی رہتی ہوں۔ کوئی مجھے نہیں دیکھ سکتا اور میں آرام سے اپنی کرسی پر بیٹھی رہتی ہوں۔ بچے کی وجہ سے میرا پیٹ روز بروز پھولتا جا رہا ہے۔ اب میں گلی کے ہر شخص کو پہچاننے لگی ہوں۔ ہر فقیر کو بھی۔ وہی فقیر روزانہ بھیک مانگنے آتے ہیں۔ میں ٹھیلے والوں کو بھی ان کی مخصوص آوازوں سے پہچاننے لگی ہوں۔

ان کچی گلیوں میں کبھی کوئی کار نظر نہیں آئی۔ بس تانگے یا بوجھ اٹھائے گدھوں کی قطاریں نظر آتی ہیں یا لاہور کے مضافاتی علاقوں سے آئی ہوئی بھینسیں۔ مجھے یہ گلیاں رمضان کے مہینے میں اور بھی زیادہ اچھی لگتی ہیں جب صبح منہ اندھیرے تین بجے، بہت سے لوگ اور بچے ڈھول پیٹ پیٹ کر ہمیں سحری کے لیے جگانے آتے ہیں۔ بہت سے

Marfat.com

مغنیوں کے طائفے بھی آتے ہیں جو ستار پر صوفی بزرگوں کا کلام پڑھتے ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نعتیں۔ بچوں کا ایک ازدحام ان کے ساتھ چلتا ہے۔ دن کے وقت بہت سے مداری اپنے تربیت یافتہ طوطوں، بندروں اور ریچھوں کے ساتھ آتے ہیں اور بچوں کا جی بہلاتے ہیں۔ کئی لحاظ سے سنت نگر مجھے پتوکی کی یاد دلاتا ہے اور اس وجہ سے مجھے اس جگہ سے پیار ہے۔

میرے شوہر خان صاحب اور ان کے گھر والے آپ کو نیک خواہشات اور آداب لکھواتے ہیں۔

آپ کی پیار کرنے والی بیٹی
مریم

Marfat.com

سنت نگر لاہور سے دوسرا خط

مریم جمیلہ
معرفت محمد یوسف خان
15/49 سنت نگر، لاہور-1
پاکستان
24 اکتوبر 1964ء

مسٹر اور مسز ہربرٹ ایس مارکوس
49- کیلے مارکوئیس ڈی لاسینیا
پاما ڈی ملورکا، میجورکا - سپین

محبوب ترین امی اور ابو!

میں نے اپنے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ یہاں میرا مشن یہ ہے کہ میں جدید دور کی اس بے حیائی کے خلاف لڑنے کی بھرپور کوشش کروں جس کا اظہار ان فحش فلمی گانوں سے ہوتا ہے جو میری بھانجی کے ریڈیو پر اکثر سنائی دیتے ہیں تاکہ بالآخر اذان ان پر حاوی ہوجائے۔ جس طرح سے مغربیت اور جدید طرز زندگی روز بروز مقبول ہوتا جا رہا ہے، ایک غیر مسلم کو یہی محسوس ہوگا کہ میں اپنی جھوٹی خواہشوں کے فریب میں مبتلا ہوں لیکن ایک سچا مسلمان کبھی مایوس نہیں ہوتا اور کبھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔

کل رات خواب میں میں نے مکہ کے مقدس شہر کی زیارت کی۔ یہ ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ صبح میں نے اپنے شوہر کو سنایا۔ میں نے دیکھا کہ میں مکے میں ہوں۔ میں حرم شریف میں داخل ہوتی ہوں تو پتہ ہے میں نے کیا دیکھا؟ بجائے اس کے کہ خانہ

Marfat.com

کعبہ خوبصورت سیاہ ریشمی غلاف (قسوہ) میں لپٹا ہو اور اس پر طلائی حروف میں قرآنی آیات لکھی ہوئی ہوں، اس پر نئی فلموں کے فحش اشتہارات چسپاں تھے، جن پر عریاں عورتیں نمایاں تھیں۔ بڑے بڑے ہیجان خیز بل بورڈ لگے ہوئے تھے جن میں عورتیں اور مرد ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے اور بوس و کنار میں مشغول تھے۔ خوشبوؤں اور بال صفا کریموں کے اشتہارات تھے۔ خانہ کعبہ کے ساتھ ایک بڑا سا پیانو تھا جس نے طواف کا راستہ روک رکھا تھا تاکہ کوئی طواف نہ کر سکے۔ کوئی آدمی سیاہ جیکٹ پہنے اس پیانو پر بلند آواز میں مغربی موسیقی کی تانیں اڑا رہا تھا تاکہ اذان ہو بھی تو اس کی آواز سنائی نہ دے۔ میں ایسے اداس تھی جیسے دنیا کا خاتمہ ہو گیا ہو۔ اسی اُداسی کی حالت میں، میں خانہ کعبہ میں قرآن ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں اوپر کی منزل میں جاتی ہوں جہاں لائبریری کی کتابیں رکھی جاتی ہیں لیکن وہاں کسی قرآن کا نام و نشان نہیں۔ تمام شیلف امریکہ کے بیسٹ سیلر ناولوں اور شوخ رنگ مزاحیہ رسالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان کے کور کھڑکی سے آنے والی سورج کی شعاعوں میں چمک رہے ہیں۔ میرا مصمم ارادہ ہے کہ میں قرآن اور دوسری عربی کتابیں ڈھونڈ کے رہوں گی۔ بالآخر مجھے ایک تاریک کونے کے فرش پر قرآن اور دوسری مقدس کتابیں نظر آجاتی ہیں جو بے ترتیبی سے بکھری ہوئی ہیں اور ان پر گرد کی تہیں جمی ہوئی ہیں۔ میں ان کتابوں کو بازوؤں میں اٹھا کر فرش پر بیٹھ جاتی ہوں اور روتے روتے کہتی ہوں،" مجھے نہیں پتہ تھا کہ مکہ ایسا ہو گا۔ یہ تو پاکستان سے بھی بری، بہت بری جگہ ہے۔" اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔

میرے شوہر نے بڑی سنجیدگی سے کہا،" تمہارا خواب سچا ہے، یہ بڑے خطرناک دن ہیں۔"

لیکن میں آپ کو ایک اور خواب سنانا چاہتی ہوں جو میں نے چند راتیں پہلے دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے صدر، محمد ایوب خان کو جلاوطن کر دیا گیا ہے اور ان کا سارا سامان، مال و متاع ضبط کر لیا گیا ہے۔ وہ بے گھر ہو کر بے سروسامانی کی حالت

Marfat.com

میں ہمارے گھر میں پناہ لیتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ میں بیمار ہوں اور مجھے پینسلین کا ٹیکہ چاہیے۔اگر دوا اور انجکشن مل جائے تو وہ خود ٹیکہ لگا لیں گے۔میری جوان بھانجی امینہ جو نہ صرف خواب میں بلکہ درحقیقت ایوب خان کی پرستار ہے، بھاگی بھاگی کسی کیمسٹ سٹور پر جاتی ہے اور آدھ گھنٹے میں پینسلین اور انجکشن لے آتی ہے۔ایوب خان بڑے بوجھل انداز میں پیڑھی پر بیٹھ کر مٹی کے تیل کے چولھے پر پانی ابالتے ہیں تاکہ انجکشن کی سوئی کی جراثیم سے پاک کر سکیں۔ٹیکہ تیار کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں،" میرا آخری وقت آ گیا ہے۔" وہ خود ٹیکہ لگاتے ہیں، ٹیکہ لگاتے ہی وہ ایک گہرا سانس لیتے ہیں اور ان کا جسم دھڑام سے زمین پر گر جاتا ہے۔مردہ!!

جب جاگنے کے بعد میں نے خواب اپنے شوہر کو سنایا تو انہوں نے پوچھا،

"آپ نے خود اسے مرتے دیکھا؟"

"ہاں خان صاحب! میں نے خود دیکھا۔"

انہوں نے مجھے سختی سے ہدایت کی،" مریم! یہ خواب کسی اور کو نہ سنانا۔ہم دونوں کی کمبختی آ جائے گی۔"

اب جبکہ پابندیاں ختم ہو چکی ہیں، میں آپ کو جماعت اسلامی پر پابندیوں کی پوری کہانی سنا سکتی ہوں۔یہ پچھلے جنوری کی چھ تاریخ تھی، ٹھٹھرتی سردیوں کی ایک بے کیف صبح جب دروازے پر زوردار دستک سے میری آنکھ کھل گئی۔میرے شوہر ہڑبڑا کر اٹھے اور باہر کی طرف لپکے۔دروازے پر ان کا ایک دوست کھڑا تھا جس نے کہا کہ وہ فوراً جماعت کے ہیڈ کوارٹر رپورٹ کریں۔مجھے احساس تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔لیکن میرے شوہر نے کہا،" تم اب یہودی نہیں ہو، تم ایک مسلمان خاتون ہو اور تمہیں متفکر نہیں ہونا چاہیے نہ خوفزدہ۔" بس اتنی تسلی دے کر وہ اور ان کے دوست چلے گئے۔خوف کے عالم میں، میں چارپائی پر بیٹھی انتظار کرتی رہی۔تقریباً دو بجے میرے شوہر واپس آئے۔ان کا سانس اکھڑا ہوا تھا اور رنگت زرد تھی۔انہوں نے بتایا،" جماعت اسلامی پر پابندی لگا دی گئی ہے۔سب کچھ ختم ہو گیا۔میں جب مرکز جماعت پہنچا تو

Marfat.com

مولانا مودودی کو پہلے ہی گرفتار کیا جا چکا تھا۔تمام دفاتر اور مولانا مودودی کی لائبریری سیل کی جا چکی ہے اور پولیس رائیفلیں چھتیائے، گھر کا محاصرہ کیے ہوئے ہے۔"

اس کے بعد جو دن گزرے، انہیں کیسے بیان کروں۔ میرے شوہر جہاں بھی جاتے تھے، سی آئی ڈی اور خفیہ پولیس ان کا تعاقب کرتی تھی۔ انہیں خدشہ تھا کہ انہیں کسی بھی وقت گرفتار کیا جا سکتا ہے اور جیل بھیجا جا سکتا ہے اور وہ اس کے لیے بالکل تیار تھے۔ وہ راتیں بڑی دہشت ناک تھیں۔ باہر سے چوں کی آواز بھی آتی یا کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی تو میں خوف سے اچھل پڑتی۔ ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا کہ اب پولیس دروازے پر دستک دے گی اور میرے شوہر کو پکڑ لے جائے گی۔ میرے شوہر مجھے سمجھاتے،" میری فکر نہ کرو، میں پہلے بھی دو دفعہ جیل جا چکا ہوں، تجربہ کار ہوں، میرا پورا خاندان تم سے پیار کرتا ہے اور تمہاری دیکھ بھال کرے گا۔" میرے ذہن میں ایک ہی خیال بسا ہوا تھا،" میرا پانچواں مہینہ ہے، شفیقہ کا چھٹا، کیا بچوں کی پیدائش کے وقت خان صاحب یہاں ہوں گے؟"

اللہ کا شکر ہے کہ میرے خدشات درست ثابت نہیں ہوئے اور خان صاحب بچ رہے۔ مسز عثمانی کا کہنا تھا کہ اس خوش قسمتی میں، میری امریکی شہریت کا ہاتھ تھا۔ مجھے نہیں معلوم یہ بات کہاں تک درست تھی۔ جماعت اسلامی پر پابندیاں تھیں اور آمدنی کے تمام ذرائع مسدود لیکن خان صاحب کو کوئی فکر نہیں تھی کہ گھر میں دو بچے اور آنے والے ہیں۔ وہ کہا کرتے،" اللہ رازق ہے، وہی ان کا انتظام کرے گا۔"

جماعت اسلامی پر پابندیوں کے ساڑھے آٹھ مہینوں کے دوران میں خان صاحب کے پاس روزی کمانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا لیکن وہ ایک لمحے کے لیے بھی بے کار نہیں بیٹھے۔ ان کی پوری کوشش ہوتی کہ مولانا مودودی زیادہ سے زیادہ آرام سے رہیں۔ اگر وہ بیمار ہوئے اور انہیں کسی دوا کی ضرورت پڑی، خان صاحب دوا انہیں پہنچاتے۔ وہ پولیس کی معیت میں مولانا کو کسی مقامی ماہر امراض چشم کے پاس لے جاتے اور نظر کا معائنہ کروا کے، انہیں نئی عینک فراہم کرتے۔ انہوں نے مولانا مودودی

Marfat.com

کو ایک ریڈیو بھی خرید کر دیا اور گرمی پڑی تو بجلی کا ایک پنکھا لے کر دیا۔ وہ ایک قابل تعظیم اور نامور رہنما ہیں اور ایک سیاسی قیدی کی حیثیت سے پولیس کی یہ جرأت نہیں تھی کہ ان سے کوئی ناروا سلوک کریں۔ چنانچہ انہیں اے کلاس میں رکھا گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ جیل میں تمام قیدیوں کی نسبت انہیں قدرے سہولتیں حاصل تھیں۔ انہیں گھر کے کپڑے پہننے کی اجازت تھی اور انہیں ایک مشقتی ملا ہوا تھا جو ان کا کھانا پکاتا تھا۔ اس طرح انہیں جیل کی بد ذائقہ خوراک سے چھٹکارا حاصل تھا۔ جب ان کی بیوی اور بچے ان سے ملنے آتے تھے تو ان کے پسندیدہ پان ساتھ لاتے تھے۔ اسی طرح جیسے مجھے ذہنی امراض کے ادارے میں اعلیٰ استحقاق حاصل تھا، اسی طرح مولانا لاہور جیل میں خاص استحقاق کے ساتھ رہ رہے تھے۔ دونوں جیل روڈ پر ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ جب میرے شوہر مولانا کی خدمت سے فارغ ہوتے تھے تو جماعت کے دوسرے قیدی رہنماؤں کا خیال رکھنے کی بھی بھرپور کوشش کرتے تھے۔ ایک دفعہ فروری میں وہ ایک دوست کے ساتھ ملتان گئے۔ انہیں پتہ چلا کہ جماعت کے ایک رہنما کو ایک جیل سے کسی دوسری جیل میں منتقل کیا جا رہا ہے اور انہیں ملتان ریلوے سٹیشن پر رکنا تھا۔ جیل حکام مولانا کو بھی لاہور سے کسی دور دراز مقام پر کسی چھوٹے شہر کی جیل میں منتقل کرنا چاہتے تھے لیکن میرے شوہر نے انہیں آمادہ کیا کہ وہ مولانا کو لاہور ہی میں رہنے دیں جہاں ان کے گھر والے بھی آسانی سے انہیں ملنے آسکتے ہیں اور ان کا بہترین علاج بھی ممکن تھا۔ خان صاحب کا زیادہ وقت جماعت کے ان دوستوں کے ساتھ گزرتا تھا جنہیں ان کی طرح چھوڑ دیا گیا تھا۔ اخلاق حسین جو مولانا مودودی کی کتابیں شائع کرتے ہیں اور کوثر نیازی جو ہفت روزہ شہاب کے مینیجر تھے، اور دوسرے لوگ گھنٹوں ایک دوسرے کے گھر پر گزارتے تھے۔ ان دنوں خان صاحب کی سوشل لائف بڑی خوشگوار تھی۔ ہر ہفتے جمعہ کی نماز کے بعد اخلاق حسین "آئس کریم پارٹی" کا اہتمام کرتے تھے۔ ایک دن جب وہ ایک ایسی آئس کریم پارٹی سے واپس آئے جس میں ظاہر ہے صرف مرد شریک ہوئے تھے، میں نے پوچھا کہ ان کا وقت اچھا گزرا۔

Marfat.com

انہوں نے کہا، "صحبت بہت اچھی تھی لیکن پاکستانی آئس کریم اچھی نہیں تھی۔ ساری آئس ہی آئس (نری برف) نہ کریم کا نام ونشان نہیں تھا۔"

جب مولانا جیل میں تھے تو خان صاحب اکثر مجھے اور شفیقہ کو اچھرے میں ان کے گھر بیگم مودودی اور بچوں سے ملاقات کے لیے لے جاتے تھے۔ والد کی جدائی بچوں پر بڑی گراں تھی، خاص طور پر آٹھ سالہ عائشہ پر وہ ان کی لاڈلی بیٹی تھی اور انہیں بہت یاد کرتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ فروری کے ابتدائی دن تھے۔ سردیوں کی ٹھر ابھی باقی تھی لیکن مولانا کا وہ گھر جہاں ہر وقت چھل پہل رہتی تھی، کسی بھوت بنگلے کی طرح سنسان تھا۔ بچے بھی خاموش تھے، حالانکہ بچے کہاں چپ رہتے ہیں۔ ماحول ماتم کناں اور بوجھل تھا۔ چونکہ ماہنامہ ترجمان القرآن پر پابندی عائد تھی، عمر فاروق بیکار تھا۔ احمد فاروق کی بھی یہی حالت تھی۔ انہوں نے لاہور میڈیکل کالج میں اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی لیکن حکومت نے کینیڈا میں ہارٹ سرجری میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ان کا وظیفہ روک دیا تھا۔ حمیرا پچیس سال کی ہو کر بھی ابھی تک غیر شادی شدہ تھی۔ پچھلے سال ان کی شادی کے انتظامات مکمل تھے لیکن ان کے منگیتر جو پاک فضائیہ میں ہواباز تھے، کا جہاز کے ایک حادثے میں انتقال کر گئے۔ اب جب کہ حمیرا نے انگریزی ادب اور اسماء نے معاشیات میں ایم اے کی ڈگری لے لی تھی، ان کی شادی کے منصوبے ان کے والد کی قید کی وجہ سے ادھورے رہ گئے تھے۔ اب ان کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا اور وہ گھر میں ڈائیں ڈائیں پھرتی رہتی تھیں۔ محمد فاروق اور حسین فاروق نے سکول کی تعلیم مکمل کر لی ہے لیکن کالج میں داخلے کے لیے پیسے نہیں ہیں تو وہ بھی بیکار ہیں اور بور ہوتے رہتے ہیں۔ پندرہ سالہ حیدر، بارہ سالہ خالد اور آٹھ سالہ عائشہ کی تکلیف کم ہے کیونکہ سکول جانے سے ان کی توجہ بٹی رہتی ہے۔ میں نے جب بیگم مودودی سے بڑے بچوں کی تلخی کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا، "تمہیں میرے بچے بڑے لگتے ہوں گے اور اگرچہ تعلیمی اداروں میں ان کا شمار بڑے لائق طلبہ میں ہوتا ہے لیکن ہیں تو وہ بچے ہی ذہنی طور پر وہ بلوغت کی اس حد کو نہیں پہنچے کہ سمجھ سکیں کیا ہو گیا ہے اور کیوں۔۔۔۔؟"

Marfat.com

میرا "وقت" قریب سے قریب تر آرہا اور حمل کی وجہ سے میرا جسم پھیلتا جا رہا تھا۔ اس دوران میں قمر کی بیوی کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام "اسامہ" رکھا۔ قمر کی بیوی ہسپتال گئی نہ کوئی ڈاکٹر گھر آیا۔ اسے دردیں آدھی رات کے بعد شروع ہوئی تھیں اور اس وقت کوئی ڈاکٹر میسر نہیں تھا۔ سو اس نے قمر اور چھوٹی فرحت کو کمرے سے باہر نکال کر دروازہ بند کر لیا اور خود ہی بغیر کسی امداد کے بچہ جنم دیا۔ ثریا کو زیادہ مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ یہ آسان پیدائش تھی لیکن بچہ بہت کمزور اور چھوٹا ہے جبکہ خود ثریا لحیم وشحیم اور موٹی تازی ہے۔ ثریا کے یا تو دودھ اترا ہی نہیں تھا یا وہ اپنا دودھ پلانا نہیں چاہتی تھی، بچے کو فوراً ہی بوتل لگا دی گئی۔ وہ انتہائی نحیف و نزار تھا اور بیمار رہتا تھا۔ وہ روز بروز کمزور ہوتا گیا اور مجھے ایسا لگتا تھا کہ کسی بھی وقت دم دے دے گا اور شاید اپنی پہلی سالگرہ بھی نہ دیکھ سکے۔ اسے تقریباً روزانہ ڈاکٹر کے پاس لے جایا جاتا لیکن کوئی دوا کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ ننھا اسامہ زندگی کے نازک دھاگے سے بندھا، کسی نہ کسی طرح ایک سے دوسرا دن کرتا رہا اور اس طرح ہفتے مہینے گزر گئے۔ قمر اپنے بیٹے پر بہت مہربان اور شفیق تھا اور اس کی بھی یہ حالت تھی کہ چند مہینوں کا ہونے کے باوجود وہ باپ کو ماں پر ترجیح دیتا تھا۔

جب جماعت اسلامی پر پابندی عائد تھی تو پولیس ہماری زندگی کا حصہ بن گئی تھی۔ خان صاحب پر تو یہ بات پوری طرح لاگو تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے کوئی مجرم کچھ مہلت کے لیے رہا ہوا ہو۔ روزانہ صبح ٹھیک نو بجے انہیں تھانے میں حاضری دینی ہوتی تھی جہاں ان سے سوال و جواب ہوتے۔ اسی پر بس نہیں، خان صاحب جہاں بھی جاتے، سی آئی ڈی اور خفیہ پولیس کے اہلکاران کا پیچھا کرتے۔ پہلی دفعہ جب میں نے بہت سے لوگوں کو گھر کے اردگرد کھڑا پایا تو میں نے خان صاحب سے پوچھا کہ وہ کون لوگ تھے تو خان صاحب نے جواب دیا کہ سی آئی ڈی (سینٹرل انویسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ)۔ میں انہیں نہیں پہچان پائی تھی کیونکہ وہ کسی طرح کی وردی میں نہیں ہوتے تھے بلکہ سادہ کپڑوں میں ملبوس ہوتے تھے۔ میں جب بھی بیگم مودودی اور ان کے بچوں کو ملنے اچھرے جاتی

Marfat.com

تھی تو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بیرونی دروازے پر ہمیں مسلح پولیس کے سپاہی نہ ملے ہوں۔ حمیرا نے بتایا کہ جب بھی کوئی رشتے دار ہمیں ملنے آتا ہے تو کار یا ٹیکسی کا نمبر نوٹ کیا جاتا ہے۔ مجھے یہ پولیس والے کرخت اور درشت دکھائی دیتے تھے لیکن حمیرا نے بتایا کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد ان کا رویہ دوستانہ ہو گیا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے یہاں پہرہ نہیں دیتے۔ انہیں یہ کام دیا گیا ہے اور وہ یہ کام کرنے پر مجبور ہیں۔" اس نے بتایا کہ پولیس کے محافظ اب اتنے نرم پڑ گئے ہیں کہ بچوں کو پیار کرتے ہیں بلکہ عائشہ اور خالد فاروق کے کھیل میں بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ محمد فاروق نے بتایا کہ جب بھی وہ ڈیوٹی پر آتے ہیں تو پوچھتے ہیں، "آپ کے والد کیسے ہیں اور کب گھر آئیں گے؟"

جب قمر کا چھوٹا بیٹا تین مہینے کا تھا تو 10 مئی کی سہ پہر کے وقت شفیقہ کو درد شروع گئے۔ ان کی والدہ جو قریب ہی رہتی تھیں، بھاگی بھاگی گھر آئیں۔ ان کا مصمم ارادہ تھا کہ شفیقہ کو باقاعدہ طبی سہولتیں میسر ہوں اور اس کے ساتھ وہ سلوک نہ ہو جو ثریا کے ساتھ ہوا تھا۔ فوری طور پر ایک تانگہ منگوایا گیا اور شفیقہ کی والدہ انہیں لیڈی ولنگڈن ہسپتال لے گئیں۔ ظاہر ہے وہ پرائیویٹ کمرے کے مصارف تو برداشت نہیں کر سکتی تھیں اس لیے انہیں جنرل وارڈ میں رہنا پڑا۔ پیدائش کے دوران میں ان کی والدہ ان کے ساتھ رہیں۔ خوش قسمتی سے کوئی پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی۔ خان صاحب بھی شفیقہ کی بچی سمیت واپسی تک ہسپتال ہی میں رہے۔ خان صاحب کو بیٹے کی خواہش تھی لیکن بیٹی کی پیدائش پر اگر انہیں کوئی مایوسی ہوئی تو انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ بچی کسی انگریز بچی کی طرح گوری چٹی تھی اور خان صاحب اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ مسلمان اپنے نومولود بچوں کے کان میں اذان دیتے ہیں۔ خان صاحب نے بھی اس کے کانوں میں اذان دی اور پھر مولانا مودودی کی بیٹی کے نام پر اس کا نام اسماء رکھا۔ شفیقہ کی صحت بہتر ہونے لگی۔ پہلے اس کے چہرے پر جو اداسی چھائی رہتی تھی اب وہ خوشی سے دمکنے لگا اور اس کی آنکھوں کی چمک بھی عود کر آئی۔

چونکہ آپ کا اصرار تھا کہ مجھے کسی اچھے ہسپتال میں داخل کیا جائے اور دیکھ بھال

Marfat.com

میں کمی نہ آئے تو خان صاحب امریکی قونصل خانے کے مشورے پر مجھے یونائٹڈ کرسچین ہسپتال لے گئے۔ وہاں ہماری ملاقات ایک بوڑھی انگریز ڈاکٹر مارٹن سے ہوگئی جو بڑی شفیق اور اپنے کام کی ماہر تھی۔ وہ دیکھتے ہی ہمیں پسند آئی۔ اگر وہ نہ ہوتی تو خان صاحب ہمیں اس ہسپتال میں نہ لے جاتے رہتے۔ لیکن جب ڈاکٹر مارٹن اپنے وطن انگلینڈ لوٹ گئی تو دوسرے عیسائی مشنریوں کے سامنے ہمیں خفت محسوس ہوتی تھی۔ ڈاکٹر مارٹن کے جانے کے بعد جس ڈاکٹر جون نے اس کی جگہ لی وہ ایک نوجوان ناتجربہ کار پنجابی عیسائی لڑکی تھی۔ جب شفیقہ اور میں اپنے سرتاپا برقعوں میں ملبوس اس کے کلینک میں معائنے کے لیے گئے اور اس ماڈرن لڑکی کو دیکھا تو محسوس ہوا کہ اس کی دنیا اور ہماری دنیا میں جو خلیج حائل ہے وہ کبھی پر نہ ہوگی۔ اس کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ہم دونوں خان صاحب کی بیویاں ہیں۔ اس نے شفیقہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ کیا وہ میری بہن ہے۔ میں نے شرم سے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اسے اگر حقیقت معلوم ہوجاتی تو یقیناً ایک سے زائد شادیوں کے خلاف کوئی تقریر جھاڑتی۔ وہ چونکہ ایک عیسائی مشنری تھی اس لیے اس نے اپنے حصے کا فرض نبھاتے ہوئے ہمیں عیسائیت کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔ ہم پھر کبھی اس کے پاس نہیں گئے۔

جب میرا نواں مہینہ قریب آیا تو میں نے خان صاحب سے کہا کہ مجھے کہیں داخل کروانے کا انتظام کریں۔ اگرچہ میرا یہ اصرار تو تھا کہ مجھے کسی ماہر ڈاکٹر کی توجہ ملے کیونکہ ثریا جیسا کام مجھ سے نہیں ہوسکتا تھا لیکن میں کسی ماڈرن ہسپتال میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ مجھے یہ پتہ تھا کہ آسان ترین اور بہت نارمل پیدائش کے عمل میں بھی بڑی سخت دردیں ہوتی ہیں لیکن آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میں بالکل خوفزدہ نہیں تھی۔ مجھے قطعاً کوئی خوف نہیں تھا اور میں نے خان صاحب کو بتایا کہ میں یہ نہیں چاہتی کہ پیدائش کے دوران میں مجھے بے ہوش کیا جائے۔ بچے کی آمد پر میں ہوش وحواس میں رہنا چاہتی ہوں۔ میری خواہش پوری ہوئی۔ مجھے پتہ چلا کہ پاکستان کے ہسپتالوں میں

Marfat.com

عام طور پر، اگر پیدائش معمول کے مطابق ہو تو ماؤں کو بے ہوشی کی دوائیں نہیں سونگھائی جاتیں۔ میں نے اس ہسپتال میں بھی جانے سے انکار کر دیا جہاں شفیقہ کی والدہ اسے لے کر گئی تھیں۔ مجھے ایک پرائیویٹ کمرہ چاہیے تھا جہاں میں سکون سے آرام کر سکوں اور میری صحت جلد بحال ہو سکے۔ خان صاحب نے میری مرضی کے مطابق ایک پرائیویٹ زچہ بچہ کلینک ڈھونڈ نکالا جو ایک دھیمے مزاج کی مہربان، اچھی مسلمان خاتون ڈاکٹر تنویر چلاتی تھیں۔ وہ لاہور کے ایک ممتاز حکیم کی بھانجی تھیں اور ان کے خاندان کے کئی لوگ میرے شوہر کے دوست ہیں۔ میں نے جب ڈاکٹر تنویر کو اور ان کے کلینک کو دیکھا تو مجھے فوراً یہ محسوس ہوا کہ میں ٹھیک جگہ آ گئی ہوں۔ ڈاکٹر تنویر نے مجھے "میری مسلمان بہن" کہہ کر خطاب کیا اور اتنی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا جیسے ہماری برسوں سے شناسائی ہو۔ وہ اپنا کلینک اکیلی خود ہی چلاتی ہیں۔ اکثر دن میں دو یا تین ڈلیوری ہو جاتی ہیں۔ ان پر کام کا بوجھ بہت زیادہ ہے۔ چوبیس گھنٹے مصروف رہنے کی وجہ سے وہ بہت کمزور دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ انہیں اپنے کام سے محبت ہے اور وہ اس کے بجائے کوئی اور کام کرنا پسند نہیں کرتیں۔ ان کا کلینک چھوٹا اور سادہ ہے لیکن صاف ستھرا اس میں ہر طرح کی سہولتیں موجود ہیں اور یہ جگہ مجھے یونائٹڈ کرسچین ہسپتال سے کہیں بہتر لگی۔ میرے معائنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ میری صحت بالکل ٹھیک ہے، بچہ بھی ٹھیک ہے اور پیدائش میں کسی قسم کی کوئی پیچیدگی متوقع نہیں ہے۔ میں نے کہا، "ڈاکٹر تنویر! میری خواہش ہے کہ بچے کی پیدائش یہیں ہو، اسی کلینک میں"۔ انہیں میری امریکی شہریت کا پتہ تھا اور انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ میں ان کے سادہ کلینک اور وہاں کی معمولی سہولتوں سے مطمئن ہوں گی۔ انہوں نے اصرار کیا کہ میں خان صاحب سے کہوں کہ وہ مجھے گلبرگ کے امریکی ہسپتال میں داخل کروائیں۔ کئی دنوں بعد خان صاحب مجھے ٹیکسی میں گلبرگ لے گئے۔ پہلے تو مجھے چاروں طرف سبزہ زار اور مجموعی ماحول بہت پسند آیا۔ سفید بنگلے، باغات، صاف ستھری سڑکیں۔ اس علاقے اور سنت نگر کی خستہ حال عمارتوں اور کوڑے کرکٹ سے بھری گلیوں میں بڑا تضاد تھا۔ لیکن جب

Marfat.com

میں نے ہسپتال دیکھا اور اس کمرے میں گئی جہاں مجھے رہنا تھا تو اگرچہ وہ بڑا ماڈرن تھا، صاف ستھرا، لیکن ٹھنڈا اور سنسان۔ میرا دل ڈوب گیا اور میں رونے لگی۔ میرے شوہر نے نرمی سے میرے رونے کی وجہ پوچھی تو میں نے بتایا کہ وہ جگہ مجھے پسند نہیں ہے۔ میں اپنے بچے کی پیدائش وہاں نہیں چاہتی۔ اس سے بہتر ہے کہ آپ مجھے گھر لے چلیں اور پیدائش کے لیے کسی ڈاکٹر کو گھر ہی بلا لیجیے گا۔

"اچھا فکر نہ کرو، ہم وہی کریں گے جو تم چاہتی ہو۔ لیکن فرض کرو کہ تمہیں دردیں صبح دو بجے ہونا شروع ہو جائیں تو اس وقت لیڈی ڈاکٹر کہاں سے لائیں گے؟"

میں نے اپنے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا، "خان صاحب! مجھے لیڈی ڈاکٹر تنویر چاہیے۔ وہ بہت اچھی ڈاکٹر ہے۔ مجھے وہ پسند ہے۔ میں اس کے کلینک میں داخل ہونا چاہتی ہوں۔"

میرے شوہر مان گئے اور انہوں نے کہا کہ میں فکر نہ کروں۔ سب انتظامات میری رضا کے مطابق مکمل کر لیے جائیں گے۔

جب نواں مہینہ ختم ہو رہا تھا تو مجھے روزانہ کسی نہ کسی طرح کی دردیں اٹھتی تھیں۔ جب بھی درد ہوتا، میں سمجھتی کہ شاید یہ اصلی درد ہے لیکن پھر وہ رک جاتا۔ جون کے شروع کی ایک رات تھی جب دردوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ بھی جھوٹ موٹ کے درد ہیں لیکن جب درد میں کمی نہ آئی تو میں نے خان صاحب کو اٹھایا اور کہا کہ وہ مجھے ہسپتال لے چلیں۔ انہوں نے مجھے ضروری چیزیں سمیٹ کر تیار ہونے کو کہا اور خود ٹیکسی لینے چلے گئے۔ میں نے جلدی جلدی وہ چیزیں اکٹھی کیں جن کی ضرورت ہو سکتی تھی اور انہیں سوٹ کیس میں ٹھونسا جو ایک دن پہلے ہی خان صاحب میرے لیے لائے تھے۔ میں نے پیکنگ مکمل کی ہی تھی کہ خان صاحب واپس آ گئے اور بتایا کہ سواری مل گئی ہے اور باہر گیٹ کے سامنے کھڑی ہے۔ انہوں نے میرا سوٹ کیس اٹھایا اور مجھے سہارا دیتے ہوئے نیچے لائے باہر تین پہیوں والا رکشہ کھڑا تھا۔ ہم دونوں اور سوٹ کیس کے لیے یہ کافی تھا۔

Marfat.com

جھٹکے کھاتے ہوئے، ہم نے مختصر سا فاصلہ طے کیا اور ہم ڈاکٹر تنویر کے کلینک پہنچ گئے۔ رکشے سے اترتے ہی درد کے مارے میں نے آنکھیں بند کرلیں لیکن خان صاحب نے بازو سے مجھے سہارا دیتے ہوئے تسلی دی کہ بس یہ تھوڑی سی سیڑھیاں چڑھنی ہیں جیسے کہ انہیں ہمارا پہلے سے انتظار تھا، ڈاکٹر تنویر خود موجود تھیں۔ میں نے ہانپتے ہوئے کہا،"میرا خیال ہے کہ وقت آگیا۔" ڈاکٹر تنویر نے مجھے بازو سے پکڑا اور معائنے کے کمرے میں لے گئیں۔

"ٹیبل پر لیٹ جاؤ اور مجھے دیکھنے دو۔" معائنہ ختم ہوا تو ڈاکٹر تنویر نے بتایا کہ پیدائش کا وقت تو آگیا ہے لیکن ابھی میں ابتدائی مرحلے میں ہوں۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ سخت تھکی ہوئی ہیں اس لیے اوپر جا کر تھوڑی دیر سوئیں گی۔ اس دوران میں نرس میری دیکھ بھال کرتی رہے گی اور جب میری ضرورت پڑی تو میں فوراً آجاؤں گی۔

میں نے وہ ساری رات نرس کے ساتھ اس چھوٹے کمرے میں گزاری۔ میں بے تابی سے کمرے میں ٹہلتی تھی اور نرس مجھے تکتی تھی۔ رات گزرنے کے ساتھ ساتھ دردیں بڑھنے کے بجائے کم ہوتی گئیں اور صبح تک بالکل تھم گئیں۔ صبح نرس نے مجھ سے پوچھا کہ میں ناشتے میں کیا پسند کروں گی۔ میں نے جو کچھ بتایا وہ لے آئی۔ میں بھوک سے بے تاب تھی چنانچہ میں تین ابلے ہوئے انڈے ہڑپ کرگئی اور اوپر سے دو گلاس چائے پی۔ جب ڈاکٹر تنویر مجھے دیکھنے آئیں تو میں نے پوچھا کہ درد کیوں ختم ہو گئے ہیں تو انہوں نے بتایا کہ ابتدائی درد اسی طرح کے ہوتے ہیں اور زیادہ وقت لیتے ہیں۔

اسی دوران میں میرے شوہر کی تین بڑی بہنیں بھی پہنچ گئیں۔ فیصل آباد سے ممتاز، حمیدہ اور جمشید کی والدہ سرور۔ چونکہ میرے درد ٹھیک طرح سے نہیں اٹھ رہے تھے، ڈاکٹر تنویر نے مجھے نیچے ایک کمرے میں منتقل کر دیا، جہاں مجھے رہ رہ کر درد کے دورے اٹھتے رہے اور سارا دن میں نے تکان اور انتہائی اذیت میں گزارا۔ شام کو خان صاحب مجھ سے ملنے آئے اور پوچھا کہ میں کیا کھانا چاہوں گی۔ چونکہ مجھے بے ہوش نہیں کیا جانا تھا، میں اپنی پسند کی ہر چیز کھا سکتی تھی۔ خان صاحب میرے لیے ابلے ہوئے انڈے،

Marfat.com

چائے اور چٹ پٹے کباب لے کر آئے جو میں ندیدوں کی طرح چٹ کر گئی۔

میرے دردوں کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا، چنانچہ میں تھک کر بستر پر لیٹ گئی۔ ابھی مجھے تھوڑی سی غنودگی آئی تھی کہ مجھے شدید درد اٹھا، پہلے سے کہیں زیادہ شدید۔ ڈاکٹر تنویر بھاگی بھاگی آئیں۔ میں نے ان سے پوچھا، "کیا اب پیدائش جلد ہو جائے گی؟"

"ہاں، بس صبر کرو اور جیسا میں کہوں، ویسا کرو۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

دو تین گھنٹے اسی حالت میں گزر گئے۔ سرور گھر چلی گئیں لیکن ممتاز اور حمیدہ میرے پاس ہی رکی رہیں اور میرے لیے دعائیں پڑھتی رہیں۔ ڈاکٹر تنویر میری پائینتی بیٹھی وقتاً فوقتاً میرا معائنہ کرتی رہیں۔ درد اگرچہ شدید تھے لیکن قابل برداشت۔ نصف شب کے قریب ڈاکٹر تنویر نے اعلان کیا، "پیدائش قریب ہے، میرے ساتھ اوپر چلو۔"

اس ڈر سے کہ کہیں راستے میں مجھے درد کا کوئی دورہ نہ پڑ جائے، میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر معائنے کے کمرے میں پہنچ گئی اور میز پر لیٹ گئی۔ ڈاکٹر تنویر نے ایک بڑی سی سرنج اٹھائی اور میرے بازو میں ایک ٹیکہ لگایا۔ اس سے میرے درد دگنے ہو گئے اور میں نے چلانا شروع کر دیا۔ ممتاز اور حمیدہ مجھے تھامے ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر تنویر کے مشفق چہرے پر کرختگی کے آثار نمایاں ہوئے اور انہوں نے کہا، "مجھے یہ پسند نہیں۔ میرے کلینک میں روزانہ دو تین بچے پیدا ہوتے ہیں لیکن میرے مریض ایسے شور نہیں کرتے۔"

ایک اور درد اٹھا اور میں شدت درد سے بے چین ہو کر چلانے لگی۔ ڈاکٹر نے پھر تنبیہ کی، "ایسا نہ کرو، اگر تم برداشت نہیں کرو گی تو تمہاری دردیں ضائع ہو جائیں گی اور بچہ پیدا نہ ہوا تو مر جائے گا۔" اس انتباہ سے میں ہوش میں آ گئی اور اس کے بعد میں ان کی ہدایت پر عمل کرتی رہی۔

پھر مجھے ایک بچے کی چیخ سنائی دی۔ میں نے ڈاکٹر تنویر سے پوچھا۔

"کیا یہ میرا بچہ ہے؟"

Marfat.com

"ہاں"، ڈاکٹر تنویر نے جواب دیا۔ اب ان کی آواز میں نرمی اور شفقت تھی۔

"تمہارا بچہ پیدا ہو چکا۔" میں نے بازو اٹھا کر گھڑی دیکھی۔ اس وقت صبح کے ڈیڑھ بجے تھے۔ کیا میں اپنا بچہ دیکھ سکتی ہوں؟" میں نے التجا کی۔

"تم نے کہا تھا کہ تمہیں بیٹے کی تمنا تھی لیکن یہ تو بیٹی ہے، بڑی خوبصورت پیاری" اسے صاف کر کے، ایک کمبل میں لپیٹ کر ڈاکٹر تنویر اسے میرے پاس لائیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ نومولود بچے خوبصورت نہیں ہوتے لیکن میری بیٹی، گول مٹول، گلابی اور خوبصورت سے چہرے والی، حسن کا مجسمہ تھی۔ ڈاکٹر تنویر نے کہا،" میں ایک گھنٹہ تمہارے ساتھ ہی رہوں گی اور تمہاری نگرانی کروں گی اور دیکھوں گی کہ تم بالکل ٹھیک رہو۔"

مجھے یاد ہے میں نے ان سے پوچھا تھا،" آپ شادی نہیں کرنا چاہتیں تاکہ آپ کا اپنا بھی کوئی بچہ ہو؟"

انہوں نے جواب دیا تھا،" میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں کبھی حمل کی مشقتیں اٹھا سکوں۔ مجھے دیکھو، میں کتنی کمزور ہوں۔ میں پیدائش کے اذیت ناک درد کہاں برداشت کر سکتی ہوں۔"

میں جب تک ڈاکٹر تنویر کے کلینک پر رہی، ممتاز، حمیدہ اور سرور چوبیس گھنٹے میرے ساتھ رہیں۔ دوسرے مریضوں کی طرح، جو ایک کمرے میں دو دو یا تین تین تھیں، مجھے ایک کشادہ، ہوادار اور روشن کمرہ دیا گیا تھا اور میرے ساتھ کوئی اور مریضہ نہیں تھی۔ تیسرے دن میں چلنے پھرنے لگی اور دوسری مریضاؤں سے گفتگو کرنے لگی۔ ہم فخر سے ایک دوسرے کو اپنے بچے دکھاتے تھے۔ سبھی بچے پیارے ہوتے ہیں لیکن مجھے یقین تھا کہ میری بچی سب سے پیاری اور حسین تھی۔ امی! مجھے معاف کرنا اگر میں جانبداری برت رہی ہوں۔ خان صاحب بلاناغہ ہمیں ملنے آتے اور گھر کے کھانے کے ساتھ ساتھ بازار سے بھی کھانے پینے کی چیزیں لاتے۔ ایک ہفتے قیام کے بعد ڈاکٹر تنویر نے مجھے بتایا کہ میں گھر جا سکتی ہوں۔ انہوں نے پہلے میرا معائنہ کیا، پھر بچی کا اور

Marfat.com

بتایا کہ زچہ و بچہ دونوں بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ میری عائشہ ساڑھے آٹھ پاؤنڈ کی تھی۔

عائشہ میری پہلی بیٹی تھی اور میں بالکل ناتجربہ کار، چنانچہ اس کی دیکھ بھال کے لیے ممتاز اور حمیدہ میرے پاس ہی ٹھہری رہیں۔ ملاقاتیوں کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا جو مجھے اور میری بچی کو دیکھنے آرہے تھے۔ میرے اپنے خاندان والے بھی اور مسز عثمانی کے رشتہ دار بھی۔ جو بھی آتا میرے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر آتا اور نقد رقم بھی دے کر جاتا۔ آپ نے جو سو ڈالر مجھے بھیجے تھے وہ ہسپتال کے مصارف اور بچی کے اخراجات کے لیے کافی تھے۔ میں کیا کرتی اگر یہ رقم مجھے نہ ملی ہوتی۔ خان صاحب نے مجھے لکڑی کا ایک خوبصورت پالش شدہ پنگھوڑا خرید کر دیا ہے جس میں عائشہ کو سلایا جاتا ہے اور جھلارے دیے جاتے ہیں۔ خان صاحب کی سب بہنیں، بھانجیاں، بھتیجیاں آج کل عائشہ کے لیے فراکیں، چادریں اور نیپیز بنانے میں مصروف ہیں۔ خان صاحب نے شفیقہ کی بچی اور میری عائشہ کے عقیقے کے لیے دو بکرے خرید کر قربان کیے اور کئی دنوں تک ہم نے مزے مزے کے کھانے کھائے۔

ہمارے گھر کے ساتھ ہی خان صاحب کی بڑی بہن کا گھر مکمل ہو گیا تھا۔ مجھے وہاں منتقل کر دیا گیا ہے اور مجھے اور عائشہ کو اوپر کی منزل میں ایک کمرہ ملا ہے۔ میں نے قرآن کی عربی خطاطی اور حدیثوں سے مزین فریم دیوار پر آویزاں کیے، شیلف اپنی کتابوں سے سجائے اور کاغذات ترتیب سے ایک طرف رکھے۔ اب میرا کمرہ، مسز عثمانی والے کمرے سے بہتر نظر آتا ہے۔ بیگم مودودی اور ان کی بڑی بیٹی حمیرا مجھ سے ملنے آئیں اور بچی کے لیے بہت سے تحفے لے کر آئیں۔ ان میں فراکیں بھی تھیں جو انہوں نے گھر میں سی کر بنائی تھیں۔ حمیرا نے کہا کہ ننھی عائشہ بالکل مجھ پر گئی ہے۔

جب میں اپنے شوہر کی بڑی بہن کے مکان میں منتقل ہوئی تو اس کے فوراً بعد مجھے تیز بخار ہو گیا۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا اور اس نے تشخیص کی کہ یہ ملیریا بخار ہے۔ پاکستان آنے کے بعد پانچویں بار مجھ پر ملیریا کا حملہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اگر ملیریا کے جراثیم جسم میں موجود ہوں تو حمل سے فراغت کے بعد بخار ہو جاتا ہے۔ میں ایک مہینے

Marfat.com

تک اس بیماری میں مبتلا رہی اور چونکہ اس دوران میں بہت کمزور ہو گئی تھی، خان صاحب کی بہنوں نے کہا کہ بچی کو اپنا دودھ زیادہ نہ پلاؤں ورنہ میری صحت اور بگڑ جائے گی۔ چنانچہ میں اسے دن میں صرف دو یا تین بار اپنا دودھ دیتی تھی۔ باقی اوقات میں وہ سے اوپر کا دودھ پلاتی تھیں۔ جون میں میرا کمرہ دن کے وقت بھٹی کی طرح تپنے لگا تھا، اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ اسے شفیقہ کے کمرے میں منتقل کر دیا جائے جو کافی ٹھنڈا رہتا تھا۔ چنانچہ اب اسماء اور عائشہ ساتھ ساتھ ہی سوتی ہیں۔

اگرچہ میری بیٹی عائشہ کو اسماء کی نسبت کہیں زیادہ توجہ ملی اور جب میں بیمار تھی تو خان صاحب کی نوجوان بھانجی نادرہ نے بڑی شفقت سے اس کا خیال رکھا لیکن دو اگست کو وہ بیمار ہوگئی۔ خان صاحب نے بتایا کہ عائشہ کو ہسپتال میں داخل کرلیا گیا ہے اور حمیدہ، ممتاز اور نادرہ اس کے ساتھ ہی ہیں۔ میں خود اپنی بچی کے پاس جانا چاہتی تھی لیکن مجھے بخار کے ساتھ سخت زکام لگا ہوا تھا۔ مجھے ذرا برابر بھی شبہ نہیں تھا کہ عائشہ بیمار ہوجائے گی کیونکہ اسی دن صبح میں نے اسے دودھ پلایا تھا اور اس وقت وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ بعد کے دنوں میں میں التجا کرتی رہی کہ مجھے عائشہ کے پاس لے جایا جائے لیکن وہ ٹالتے رہے۔ چار دن کے بعد خان صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق وہ آنتوں کے بخار میں مبتلا تھی لیکن اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے اور وہ اپنے پنگھوڑے میں ہنس کھیل رہی ہے اور کل ہم اسے گھر لے آئیں گے۔ سوتوار کی صبح میں خان صاحب کے ساتھ ایک تانگے میں ہسپتال گئی۔ میں اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے بے تاب تھی اور دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ اپنے گلابی پاؤں چلاتے ہوئے کیسے ہنس کھیل رہی ہے۔ جب ہم بچوں کے جنرل وارڈ میں داخل ہوئے تو مجھے سکتہ ہو گیا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی حزن و ملال کا ایسا سماں نہیں دیکھا تھا۔ یہ وارڈ کوئی کمرا نہیں بلکہ ایک تاریک راہ داری تھی جس میں بچوں کی چارپائیاں بچھا دی گئی تھیں اور وہ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں۔ میں نے کبھی اتنے بیمار اذیت میں مبتلا بچے نہیں دیکھے۔ ان کی حالت انتہائی نازک تھی اور ان کے سرھانے ان کی فکر مند مائیں، بہنیں، خالائیں اور

Marfat.com

بہن بھائی بیٹھے تھے۔ پاکستان کے سرکاری ہسپتالوں میں نرسنگ سٹاف کی کمی ہے اس لیے مریضوں کے قریبی عزیز اور رشتے دار ہی ان کی تیمارداری کرتے ہیں۔ ڈاکٹروں کا کام صرف یہ ہے کہ وہ مناسب دوائیں تجویز کریں اور مریضوں کا ریکارڈ رکھیں۔ خان صاحب لوہے کے ایک چھوٹے سے پنگھوڑے کے پاس رک گئے۔ میں نے اس میں لیٹی ہوئی بچی کو دیکھا جو انتہائی نحیف ونزار تھی۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی اور وہ یوں ساکت لیٹی تھی جیسے مرچکی ہو۔ اس کے گال اندر دھنسے ہوئے تھے اور آنکھیں یوں لگتی تھیں جیسے دو سوراخ۔

"عائشہ کہاں ہے؟" میں نے دیوانگی سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جب مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی بچی کے پاس ہی کھڑی ہوں تو مجھ پر دہشت طاری ہو گئی۔ میں اسے پہچان ہی نہیں سکی تھی۔

"وہ بڑی سخت بیمار تھی۔ اب تو اس کی حالت بہت بہتر ہے۔ کل تک ڈاکٹر اسے فارغ کردیں گے اور ہم اسے گھر لے جائیں گے۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" خان صاحب نے مجھے تسلی دی لیکن میرا دل بھر آیا اور میں خان صاحب کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔

حمیدہ اور نادرہ دوسرے دن بچی کو گھر لے آئیں۔ میں چونکہ ابھی تک زکام میں مبتلا تھی، اس لیے میرے شوہر نے کہا کہ میں بچی کو نادرہ کے حوالے کردوں۔ وہ اسے اپنے کمرے میں رکھے اور وہی اس کا خیال رکھے۔ میں عائشہ کو دودھ پلانا چاہتی تھی لیکن خان صاحب نے کہا کہ جب تک میری صحت پوری طرح بحال نہیں ہو جاتی، میں دودھ پلانے سے باز رہوں۔ سو عائشہ کی ساری ذمہ داری نادرہ نے سنبھال لی اور اس نے اس پر ایسی محبت اور شفقت نچھاور کی جیسے وہی اس کی ماں ہو۔ جب بھی عائشہ سو کر اٹھتی اور روتی، نادرہ جھٹ سے اس کے لیے دودھ بناتی۔ ہر گھنٹے اس کے نیپیز بدلتی اور اسماء کے برعکس جو بیچاری گندی رہتی تھی، نادرہ ہمیشہ عائشہ کو صاف ستھرا رکھتی تھی۔ مکھیوں سے بچانے کے لیے، خان صاحب عائشہ کے لیے گلابی رنگ کی نائلون کی ایک چھتری

Marfat.com

لے آئے۔ شفیقہ کی بیٹی اسماء کو اتنی توجہ بھی نہیں ملتی تھی اور وہ گندی بھی رہتی تھی لیکن وہ ٹھیک ٹھاک تھی اور قمر کا چھوٹا بیٹا جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ کسی بھی وقت اللہ کو پیارا ہو جائے گا، روز بروز صحت مند ہوتا جا رہا تھا اور بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا لیکن میری بچی کی صحت تمام تر توجہ کے باوجود گرتی جا رہی تھی۔ اس کا وزن تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میرا دودھ پینے سے اس کی حالت سنبھل جائے گی اس لیے میں نے اصرار کیا کہ مجھے دودھ پلانے دیں لیکن عائشہ میرا دودھ نہیں پیتی تھی۔ وہ اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ اس سے دودھ چوسا ہی نہیں جاتا تھا۔ میں جب دودھ پلانے کے لیے اسے اٹھاتی اور سینے سے لگاتی وہ بری طرح رونے لگتی۔ وہ مجھے پہچانتی ہی نہیں تھی۔ نادرہ ہی کو اپنی ماں سمجھتی تھی۔

عائشہ کے دن ایسے ہی گزرتے رہے۔ وہ اتنی کمزور تھی کہ سونے کے سوا اسے کوئی اور کام نہ تھا۔ اٹھتی تو کمزور آواز میں رونے لگتی جیسے دودھ کی بوتل مانگ رہی ہو۔ وہ گلابی نائلوں کی چھتری کے نیچے سکون سے سوئی رہتی۔ نادرہ ہر طرح سے اس کا خیال رکھتی اور اسے صاف ستھرا کر کے خوشبوؤں میں بسائے رکھتی۔ دودھ پینے کے بعد وہ بے چین ہوتی تو نادرہ اسے کندھے سے لگا کر ٹہلتی اور اسے جھلارے دیتی۔ ہر شخص عائشہ سے پیار کرتا۔ شفیقہ کے بچے بھی اپنی سوتیلی بہن پر محبت نچھاور کرتے۔ اس کی زندگی کی آخری صبح تھی جب نادرہ اسے تیار کر کے نیچے لے گئی اور اسے چار پائی پر لٹا دیا۔ ننھا محمد فاروق آیا اور اس نے اسے پیار کیا۔ دو سال کی حمیرا اس کے قریب بیٹھ گئی۔ جب بھی چوسنی اس کے منہ سے گرتی اور وہ رونے لگتی تو حمیرا بڑے پیار سے چوسنی اس کے منہ میں دے دیتی۔ پھر خان صاحب آئے اور بڑی شفقت سے اسے دیکھا۔ عائشہ نے اپنے ابو کو دیکھا اور مسکرانے لگی۔

اس رات میں معمول سے ذرا جلدی سو گئی۔ اچانک ممتاز نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔ وہ کہہ رہی تھی، "مریم! مریم! عائشہ تمہیں بلا رہی ہے۔" نیند کے عالم میں، میں اٹھی، غنودگی دور کرنے کے لیے سر کو جھٹکا اور ممتاز کے ساتھ چل پڑی۔ دروازے پر قمر

Marfat.com

کھڑے تھے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا جیسے کچھ کہنے سے ہچکچا رہے ہوں۔ پھر بولے، "عائشہ مر گئی" ۔ میرے گھٹنے کانپ رہے تھے۔ میں بمشکل کھڑی ہو سکتی تھی۔ لیکن پھر ہمت کر کے میں نے خود کو سنبھالا اور نیچے صحن میں آگئی۔ میری بوڑھی ساس، ان کی چھوٹی بہن ثریا، حمیدہ، خان صاحب کی سب بہنیں، بھانجیاں، بھتیجیاں صحن میں جمع تھیں اور رو رہی تھیں۔ قریبی گھروں کی کچھ پنجابی ہمسائیاں بھی آئی ہوئی تھیں۔ شفیقہ بھی اپنی پانچ ماہ کی بچی عاصمہ کو اپنی گود میں اٹھائے رو رہی تھی۔ اور میری عائشہ چارپائی پر ساکت لیٹی تھی۔ اسے ایک پرانی رضائی سے ڈھک دیا گیا تھا۔ اس کے کانوں میں روئی ٹھونس دی گئی تھی اور جبڑوں کو کپڑے کی ایک پٹی سے باندھ دیا گیا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد قمر اور اس کے بڑے بھائی الیاس خان صاحب کے ساتھ واپس آئے۔ خبر سن کر انہوں نے کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہیں کیا۔ بس خاموشی سے بڑے پُروقار انداز میں کھڑے رہے۔ نادرہ نے پمپ سے پانی کی ایک بالٹی بھری اور عائشہ کو صابن مل مل کر نہلایا۔ نہلانے کے بعد نادرہ اوپر جا کر ایک سفید چادر لائی اور عائشہ کو اس میں لپیٹ دیا۔ یہ ننھی بچی کا کفن تھا۔ تمام عورتیں زور زور سے رونے لگیں جب خان صاحب اس ننھے جسم کو بازوؤں میں اٹھا کر باہر لے گئے جہاں ان کی جماعت کے دوست جمع تھے۔ ہم معصوم عائشہ کی آخری جھلک دیکھنے کے لیے دروازے پر جمع ہو گئیں اور پردے سے اس وقت تک جھانکتی رہیں جب تک خان صاحب اور ان کے دوست، تنگ اور تاریک گلیوں سے گزرتے، آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔

ٹھیک تین دن بعد میرے شوہر کا بیس سالہ جوان بھتیجا جاوید جو عرصے سے گردوں کی بیماری میں مبتلا تھا، چل بسا۔ سب گھر والے اس کے سرہانے جمع تھے اور خان صاحب قرآن سے سورۂ یٰسین کی تلاوت کر رہے تھے۔ جو ہر مرنے والے مسلمان کو آخری وقت میں سنائی جاتی ہے۔ اس رات محمودہ کی چارپائی اس کے بستر کے ساتھ ہی لگائی گئی تھی تاکہ ماں بیٹا آخری گھڑیاں گزار سکیں۔ جونہی اس نے آخری سانس لیا، اس کی آخری رسوم ادا کی گئیں۔ اس کے کپڑے اتار کر اسے ایک چادر میں لپیٹ دیا

Marfat.com

گیا۔ اس کے کانوں میں روئی ٹھونس دی گئی اور جبڑا کپڑے کی ایک پٹی سے باندھ دیا گیا۔ پھر اس کے بھائیوں نے اس کی چارپائی صحن میں رکھ دی جہاں گھر کے تمام افراد اور ہمسائے سوگوار حالت میں جمع تھے۔ پھر خان صاحب، الیاس، ابرار، شبیر اور ظہیر نے جاوید کو صابن اور پانی سے نہلایا، اسے سفید کفن میں لپیٹا اور چارپائی پر لٹا دیا۔ چار آدمی اس کی چارپائی اٹھا کر باہر لے گئے۔ جنازہ اٹھایا گیا اور عورتیں دروازے سے لوگوں کو جاتے دیکھتی رہیں۔

زندگی کتنی عجیب ہے، جس دن عائشہ کا انتقال ہوا اس دن ستمبر کی چوبیس تاریخ تھی، جمعے کا دن۔ اس دن پاکستان کی سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ سنایا کہ جماعت اسلامی پر پابندیاں غیر قانونی تھیں۔ چنانچہ حکومت نے جماعت پر سے پابندی اٹھالی اور چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر جماعت پورے زور و شور سے بحال ہوگئی۔ چونکہ سپریم کورٹ نے جماعت اسلامی پر پابندیوں کو بلا جواز قرار دے دیا تھا۔ مولانا مودودی اور جماعت کے دوسرے رہنما بھی رہا ہوگئے اور انہوں نے پھر سے اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

اب گرمیاں رخصت ہو رہی ہیں اور فضا میں سردیوں کی خنکی اتر آئی ہے۔ میں چارپائی پر آلتی پالتی مارے اپنی پیاری بوڑھی ساس کے ساتھ آلو اور پیاز چھیل رہی ہوں۔ میرا میاں مٹھو میرے ساتھ ہی بیٹھا ہے۔ وہ بھی خوشی اور غم کے سب نشیب و فراز سے گزرا ہے۔ میری ساس اپنے پسندیدہ موضوع، جالندھر کے پرانے اچھے دنوں کی باتیں کر رہی ہیں۔ آلو اور پیاز چھیلتے ہوئے وہ بتا رہی ہیں کہ جالندھر کی سبزیاں بڑی عمدہ اور اعلیٰ معیار کی ہوتی تھیں کیونکہ انہیں بالکل صاف پانی سے اُگایا جاتا تھا۔ یہاں سنت نگر میں جو سبزیاں ملتی ہیں، گھٹیا کوالٹی کی ہوتی ہیں کیونکہ ان کے کھیتوں کو گٹر کے گندے پانی سے سیراب کیا جاتا ہے۔ "اوہ، جالندھر کے آلو پیاز اچھے تھے! وہاں کی ہر چیز اچھی تھی"۔ اتنے میں ننھا فاروق بھاگتا ہوا آتا ہے۔ میری ساس اسے گلے کر پیار کرتی ہیں اور اس سے پوچھتی ہیں، "عائشہ کہاں ہے؟"۔

Marfat.com

تین سالہ فاروق کی بڑی بڑی مند جاتی ہیں جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر کہتا ہے،"وہ اللہ کے گھر گئی ہے۔"

میں اوپر آسمان کی طرف دیکھتی ہوں۔ سورج غروب ہونے کو ہے۔ مغرب کی اذان ہوا چاہتی ہے۔ اچانک مجھے درد کی ایک ٹیس اٹھتی ہے اور میں محسوس کرتی ہوں کہ میری جوانی رخصت ہو چکی ہے اور میں مامتا کی مجند بلوغت کی سرحدوں میں داخل ہو چکی ہوں۔

آپ کی محبت کرنے والی بیٹی

مریم۔

Marfat.com

پس تحریر

از محمد یوسف خان

آپ بیتی پر مشتمل یہ خطوط پڑھنے والے قارئین یقیناً یہ جاننا چاہتے ہوں گے کہ یہ خط تو پچاس سال پہلے لکھے گئے تھے۔ان کے بعد مریم جمیلہ کا کیا بنا؟

بے بی عائشہ کی موت کے بعد مریم جمیلہ کے ہاں چار بچے پیدا ہوئے، دو بیٹیاں دو بیٹے۔حلیمہ سعدیہ (پیدائش 1965ء)، خالد فاروق (پیدائش 1967ء)، حیدر فاروق خان (پیدائش 1968ء) اور ماریہ خانم (پیدائش 1972ء)۔فائن آرٹ میں ایف کرنے کے بعد حلیمہ سعدیہ کی 1983ء میں ایک رشتہ دار شہر یار خان سے شادی ہوگئی جو پولیس آفیسر تھے۔ان کی دو بیٹیاں ہیں ایمن (پیدائش 1985ء) اور عریبہ (پیدائش 1987ء)۔ان بچیوں کی پیدائش سے مریم نانی بن گئیں اور اس پر بڑی خوش تھیں۔وہ فیصل آباد میں اپنے ذاتی مکان میں رہتے ہیں اور اکثر لاہور آتے رہتے ہیں۔کالج کے دنوں میں حیدر فاروق نے طلبہ تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ اسلامی موضوعات پر لکھی گئی مولانا کی کتابیں اور جماعت اسلامی کا لٹریچر شوق سے پڑھتا ہے۔رمضان کے آخری عشرے میں وہ اعتکاف میں بیٹھتا رہا ہے۔جون سے اگست 1987ء تک حیدر فاروق، روسی جارحیت کے خلاف جہاد میں حصہ لینے کے لیے افغانستان گیا اور مجاہدین کے ساتھ مل کر لڑتا رہا۔خالد اور حیدر دونوں نے اردو میڈیم سنٹرل ماڈل سکول سے میٹرک کیا۔پھر خالد نے گورنمنٹ کالج لاہور سے اور حیدر نے ایف سی کالج سے ایف۔اے کیا اور 1987ء میں دونوں اپنے امریکی خاندان سے ملنے اور کام کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرنے امریکہ چلے

Marfat.com

گئے۔ اگست، ستمبر 1989ء میں، میں بھی اپنے بیٹوں، مریم کے والد، بہن اور چچا زاد بہن میری بکندر سے ملنے امریکہ گیا۔ وہاں اپنے بیٹوں کے ساتھ ساتھ میں نے اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ (اکنا) کے کنونشن میں شرکت کی جو 11 سے 13 اگست 1989ء کو روڈ آئی لینڈ کی کنگسٹن یونیورسٹی میں منعقد ہوا تھا۔ پھر اسلامک سوسائیٹی آف نارتھ امریکہ (اسنا) کے عظیم کنونشن میں شرکت کی جو یکم سے 4 ستمبر 1989ء کو ڈیٹون، اوہائیو میں منعقد ہوا۔ اس میں دنیا بھر کے مسلمان رہنماؤں نے شرکت کی تھی۔

1989ء کے موسم سرما میں خالد نے لاہور میں اپنے رشتہ داروں میں ایک لڑکی فرحانہ سعید سے شادی کی۔ وہ آج کل نیو برونسوک، نیو جرسی میں رہتے ہیں۔ خالد سکیورٹی گارڈ کی کسی کمپنی میں کام کرتا ہے۔ ماریہ خانم اسلامیہ گرلز کالج میں سال دوئم کی طالبہ ہے۔ سائنس کے مضامین پڑھتی ہے اور اسلامی جمیعت طالبات کی سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہے۔ وہ بڑی محبت سے اپنی امی کا خیال رکھتی ہے۔

ان خطوں کی تحریر کے بعد سے ہمارے بہت سے قریبی لوگ ہو ہماری زندگی کا حصہ تھے، اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شفیقہ کی وفادار ملازمہ میرا مائی کا لاڈلا پوتا تپ دق کی وجہ سے مر گیا تھا۔ اس کے بعد اس کا دل ٹوٹ گیا تھا اور وہ بھی 1969ء میں انتقال کر گئی۔ میری دو پیاری بہنیں بھی داغ مفارقت دے گئیں۔ ممتاز نے 1966ء میں اور گوہر زمان نے 1984ء میں دل کا دورہ پڑنے پر جان دی۔ ان کی وفات پر سبھی کو بڑا دکھ تھا۔ میری جو تین بہنیں زندہ ہیں، بیوہ ہیں اور بہت کمزور ہیں۔ میری بہت پیاری، پاکباز و پاک سیرت والدہ جو مریم جمیلہ کی گہری سہیلی تھیں اور اس سے نو مسلم ہونے کے ناطے بہت پیار کرتی تھیں۔ آخری عمر میں یاداشت کھو بیٹھی تھیں اور 1980ء میں، گھر کے تمام افراد کی موجودگی میں وہ خاموشی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئیں۔ مریم جمیلہ کی والدہ لیلیے کے سرطان میں مبتلا تھیں۔ اسی بیماری میں 1985ء میں انہوں نے فلوریڈا والے گھر میں دم توڑا۔ اس وقت ان کی عمر تراسی برس تھی۔ مریم جمیلہ اور اس کی والدہ میں آخر تک خط و کتابت رہی۔ انہیں اپنے پہلے پوتے نو بہار خان کو کھونے کا بڑا

Marfat.com

دکھ تھا جو 1984ء میں پانچ ماہ کی عمر میں بچھڑ گیا۔

مارلینا گارشیا 1980ء کی گرمیوں میں مریم جمیلہ سے ملنے آئی۔ دونوں سہیلیاں اپنے اپنے دل کی بات کرتی رہیں اور طویل مذاکرات کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے فوراً بعد اسے دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ اسے لاہور کے ایک ہسپتال میں داخل کروایا گیا تھا لیکن ہر علاج بے سود رہا وہ مرکز جماعت اسلامی منصورہ کے قبرستان میں دفن ہے۔

حکیم رائے نعمت علی خان، شاید اسے کبھی نہ دیکھ سکیں لیکن وہ مریم جمیلہ کو بھولے نہیں اور ہر سال پتوکی سے اسے عید کی مبارک باد بھیجتے ہیں۔

ہمارا سب سے ناقابل تلافی، تباہ کن نقصان اس وقت ہوا جب مولانا مودودی جو کئی برسوں سے صحت کے بہت سے مسائل سے دوچار تھے اور جو اپنے علاج کے سلسلے میں اپنے بیٹے احمد فاروق کے ساتھ دوسری مرتبہ امریکہ گئے تھے، دل کا دورہ پڑنے سے نیویارک میں بفیلو ہسپتال میں 22 ستمبر 1979ء کو جان بحق ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر 76 سال تھی۔ بیگم مودودی کے اصرار پر ان کی قبر ان کے گھر کے پچھلے صحن میں بنائی گئی۔ مولانا مودودی ہمارے ساتھ نہیں ہیں لیکن ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی قائم و دائم ہے جس کا ہیڈ کوارٹر منصورہ لاہور میں ہے۔ اسلامی موضوعات پر انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جو کسی بھی ہم عصر مصنف کے مقابلے میں پوری دنیا میں سب سے زیادہ ہیں، میں روزانہ ان کی لکھی ہوئی قرآن کی تفسیر تفہیم القرآن پڑھتا ہوں۔

1950ء میں اپنی پوری جوانی کے دوران میں مولانا مودودی کا مخلص پیروکار اور جماعت اسلامی کا ثابت قدم کارکن رہا ہوں۔ مارچ سے جون 1977ء میں انتخابات میں دھاندلی کے الزام میں اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف پاکستان قومی اتحاد نے ملک گیر احتجاجی مہم چلائی تھی، جس میں، میں نے حصہ لیا۔ اس پر مجھے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ پہلی مرتبہ مجھے جالندھر میں انگریز حکمرانوں کی

Marfat.com

طرف سے قید کی سزا ہوئی تھی جب میں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا۔

تقسیم ہند کے بعد قیام پاکستان سے اب تک تمام رکاوٹوں کے باوجود جن میں حکومت کی طرف سے جوروستم، قومی پریس میں الزامات کی بوچھاڑ، پولیس کی طرف سے ہراساں کرنے کے اقدامات، بار بار کی پابندیوں، سیاسی قتل، اس کے رہنماؤں اور کارکنوں کی گرفتاریاں، مارشل لاء کا نفاذ، فوجی حکومتوں کا قیام، انتخابی شکستیں اور اب ہماری نوجوان وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کی طرف سے ماڈرن ازم وسیکولرازم کا پرچار اور عالمی طاقتوں کے سامنے سرنگوں ہونے کے اقدامات شامل ہیں۔ جماعت اسلامی، ایک مستند اسلامی سیاسی، معاشی اور معاشرتی انصاف پر مبنی نظام کے لیے جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ زبردست پرمشقت کوششوں اور مولانا مودودی کی طرح ذاتی قربانیوں کے بغیر مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

31 مئی 1970ء کو یوم شوکت اسلام مناتے ہوئے لاہور میں ایک زبردست جلوس نکالا گیا جس کی قیادت مولانا مودودی نے کی تھی۔ اس میں دس لاکھ سے زائد افراد نے شرکت کر کے اسلام سے بھرپور وابستگی اور مارکسزم اور کمیونزم جیسے تمام لادینی اور غیر اسلامی نظاموں کی مخالفت کا عزم صمیم ظاہر کیا تھا۔

یہ بدقسمتی سے ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ مغرب میں اسلام قبول کرنے والے افراد جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر مبنی کسی روایتی یا قدامت پسند معاشرے کو ڈھونڈتے ہیں تو وہ کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ خطوط پچیس سال (اس ایڈیشن کی اشاعت تک پچاس سال گزر چکے ہیں) پہلے لکھے گئے تھے۔ اس وقت سے اب تک پاکستانی معاشرے میں زبردست تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں جن سے دور دراز کے علاقے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ ہمارے نقطہ نظر سے یہ تبدیلیاں ہمیں اسلام سے اور دور لے گئی ہیں۔

1974ء میں تپتی ہوئی گرمیوں میں میرے ایک بچے کو ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔ اس سے یہ بیماری مریم جمیلہ کو بھی لگ گئی۔ وہ چھ ہفتے تک تیز بخار میں مبتلا رہیں، جدید

Marfat.com

دوائیں بالکل بے اثر ثابت ہوئیں۔ میرے ایک دوست حکیم کی دواؤں سے ان کا بخار اترا اور جب سے ان کی صحت بالکل ٹھیک ہے۔

میری اہلیہ نے گیارہ کتابیں اور بیس سے زیادہ کتابچے لکھے ہیں۔ سب اسی موضوع سے متعلق ہیں کہ آج کی دنیا میں تمام تر مخالفت کے باوجود اسلام پر عمل کرنے کی جدوجہد کیوں کر کی جائے۔ مجھے ان کتابوں کا پبلشر اور تقسیم کنندہ ہونے پر بہت خوشی ہے۔ وہ ایک مستند تبصرہ نگار بھی ہیں اور برطانیہ سے شائع ہونے والے سہ ماہی رسالے "مسلم ورلڈ بک ریویو" میں اسلام کے موضوع پر شائع ہونے والی کتابوں پر ان کے تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے مضامین، مقالے اور دنیا بھر میں ان کے عربی، فارسی، اردو، ترکی، بنگالی، انڈونیشی اور ملائشی زبانوں میں ترجمے بھی شائع ہوئے ہیں۔ وہ عالمی مسلمان رہنماؤں، مصنّفین اور نومسلموں سے خط و کتابت میں مصروف رہتی ہیں۔ وہ ٹیلی ویژن اور ویڈیو سے نفرت کرتی ہیں، انہیں وقت کا ضیاع سمجھتی ہیں۔ کتابوں کی رسیا ہیں اور اپنے استعمال کے لیے انہوں نے ایک وسیع لائبریری بنا رکھی ہے۔

مریم جمیلہ کے میری پہلی بیوی شفیقہ سے بہت اچھے تعلقات ہیں اور شفیقہ کے نو بچوں، دس پوتے پوتیوں، اور میرے وسیع خاندان کے تمام افراد سے خوشگوار اور دوستانہ مراسم ہیں۔ پاکستانی طرز زندگی سے وہ پوری طرح مطابقت اختیار کر چکی ہیں اور آج کل میرے گھر کی قابل عزت و تکریم فرد ہیں۔

محمد یوسف خان

سنت نگر- 17 صفر المظفر 1410ھ

20 ستمبر 1989ء

Marfat.com

مریم جمیلہ پردے میں (1965)

Marfat.com

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
پاکستان آمد کے بعد مریم جمیلہ کے سرپرست (1975)

Marfat.com

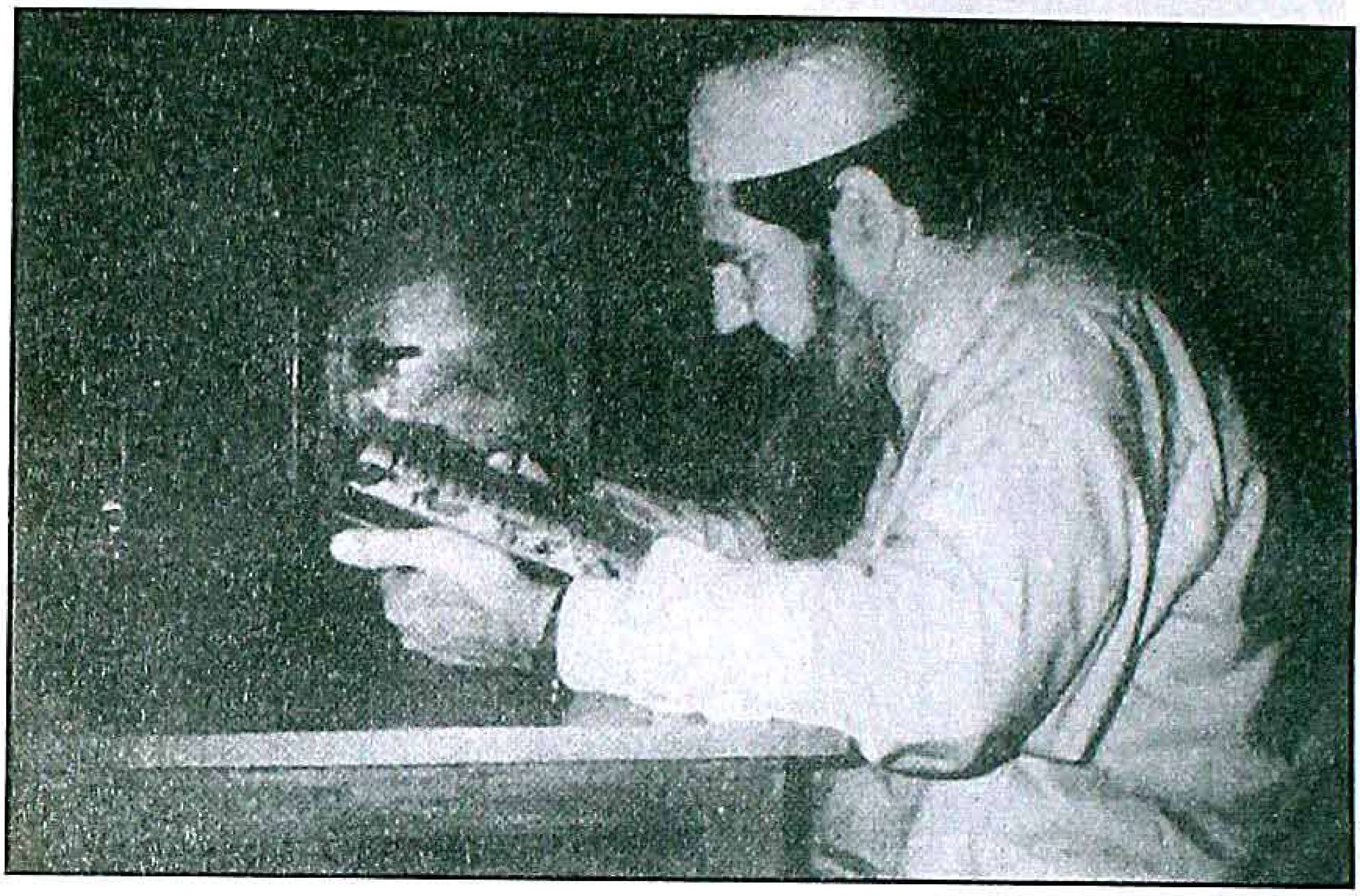

یوسف خان مولانا مودودی کی تفہیم القرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے (1989)

خالد فاروق اپنی شادی کے دن (3 فروری، 1989)
یوسف خان بھی ہمراہ ہیں

Marfat.com

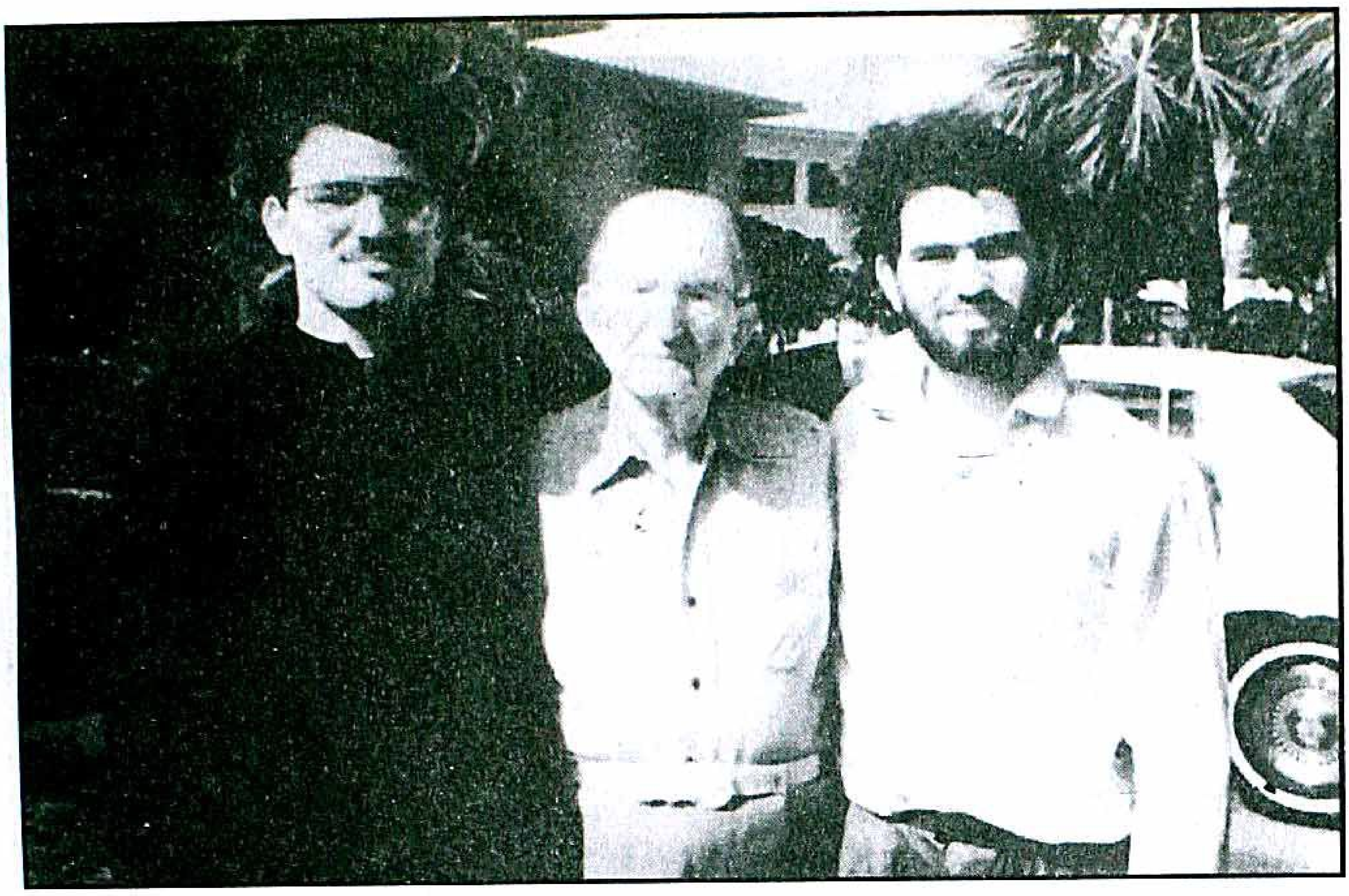

خالد اور حیدر فاروق مریم جمیلہ کے والد کے ساتھ (1988)

مریم جمیلہ کی بیٹیاں حلیمہ سعدیہ (دائیں جانب) اور ماریہ خانم (1975)

Marfat.com

یوسف خان کے وسیع خاندان کے بچے (1973)

نعیم، فاروق، راحت، قمر، عثمان

Marfat.com

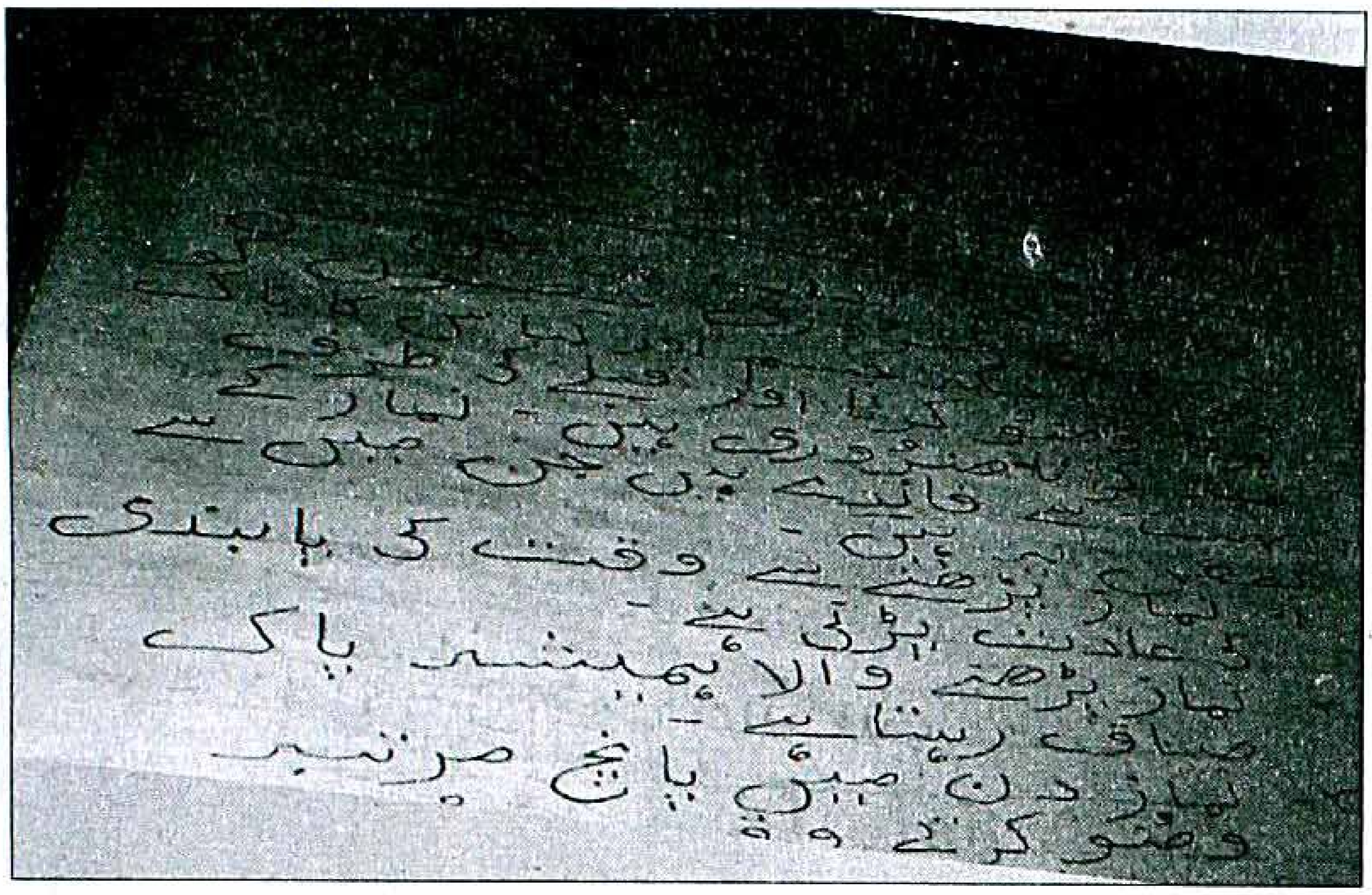

نماز پڑھنے سے وقت کی پابندی
کی عادت پڑتی ہے
نماز پڑھنے والا ہمیشہ پاک
صاف رہتا ہے۔
نماز دن میں پانچ مرتبہ
وضو کرنے

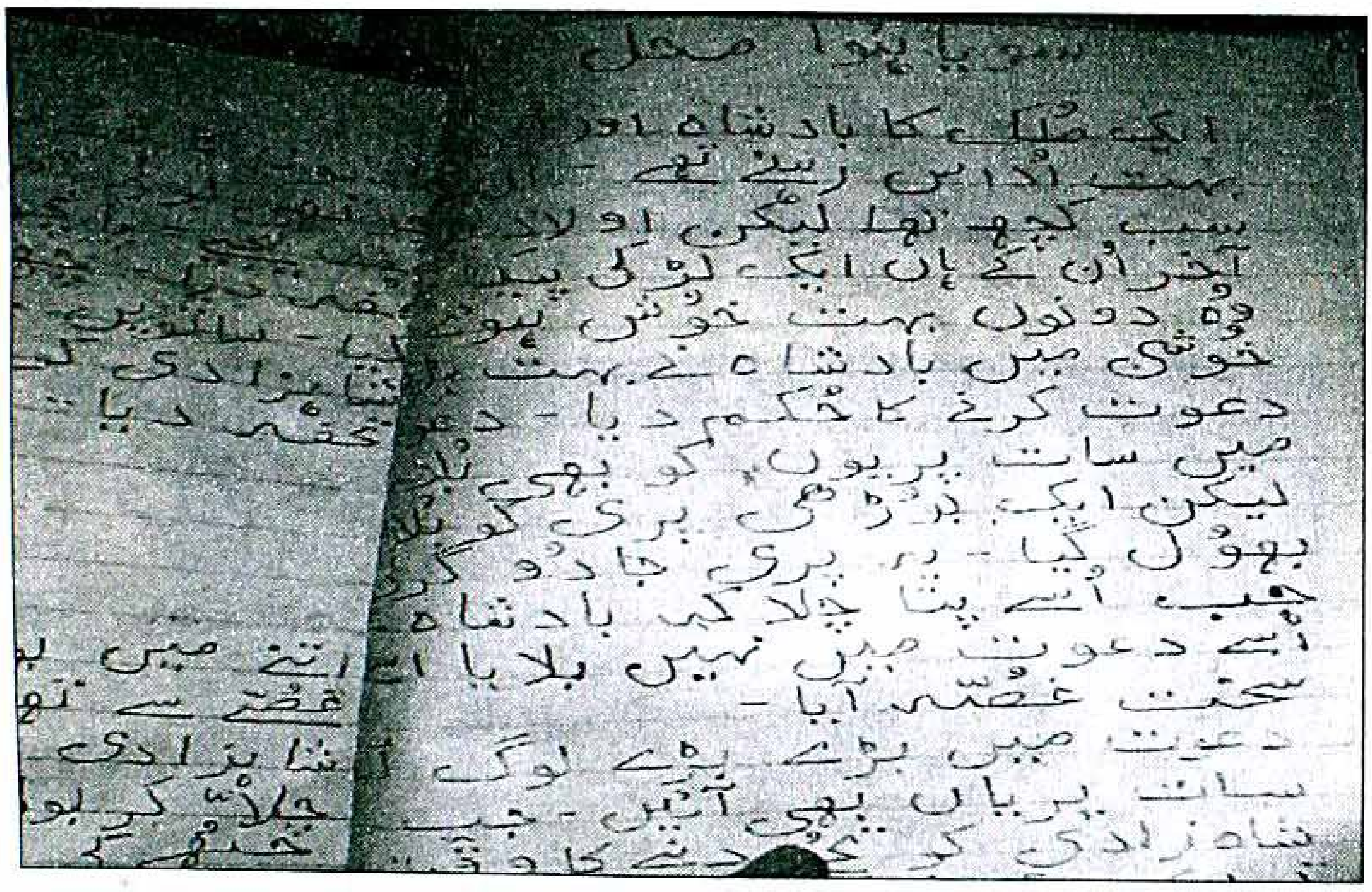

ایک ملک کا بادشاہ اور
بہت اداس رہتے تھے۔
سب کچھ تھا لیکن اولاد
آخر ان کے ہاں ایک لڑکی پید
وہ دونوں بہت خوش ہوئے
خوشی میں بادشاہ نے بہت
دعوت کرنے کا حکم دیا۔ دعوت
میں سات پریوں کو بھی بلا
لیکن ایک بوڑھی پری کو بلا
بھول گیا۔ یہ پری جادوگر
جب اسے پتا چلا کہ بادشاہ
اسے دعوت میں نہیں بلایا
سخت غصہ آیا۔
دعوت میں بڑے بڑے لوگ
سات پریاں بھی آئیں۔ جب

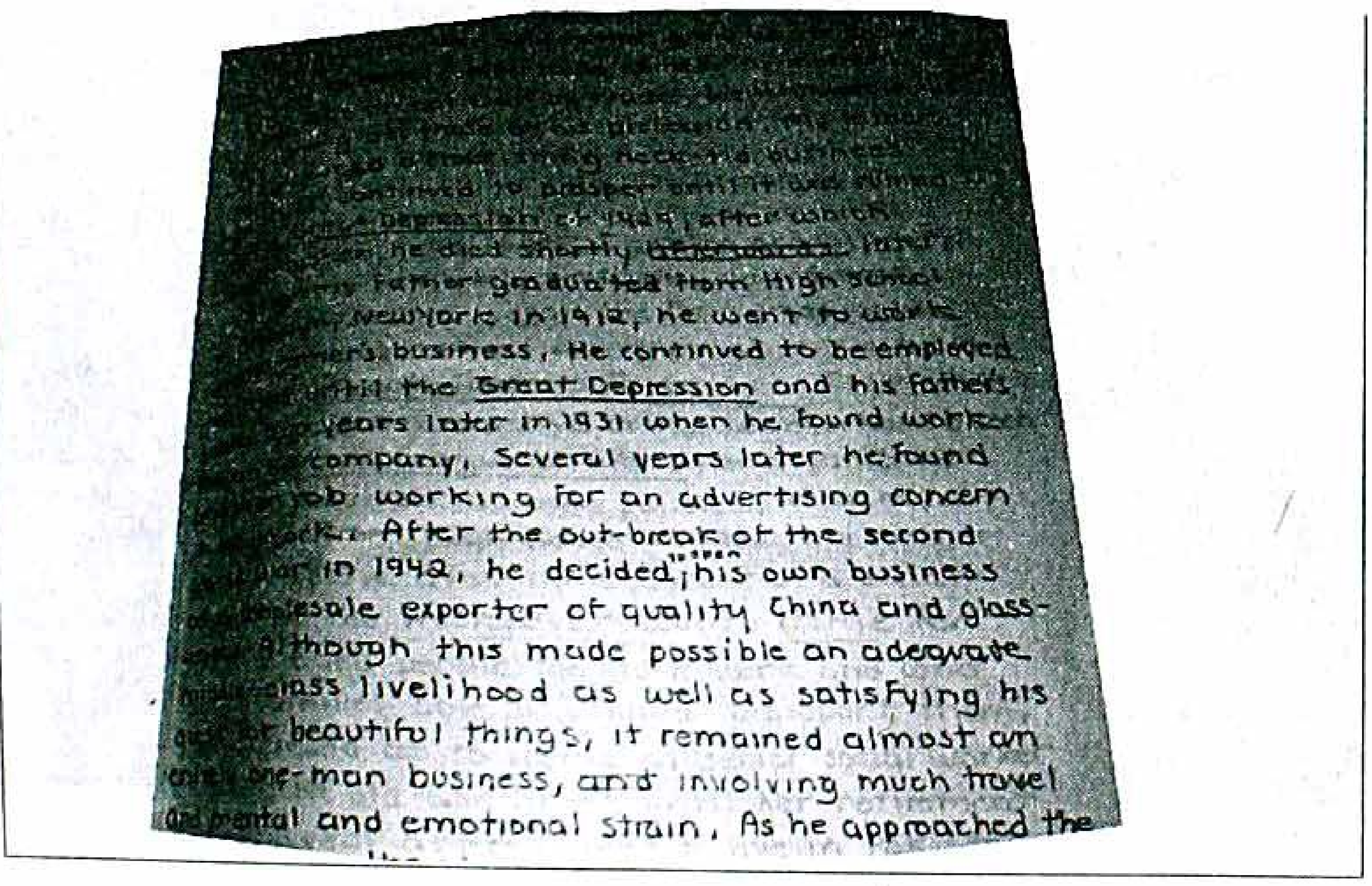

continued to prosper until it was
Depression of 1929, after which
he died shortly
father graduated from High School
New York in 1912, he went to work
business. He continued to be employed
until the Great Depression and his father's
years later in 1931 when he found work
company. Several years later he found
job working for an advertising concern
After the out-break of the second
war in 1942, he decided open his own business
wholesale exporter of quality China and glass-
Although this made possible an adequate
middle-class livelihood as well as satisfying his
for beautiful things, it remained almost an
one-man business, and involving much travel
and mental and emotional strain. As he approached the

مریم جمیلہ کی قلمی تحاریر کا عکس

Marfat.com

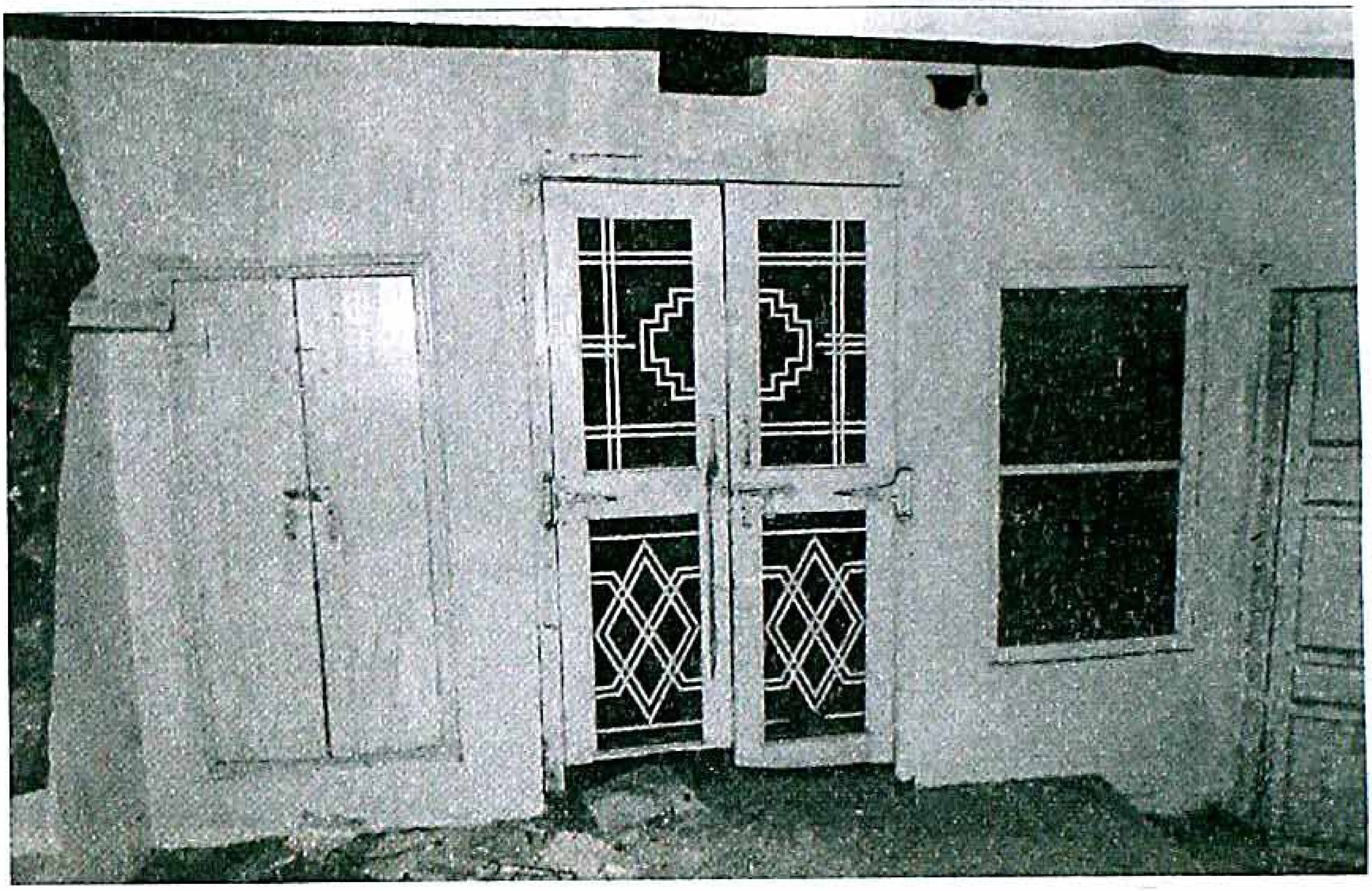

مریم جمیلہ کا رہائشی کمرہ

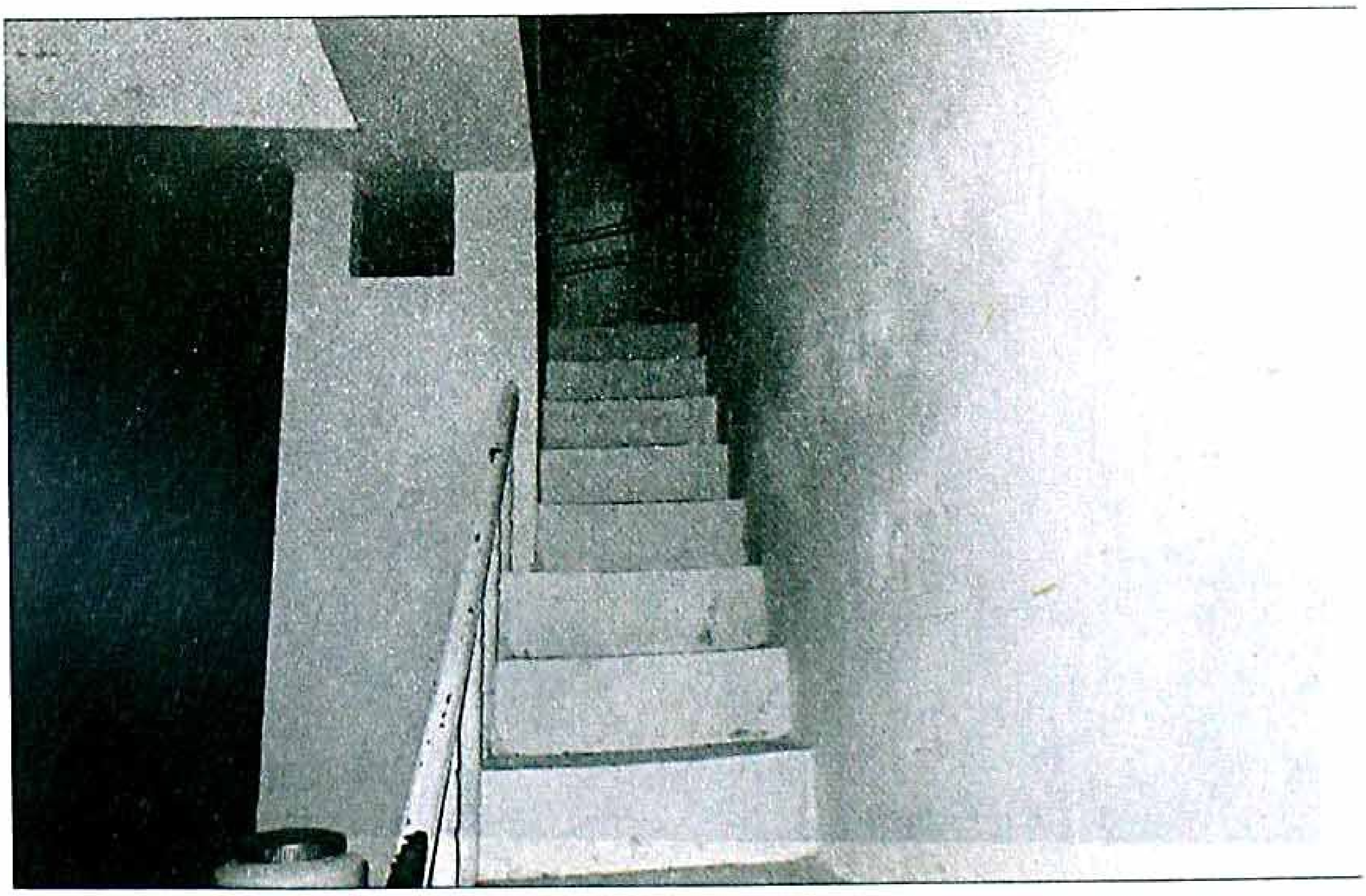

مریم جمیلہ کے کمرے کی طرف جاتی ہوئی سیڑھیاں

Marfat.com

پتوکی کی وہ گلی جہاں مریم جمیلہ رہتی تھیں

پتوکی کی نئی تصویر

Marfat.com

امریکہ سے ہجرت

مریم جمیلہ (مارگریٹ مارکوس)

ترجمہ: کرنل (ر) اشفاق حسین

ادبیات

Marfat.com